فہرست

سب سے بڑا ہے میرا خدا

خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضور رسول کریمؐ خاتم النبیین کی حیات طیبہ

رسول اکرمؐ بحیثیت معلم اخلاق

میری محبوب شخصیت سیدنا حضرت امام حسینؓ

سر سید احمد خان

علامہ اقبالؒ

اقبالؒ کا پیغام

قائداعظمؒ

قائداعظمؒ کا پیغام

قائداعظمؒ کا یوم ولادت

شہید ملت لیاقت علی خانؒ

پاکستان کا مطلب کیا؟

حب وطن

ہمارا وطن عزیز

مجھے اپنے وطن عزیز سے محبت کیوں ہے؟

یوم پاکستان اور اس کا مقصد

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا؟

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

قومی زندگی میں نظم وضبط کی اہمیت

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

پاکستان کا نظام تعلیم

علم بڑی دولت ہے

تعلیم نسواں

مخلوط تعلیم

معاشرے میں عورت کا مقام

عورت کے حقوق

مطالعہ کا طریقہ

میرا نصب العین

طلبہ اور سیاست

پاکستان کی تعمیر وترقی میں طلبہ کا حصہ

پاکستان میں لازمی فوجی تربیت

اطاعت والدین

شہادت

حسن اخلاق

قناعت

اتحاد و اتفاق

اتحاد و مساوات

ہمدردی

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

امید

اسلامی اخوت

سفر وسیلہ ظفر

پابندی وقت

محنت کی عظمت

اپنی مدد آپ

گفتگو کے آداب

بدکلامی اور اس کا انجام

لائبریریوں کی ضرورت اور اہمیت

زرمبادلہ کی اہمیت

معاشرتی خرابیاں اور ان کی اصلاح

قلم اور تلوار

کنایت شعاری

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-20

زراعت

تجارت

صنعت وحرفت

ملازمت

دیہاتی زندگی

شہری اور دیہاتی زندگی

دیہات سدھار

میرا پسندیدہ رہنما

میرا پسندیدہ شاعر

میری پسندیدہ کتاب

میرا شفیق استاد

میرا بہترین دوست

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2010

سب سے بڑا ہے میرا خدا

صفات انت سے باہر پہ ذات میں تنہا
ازل سے تا بہ ابد تیری شان ہے یکتا
(حفیظ صدیقی)

دنیا میں طاقت ور بھی ہیں اور زور آور بھی ہیں، حاکم بھی ہیں اور بادشاہ اور شہنشاہ بھی لیکن یہ کسی نہ کسی مقام پر مجبور و محکوم ہیں اور کسی بڑی طاقت کی احتیاج ان کی ضرورت ہے۔ یہ بڑی طاقت خداوند تعالیٰ کی ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے، جو ان سب کی ضرورتیں پوری کرتا ہے، جو ان سب کو رزق دیتا ہے اور ان سب پر قدرت کاملہ رکھتا ہے۔ خدا تعالیٰ اتنا بڑا ہے کہ ہم اسے احاطہ تحریر میں لا ہی نہیں سکتے۔ وہ لامحدود ہے اور اتنی عظمت والا ہے کہ اس کی عظمت کلی بیان کرنا ہمارے بس کی بات ہی نہیں۔ وہ حاکموں کا حاکم ہے، قادر مطلق ہے، زندہ کو مردہ کر سکتا ہے، مردہ کو زندہ کو مردہ کر سکتا ہے، بیمار کو صحت دے سکتا ہے اور صحت مند کو بیمار کر سکتا ہے۔ وہ رات کو دن اور دن کو رات بنا سکتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے۔ وہ دریاؤں کے رخ موڑ سکتا ہے۔ گویا کائنات کے ہر ذرے پر اس کی حاکمیت ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

خدائے ذوالجلال ایک ہے۔ اس کی ذات وحدہٗ لاشریک ہے۔ نہ اسے کسی نے جنا ہے، نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے، کسی نے اسے نہیں بنایا۔ اس کی وسیع ترین

سلطنت میں اس کے اختیارات میں کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔ اس کے کاموں میں کسی کی شراکت نہیں۔ کائنات میں جو کچھ بھی ہے اسی ایک خدا کا ہے اور اسی کے ماتحت ہے اور ہر عمل اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کے آگے تمام طاقتیں ہیچ ہیں۔ بادشاہ و گدا سب اسی کے آگے جھکتے اور اسی کے در سے مانگتے ہیں۔

اسلام کا پہلا رکن کلمہ طیبہ ہے۔ کلمہ پڑھ کر ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ اس میں ہم محض خدا کی واحدانیت کا اعتراف ہی نہیں کرتے بلکہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہی ساری کائنات کا حاکم اور مالک ہے۔ کائنات کو پیدا کرنے والا بھی وہی اور رزق دینے والا بھی وہی ہے۔ اس کی صفات معبودیت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ یہ ساری کائنات بلاشرکت غیرے اسی کی ہے۔ نہ تو اس کا کوئی ثانی ہے اور نہ ہی ایسا ہونا ممکن ہے۔ وہ نہ صرف ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا بلکہ ہمیشہ ایک ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ نہ اس کا کوئی شریک ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ جو شخص خدا تعالیٰ کو نہیں مانتا وہ ملحد کہلاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ بھی خدا کی طاقت سے انکار نہیں کرسکتا۔ آپ کسی معمولی طاقت ور آدمی کی مثال دے کر اس سے سوال کریں کہ کیا اس طاقت ور آدمی سے بھی کوئی اور طاقت ور ہوسکتا ہے تو اس کا جواب ہوگا ''ہاں''۔ اسی طرح سے پوچھتے جائیے کہ اس سے زیادہ طاقت والا کون ہے اور پھر اس سے زیادہ طاقت ور کون ہے۔ آخر کار اسے ایک سب سے طاقت ور ہستی کا قائل ہونا ہی پڑے گا۔ بس یہی خدا تعالیٰ ہے جس سے زیادہ طاقت ور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح

بڑائی اور عظمت کو لے لیں آج تک یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ کوئی سیارہ کائنات میں سب سے بڑا ہے اور اس کا نظام بغیر کسی اعلیٰ طاقت کے از خود چل رہا ہے یا کائنات میں کوئی ایسی شے موجود ہے جو سب سے بڑی بھی ہے اور وہ اپنے سے بڑی کسی طاقت کی محتاج نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ انسان نے سمجھا کہ سورج کائنات میں سب سے بڑا ہے اور انہوں نے اسے خدا بھی مانا لیکن یہ حقیقت نہیں تھی اور وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ خیال بالکل غلط اور حقیقت کے خلاف ہے اور سورج تو خود ایک بہت بڑے نظام کا ایک جزو ہے جسے کوئی بہت بڑی ہستی چلاتی ہے۔ تب اس نے سمجھ لیا کہ جب سورج خود کسی کا محتاج ہے اور نہ تو از خود پیدا ہوا اور نہ ہی اپنے بل پر قائم ہے تو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ خدا تو وہ ہے جو طاقت میں بھی سب سے بڑا ہو، عظمت میں بھی سب سے بڑا ہو اور ہر چیز پر قدرت بھی رکھتا ہو۔ وہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہو اور ہر ایک تو اس کا محتاج ہو مگر وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔

یہ سبزہ زار اور یہ ثمر دار پودے اور درخت یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ جن و بشر، یہ چرند، یہ پرند، یہ زمین و آسمان اور یہ سب نعمتیں آخر کس نے پیدا کی ہیں؟ یہ سب کچھ از خود تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جس طرح خود کار مشین کام کرتی ہے یہ بھی اسی طرح پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ختم ہوتے رہتے ہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ کمال اس مشین کا نہیں جو خود کار ہے بلکہ اس کا کمال ہے جس نے اس مشین میں خود کاری کی صفت پیدا کی ہے۔ اگر کوئی نظام ایک اصول اور قاعدے کے مطابق چل رہا ہے مثال کے طور پر سورج مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں

غروب ہو جاتا ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ سورج مغرب سے نکلنے لگے اور مشرق میں ڈوبنے لگے تو صاف ظاہر ہے کوئی ایسی ہستی بھی ہے جو اس نظام کو چلا رہی ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی بھی نظام اپنی مرضی سے نہیں چل سکتا۔ وہ ہستی خدا تعالیٰ ہے۔ سارا نظام اس کی مرضی سے چل رہا ہے۔ سب کچھ اسی کے حکم کے تحت ہو رہا ہے۔ یہ ہستی یعنی خدا تعالیٰ جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور اس کا مالک بھی ہے ہم سب اس کے بندے ہیں اور اسی کو عبادت کے لائق سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا ہے۔ ایک ہے اور سب سے بڑا ہے۔ وہ سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم اس کی نعمتیں بھی کھائیں اور ناشکری بھی کریں۔ کہ ہمارا خدا قادر مطلق ہے اور ہمیں اس کے آگے ایک دن جواب دہ بھی ہونا ہے۔ ہمیں اس سے ڈرنا چاہیے اور جن کاموں سے اس نے ہمیں منع کیا ہے انہیں ترک کر دینا چاہیے اور جو کچھ کرنے کا حکم دیا ہے وہ کرنا چاہیے۔ اسی میں ہماری فلاح ہے اور یہی عبدیت کا تقاضا ہے۔

خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی کل دنیا کے درباروں میں
(ظفر علی خاں)

اس کائنات میں حضور سرور کائنات، خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت بے مثال آفتاب درخشاں کی ہے جو غار حرا سے طلوع ہوا اور ساری کائنات پر چھا گیا۔ آپؐ کائنات کی عظیم ترین شخصیت ہے جس کی نظیر ازل سے ابد تک ممکن نہیں۔ آپؐ بے مثل نیر اعظم ہیں۔ جس طرح سورج نکلتا ہے تو موجودات عالم کی ہر چیز کو روشن کر دیتا ہے اسی طرح آسمان روحانیت کا نیر اعظمؐ انسانوں کے قلب ونظر کو منور کر رہا ہے۔ اس نیر درخشاں نے کفر وضلالت کی تاریکی کو نور سعادت میں تبدیل کر دیا اور دھندلکوں کو ختم کر دیا جو انسانی ذہن و قلب کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔

آپؐ وہ عظیم انسان ہیں جن سے زیادہ کسی کی تعریف نہیں کی گئی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی نے ان سے زیادہ اپنے خالق کی تعریف بھی نہیں کی، جس عظیم انسان کی تعریف خود خالق کائنات کرے اور جس کی تعریف خود رب کریم کرے اور اس پر درود وسلام بھیجے اس سے بڑھ کر کون سی شخصیت ہو سکتی ہے۔ کون ہے جو اس عظیم انسان کی تعریف کا حق ادا کر سکتا ہے۔ شاعر نے یہ کہہ کر مبالغہ نہیں کیا تھا کہ ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آپ ؐ کی ذات گرامی موجودات عالم کی محسن ہے، رحمتہ اللعالمین ؐ ہے اور خدائے تعالیٰ کی رحمت کا سرچشمہ ہے۔ جس پر خداوند کریم اپنی رحمت کے خزانے لٹاتا ہے جہاں سے رحمت مخلوقات میں تقسیم ہوتی ہے۔ ہم رسول پاک ؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ رسول ؐ ہماری دعا کے محتاج ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ رسول پاک ؐ پر زیادہ سے زیادہ خدا تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتا کہ آپ ؐ کے خزانہ رحمت سے زیادہ سے زیادہ رحمت مخلوقات میں تقسیم ہو۔

نبی خدا تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ اس لئے سوائے صفت معبودیت کے تمام صفات خداوندی کا عکس اس میں موجود ہوتا ہے۔ خدا رحیم ہے۔ اس کا نبی بھی رحیم ہوتا ہے۔ خود خدا قرآن کریم میں اس کی تصدیق فرماتا ہے۔ ہمارے آقا ؐ رحمت مجسم ہیں۔ آپ ؐ کی تمام تر تعلیم رحمت کی تعلیم ہے۔ آپ ؐ نے دنیا کو ظلمت سے نکال کر نور عطا کیا۔ آپ ؐ نے خدا اور اس کے بندوں کے درمیان رشتہ قائم کیا۔ ان تمام لوگوں کو جنہوں نے آپ ؐ پر یا آپ ؐ کے غلاموں پر ظلم کئے تھے اپنی رحمت سے معاف کر دیا۔ آپ ؐ دوستوں ہی کے لئے نہیں، دشمنوں کے لئے بھی سراپا رحمت تھے اور صرف اسی عالم کے لئے نہیں بلکہ تمام عالموں کے لئے رحمت بن کر تشریف لائے۔ اسی لائے تو آپ ؐ کو رحمتہ اللعالمین کا لقب عطا ہوا۔ جہاں جہاں تک اللہ تعالیٰ کی بادشاہت ہے وہاں وہاں تک آپ ؐ کی رسالت کا سکہ چلتا ہے۔ ہوا، پانی، بحر و بر، جن و بشر، کوہ و دشت، زمین و آسمان، حیوانات، نباتات،

جمادات غرضیکہ کائنات کے ذرے ذرے پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے۔ ان سب پر حضورؐ کی رسالت کی حاکمیت بھی ہے۔ جب سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت چلی آ رہی ہے تب سے آپؐ کی رسالت کا عمل جاری ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا کیونکہ خدا تعالیٰ کی حاکمیت بھی ہمیشہ کے لئے جاری ہے۔ گویا نہ اس کا ادھر کنارہ ہے اور نہ ادھر کنارہ ہے۔ شان رسالتؐ کی بھی کوئی حد نہیں۔ آپؐ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سارے جہانوں کے لئے رحمتہ اللعالمینؐ ہیں۔

جس طرح مادی آفتاب کی ضیاء پاشی سے ہر ذرہ درخشندہ ہوتا ہے اسی طرح ماہ ہدایت کی روشنی بھی کائنات کے ذرے کے لئے ہوتی ہے۔ آپؐ کی رحمت کے دامن کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں جن لوگوں نے آپؐ پر پتھر برسائے آپؐ نے انہیں بھی دعائیں دیں۔ آپؐ انسانوں کے لئے رحمت بن کر آئے اور عظیم انقلاب کا باعث بنے۔ حضورؐ کے لائے ہوئے انقلاب کے حوالے سے چند شعر ملاحظہ کریں۔

عجیب شخص تھا کیا انقلاب لے آیا
شب سیاہ میں اک آفتاب لے آیا
جہاں پہ قطرۂ شبنم کو بھی ترستے تھے
وہ اک چشمہ بجائے سراب لے آیا
دکھوں کی دھول کے باعث بشر کی آنکھوں سے
ہوئے تھے جتنے بھی گم سارے خواب لے آیا

بھٹک رہے تھے جو اب تک دکھوں کے صحرا میں
وہؐ ان کے واسطے سکھ کے گلاب لے آیا
جھلستی دھوپ میں تسکین قلب کی خاطر
کرم کی بارشیں وہ بے حساب لے آیا
(حفیظ صدیقی)

جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے رگ و پے میں سرایت نہ کر جائے ہمارا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔

محمدؐ کی محبت دین حق کی شرط اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو ایماں نامکمل ہے

اگر ہمارے دل میں حضورؐ کی محبت ہو اور ہم اس محبت کے تقاضے بھی پورے کرنے کی کوشش کرتے ہوں تو ہماری سیرت میں اسلامی رنگ پیدا ہوسکتا ہے اور ہم دین و دنیا کی ہر نعمت سے مالا مال ہوسکتے ہیں۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
(علامہ اقبال)

حضور رسول کریمؐ خاتم النبیین کی حیات طیبہ

اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔

انک تعلیٰ خلق عظیم.

اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؐ اخلاق میں سب سے اونچے درجے پر ہیں۔

حضرت علیؓ آپؐ کے متعلق فرماتے ہیں کہ آپؐ خندہ جبیں، جرم خو، مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور سخت دل نہ تھے۔ بات بات پر شور نہیں کرتے تھے۔ کوئی برا حکم منہ سے نہ نکالتے تھے۔ عیب جو اور تنگ نظر نہ تھے۔ کوئی ایسی بات جو آپؐ کو ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے تھے۔ آپؐ نے اپنے نفس سے تین چیزیں بالکل دور کر دی تھیں۔ بحث و مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور بغیر ضرورت کے کسی بات میں دخل دینا۔ کسی کو برا نہیں کہتے تھے۔ کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے تھے۔ کسی کے اندرونی حالات معلوم کرنے کی کوشش نہیں فرماتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ مقروضوں کے قرضے چکاتے ہیں۔ غریبوں کی مدد کرتے ہیں حق کی حمایت کرتے ہیں۔ مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں۔ مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ آپؐ کو کسی کو برا بھلا کہنے کی عادت نہ تھی۔ برائی کے بدلے میں برائی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا جواب بھلائی سے دیتے یا درگزر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے۔

رسول اکرمؐ کی حیات مقدسہ ہم سب کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔ آپؐ کی سیرت سراسر قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ گویا قرآن متن ہے اور آپؐ کی سیرت اس کی شرح دلآویز ہے۔ قرآن اگر ہمیں اصول حیات کا علم دیتا ہے تو آپؐ کی سیرت سے ہمیں اس عمل کا پتہ چلتا ہے جس کی قرآن کریم نے ہمیں تعلیم دی۔ آپؐ کی حیات دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ خود قرآن نے انبیائے کرام کی زندگیوں کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

ختمی مرتبتؐ پیغمبر اسلام کی زندگی اپنے اندر اخلاق کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے۔ آپؐ نے دشمنوں سے اپنے آپؐ کو صادق اور امین کہلوایا اور تبلیغ اسلام اس وقت شروع کی جب لوگوں نے انہیں صادق و امین تسلیم کرلیا تھا۔ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور کبھی امانت میں خیانت نہ فرمائی تھی۔ آپؐ وعدے کے پکے اور سچے تھے۔ آپؐ نے ہمیشہ وعدہ پورا کیا۔ رسول مقبولؐ کی سیرت ہمارے لئے ایک نمونہ ہے۔ پس ہمیں چاہیے کہ ہم اس عظیم و جلیل ہستی کو زندگی میں اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔

حضورؐ کی زندگی کے تمام پہلو اور ارشادات محفوظ ہیں۔ تمام انسان آپؐ کے معاشرتی اخلاق کی تقلید کر کے معاشرے کو درست کر سکتے ہیں۔ معاشرتی اصلاح کا یہ بہترین طریقہ ہے اور اسی سے دنیا جنت کا نمونہ بن سکتی ہے۔

رسول مقبولؐ کی معاشرتی زندگی پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر سادہ تھی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ آپؐ لباس میں کرتہ پسند فرماتے تھے آپؐ

کے کرتے کی آستین نہ زیادہ تنگ ہوتی تھی نہ زیادہ کھلی۔ آپؐ کرتے کے ساتھ تہہ بند باندھتے تھے۔ نیا لباس ہمیشہ جمعہ کے دن پہنا کرتے تھے۔ آپؐ سفید لباس ترجیحاً پسند فرماتے تھے۔ رنگدار لباسوں میں سے سبز رنگ کے لباس کو پسند فرماتے تھے۔ گہرا سرخ رنگ آپؐ کو ناپسند تھا۔ نیا لباس پہنتے وقت آپؐ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا کرتے تھے۔

سرکار دو عالمؐ کی زندگی حد درجہ سادہ تھی۔ امت کا غریب سے غریب آدمی بھی آپؐ کے پاس آنے سے ہچکچاتا نہ تھا۔ یہی سیرت تھی جس نے مسلمانوں کو بہت جلد اتنا پختہ کر دیا تھا کہ وہ خلیفہ ہو کر بھی پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور سوکھی روٹی کھاتے تھے۔ کیونکہ ان میں احساس ذمہ داری اس قدر زیادہ تھا کہ جس طرح کا لباس عام لوگ پہن سکتے تھے اور جس طرح کا کھانا عام لوگ کھا سکتے تھے خلیفہ بھی نہ تو اس سے بہتر لباس پہن سکتا تھا اور نہ ہی اس سے بہتر کھانا کھا سکتا تھا۔

حضور اکرمؐ پوری مستعدی کے ساتھ اپنے پروگراموں کو عملی جامہ پہنایا کرتے تھے۔ آپؐ جس کام کا اختیار کرتے تھے اسے پورے استقلال کے ساتھ سرانجام فرماتے تھے آپؐ پابندی وقت کی شدت سے تلقین فرماتے تھے۔ جس کی سب سے بڑی مثال خود آپؐ کی زندگی تھی۔ خود آپؐ نے ہمیشہ جس کام کے کرنے کا جو وقت مقرر کیا اس میں کمی بیشی کبھی نہ آنے دی۔

آپؐ راتوں کو اٹھ کر متواتر عبادت کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے رات کو کبھی عبادت ترک نہیں کی تھی۔ بیماری کی حالت میں بھی آپؐ

بیٹھ کر نوافل پڑھا کرتے تھے۔ آپ خلق عظیم کے مالک تھے اور حد درجہ کے مہمان نواز تھے۔ آپ خود تو بھوکے رہنا پسند فرما لیتے تھے، لیکن مہمان کی پوری طرح سے تواضع فرمایا کرتے تھے۔ آپ ہمیشہ بچوں، بوڑھوں، غریبوں اور مسکینوں سے شفقت، ادب، پیار اور محبت سے پیش آتے تھے اور کسی بھی شخص کی دل شکنی پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ دوسروں کی غلطیوں کو درگذر یا معاف فرما دیا کرتے تھے۔

حضور آنے والے یا ملنے والے کو سب سے پہلے خود سلام کیا کرتے تھے۔ لوگوں کو حسرت ہی رہتی کہ بوقت ملاقات حضور کو ہم پہلے سلام کہیں لیکن حضور سلام اور مصافحہ میں سب پر سبقت لے جاتے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم آپ کی سیرت طیبہ کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو ڈھال سکیں اور آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چل سکیں۔

خداوندا! چلوں اس راستے پر
حقیقت میں جو اس کا راستہ ہے

(حفیظ صدیقی)

رسول اکرمؐ بحیثیت معلم اخلاق

تاریخ عالم شاہد ہے کہ بے شمار اکابر اور مصلحین دنیا میں آئے اور انہوں نے انسانیت کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دینے کی سعی کی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مقدس مشن کی تکمیل کے لئے حضور سرور کائناتؐ افضل ترین معلم اخلاق کے طور پر دنیا میں تشریف لائے اور تعلیم اخلاق کے حوالے سے کائنات کے کامیاب ترین انسان ثابت ہوئے۔ اس عظیم ترین کامیابی کا بنیادی راز یہ تھا کہ وہ جس اخلاق عالیہ کی تعلیم دیتے تھے خود اس کے کامل ترین نمونہ تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں فرمایا: ''بے شک آپؐ خلق عظیم پر ہیں۔'' (ترجمہ)

بے شک تمہارے لئے رسولؐ اللہ کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے۔ (ترجمہ) اگر آپ درشت کلام ہوتے اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپؐ کے پاس ادھر ادھر منتشر ہو چکے ہوتے (ترجمہ)

اگر ذرا سا بھی غور کریں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپؐ اخلاق کا کس قدر بہترین نمونہ تھے۔ آپؐ صدق و صفا، علم و حکمت، عفو و درگزر، عدل و انصاف، سادگی و انکساری، ذہانت و امانت، عزم و ہمت، صبر و سخاوت، تقویٰ و پاک بازی، شجاعت و استقلال، غرض کہ ہر انسانی صفت عالیہ کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھے۔ اسی لئے بہترین معلم اخلاق ہونے کا حق بھی آپؐ کو پہنچتا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے یہ فریضہ بڑی ثابت قدمی کے ساتھ انجام دیا اور جہالت میں ڈوبی ہوئی اور ہر طرح کی اخلاقی حد بندیوں کو خاطر میں نہ لانے والی قوم کو دیکھتے ہی دیکھتے ایک زندہ

اور تو انا قوم بنا دیا اور اس مقصد کی تکمیل کی جس کے حوالے سے آپ ؐ نے فرمایا تھا کہ۔۔۔۔

''مجھے اس لئے بھیجا گیا کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں'' (ترجمہ)

آپ ؐ نے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے آگاہ کیا، آخرت اور جزا و سزا کے تصور سے آشنا کیا اور دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور سزا کا ڈر پیدا کیا اور جزا کی صورت میں نیکی کے لئے کوشش پیدا کی۔ آپ ؐ نے جس تفصیل سے اخلاقی اصول سمجھائے اس کی مثال ازل سے ابد تک نہیں ملتی۔ آپ ؐ نے بڑی باتوں سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی تفصیل سے سمجھائیں۔ اور روزمرہ زندگی کے آداب بھی پوری وضاحت سے سمجھائے۔ آپ ؐ نے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، اوڑھنے پہننے اور بات کرنے تک کے آداب سے بھی آگاہی عطا کی اور لین دین کے معاملات تک بھی پوری وضاحت سے سمجھائے۔

آپ ؐ چونکہ اعلیٰ ترین اخلاقی نمونہ تھے، اس لئے آپ ؐ کی تعلیمات کا اثر بھی ہوا جس کے نتیجے میں آپ ؐ کے بدترین دشمن بھی آپ ؐ کے گرویدہ ہو گئے۔ آپ ؐ نے عملی نمونہ فراہم کر کے دنیا میں ایسا اخلاقی انقلاب برپا کیا جس کی مثال روئے زمین پر نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی آپ ؐ کے ماننے والوں کے علاوہ آپ ؐ کے نہ ماننے والے دوسرے مذاہب کے اہل علم بھی آپ ؐ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اور آپ ؐ کی شان میں نعت تک کہتے ہیں۔ چنانچہ بے شمار غیر مسلموں نے نعت لکھی ہے جس کا سلسلہ جاری ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں آپ ؐ کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے اور قدم قدم پر آپ ؐ کے اخلاق عالیہ کو بطور نمونہ اپنائے رکھنے کی توفیق عطا فرمائے جسے اپنانے کے بعد ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر دنیا کے لئے نمونے کے فرد اور نمونے کی قوم بن سکتے ہیں۔ اور دنیا پر غالب آ سکتے ہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

میری محبوب شخصیت سیدنا حضرت امام حسینؓ

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

میری محبوب شخصیت وہ پیکر وفا اور فخر انسانیت ہے جس پر بشریت ناز کرتی ہے، جس نے حق کا بول بالا کیا، جو باطل کے آگے سینہ سپر ہوگیا۔ جس نے اپنے نانا کے دین حق کی سرفرازی کے لئے سر نیزے پر چڑھوا کر پوری انسانیت کے لئے سبق چھوڑا کہ اگر حق کی خاطر اپنے کنبے سمیت سر بھی دینا پڑے تو دریغ نہ کیا جائے۔ ان کا نام نامی ہے حسینؓ جن کی داستان شہادت انسانی سربلندی کی داستان ہے۔ کئی ہے جب انسانیت حق کی پاسبانی میں باطل کے نرغے میں گھر جائے تو نام حسینؓ اسے سہارا دیتا ہے۔ جب دولت وقوت کی فرعونیت حق پرستوں پر عرصہ زندگی تنگ کر دیتی ہے، جب شیطانیت حق سے ہٹا کر باطل کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور ناکامیوں سے بوکھلا کر انسان حق پر باطل ہونے کا شبہ کرنے لگتا ہے تو اس وقت حسینؓ کی یاد اسے ثبات بخشتی ہے۔ جب سیم وزر کی جھلکیاں ایمان کو کمزور کرنے لگتی ہیں تو مثال حسینؓ اسے ثابت قدم رکھتی ہے۔ جب ایک طرف دنیوی کامیابی وکامرانی ہو، دولت واقتدار ہو اور دوسری طرف حق ہو تو فاقہ مستی میں بھی تقلید حسینؓ کا راستہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

حسینؓ کی ظاہری ناکامی کے آگے یزید کی ساری فتح مندیاں اور باطل کی کامیابیاں ہیچ نظر آتی ہیں۔ حسینؓ نے سر دے کر انسانی شرافت کی لاج رکھ لی۔

حسینؑ کا نام آج بھی زندہ ہے اور رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ یزید کا نام آج بھی نفرت سے لیا جاتا ہے اور رہتی دنیا تک نفرت کی علامت بنا رہے گا۔ اس کا نام فسق و فجور کے نام سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گیا ہے۔

حسینؑ حق کے علمبردار تھے۔ وہ اسی کے لئے پیدا ہوئے تھے، اور اسی کے لئے انہوں نے جام شہادت نوش فرمایا وہ اپنی عظیم قربانی سے ایسی شمع روشن کر گئے جس سے انسانیت ہمیشہ راہنمائی حاصل کرتی رہے گی۔ حسینؑ نے محض امت مسلمہ کو ہی حق کی حمایت میں کٹ مرنے کا سبق نہیں سکھایا بلکہ یہ سبق پوری دنیا کے لئے ہے انہوں نے حق کو بچا کر اور باطل کو رسوا کر کے پوری دنیا پر احسان عظیم کیا ہے۔

یزید ملعون چاہتا تھا کہ حسینؑ اس کی بیعت کر لیں۔ مگر وہ حق کو باطل کے سامنے کیسے جھکا سکتے تھے کیونکہ یہ صرف یزید کی بیعت نہ تھی بلکہ اسلام کا جاہلیت کے سامنے جھک جانا تھا، حریت و مساوات کی شاندار روایت کا خون کرنا تھا اور ظلم و ستم کو پروان چڑھانا تھا۔ امام حسینؑ کے پاس کوئی مادی وسائل نہیں تھے مگر ان کے پاس ایمان کی بے حساب دولت تھی۔ ان کے پاس کوئی دنیاوی طاقت نہ تھی۔ ان کے پاس ایمان کی طاقت تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایمان کی طاقت سے ہی حکمران کا مقابلہ کیا۔ ان کے دل میں صرف خدا تعالیٰ کا خوف تھا جس نے انہیں اتنا بے خوف کر دیا تھا کہ موت ان کی محبوب بن گئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا خون گلستان اسلام میں شگفتگی کی بہار پیدا کر دے گا۔ چنانچہ نویں محرم کو آپ اپنے ساتھیوں سے یوں مخاطب ہوئے۔

''کل کا دن ہماری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ رات کی سیاہی پھیل چکی ہے، جس کا جدھر دل چاہے چلا جائے۔'' لیکن ان کے جانثاروں نے کہا ''آپ کے لئے ہماری جانیں ایک ناچیز ہدیہ ہیں۔ ہم آپ کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟''

دسویں محرم کو یزیدی لشکر اپنی پوری طاغوتی طاقتوں کو لے کر کربلا کے میدان میں آ گیا اور انہیں اور ان کے ساتھیوں کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ حضرت حسینؑ کے عزیز و اقارب یہاں تک کہ چھ ماہ کا بچہ علی اصغرؑ بھی ان کے سامنے ہی شہید ہو گیا۔ لیکن انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اکیلے رہ جانے پر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری بلکہ اپنے ظالم دشمنوں اور ان سے اس طرح خطاب فرمایا۔

''اے قوم! میں تمہارے نبیؐ کا نواسہ ہوں۔ تم کیوں میرے قتل کے درپے ہو۔ کیا میں نے کوئی نیا دین ایجاد کیا ہے؟ کیا میں نے کسی شریعت کو تبدیل کیا؟ کیا میں وہی حسینؑ نہیں جس کو تمہارے رسولؐ کو اپنا فرزند کہا۔ جس کے لب و دہن کے بوسے رسول اکرمؐ نے لئے اے اہل کوفہ! جس نبیؐ کا تم کلمہ پڑھتے ہو، اسی کے نواسے کے قتل پر کمر بستہ ہو۔ یاد رکھو وہ وقت قریب ہے جب عذاب الٰہی کے شعلے تمہیں گھیر لیں گے۔''

ابھی ان کا خطبہ ختم نہ ہوا تھا کہ ان پر یلغار شروع ہو گئی۔ آپ نے کمال جوانمردی اور بے مثال بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ بالآخر انہیں شہید کر دیا گیا۔ انہوں نے جان دے کر کربلا کے ریگ زار کو رنگین بنا دیا۔

حسینؑ آج بھی زندہ ہیں۔ان کی یاد میں آنکھیں روتی ہیں، دل روتا ہے اور روح لرز جاتی ہے۔ان کی یاد آج بھی اربوں انسانوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ قلب ونظر آج بھی مضطرب ہیں لیکن یزید ملعون کا کوئی نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس کے لئے لعنت ہے اور قیامت تک لعنت رہے گی، جبکہ امام عالی مقام کے لئے درود وسلام کا ورد رات دن چلتا رہتا ہے۔حسینؑ کا نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو چکا ہے اور مورخ انہیں ایک بہادر، حق پرست اور عظیم قربانی پیش کرنے والے کے طور پر یاد کرتا ہے جبکہ یزید کا نام ونشان مٹ چکا ہے۔تاریخ اسے یاد بھی کرتی ہے تو بدترین قابل نفرت کردار کے حوالے سے۔جب تک دنیا باقی ہے حسینؑ کا نام زندہ رہے گا اور انسانیت ان کے احسان کے بوجھ تلے دبی رہے گی بے شک انہوں نے جان کا نذرانہ دے کر دین حق کا علم سربلند کیا۔ عارف اجمیریؒ نے اس کی اس طرح وضاحت کی ہے۔

شاہ ہست حسینؑ پادشاہ ہست حسینؑ
دیں ہست حسینؑ، دیں پناہ ہست حسینؑ
سر داد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؑ

سرسید احمد خان

سرسید احمد خان کا شمار ان درد دل رکھنے والی قابل احترام ہستیوں میں ہوتا ہے جو قوم کے معمار کہلاتی ہیں۔ سرسید احمد خان بڑے دور اندیش انسان تھے اور مسلمانوں کی ترقی کے دل و جان سے خواہاں تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اگر مسلمان جاہل اور بے علم رہ گئے تو ہمیشہ کے لئے ذلت کے گڑھے میں جا گریں گے جہاں سے ان کا نکلنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کو تو احساس نہیں مگر ہندو ہر میدان میں آگے نکلتے جا رہے ہیں اور ہر جگہ قبضہ جمائے بیٹھے ہیں اور ان کی کوشش یہی ہے کہ مسلمان ناخواندہ ہی رہیں تاکہ کسی محکمہ میں کوئی جگہ حاصل نہ کر سکیں۔ عدلیہ اور انتظامیہ میں بھی ہر جگہ ہندوؤں کی چلتی تھی۔ چونکہ انگریز نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لئے اسے مسلمانوں سے ہر وقت کھٹکا لگا رہتا تھا۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ مسلمان جاہل ہی رہیں۔ انہیں ہوش ہی نہ آئے کہ ہم سے کسی چیز کا مطالبہ کر سکیں۔ مسلمانوں کی حالت خراب سے خراب تر رکھنے میں ہی انگریز اپنا مفاد سمجھتا تھا۔ مگر سرسید احمد خان یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہندوؤں کی یہ چال کامیاب ہو گئی تو مسلمان اقتصادی اور علمی میدان میں پیچھے رہ جائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم کو بہت ضروری سمجھا۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ غداروں کی غداری کے باعث مسلمان سن ستاون کی جنگ آزادی ہار چکا ہے۔ اب اسے تلوار کی نہیں قلم کی جنگ لڑنے کی تیاری کرنا چاہیے جس کے لئے علم کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اس وقت صورت

حال یہ ہے کہ ہم مقابلہ کر کے انگریز کو نکال نہیں سکتے۔ اس لئے ساری توجہ علم حاصل کرنے کی طرف لگالیں۔

سر سید احمد خان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان ہرات کا رہنے والا تھا مگر بسلسلہ معاش دہلی چلا آیا تھا۔ آپ کے والد بزرگوار کا حلقہ شاگردی بہت وسیع تھا اور بڑے بڑے امیر زادے آپ کے شاگرد تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ نیک دل، خدا ترس اور سخی خاتون تھیں حاجت مندوں، غرباء اور مساکین کی حاجت روائی کھلے دل سے فرمایا کرتی تھیں۔

آپ کے دادا سید ہادی فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی والدہ کو بھی اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کا بہت شوق تھا۔ لہٰذا سر سید احمد خان نے اٹھارہ برس کی عمر میں ہی عربی کے علاوہ علم طب اور ریاضی پر عبور حاصل کر لیا۔ آپ کے ایک بڑے بھائی بھی تھے جن سے آپ کو بہت محبت تھی۔ ان کی وفات پر آپ کو بہت دکھ پہنچا۔ ابھی آپ نے اکیسویں سال میں قدم رکھا ہی تھا کہ والد بزرگوار بھی داغ مفارقت دے گئے اور سارے خاندان کا بوجھ آپ کے کندھوں پر آن پڑا۔ ۱۸۳۹ء میں انہیں کمشنر آگرہ کے دفتر میں ملازمت مل گئی۔ تیسرے سال ان کا تبادلہ فتح پور سیکری ہو گیا اور بہادر شاہ والی دہلی نے آپ کو ''جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ'' کے خطاب سے نوازا۔ ۱۸۵۷ء میں آپ بجنور میں جج مقرر ہوئے۔ آپ نے چونکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں اس لئے صلے میں انگریزوں نے سر سید احمد خان کی دو صد روپیہ

ماہوار پنشن مقرر کر دی، اور ایک شمشیر اور خلعت سے بھی نوازا۔ ۱۸۷۰ء میں آپ پھر بنارس کے جج مقرر ہوئے۔

آپ کے قلم میں بہت زور تھا۔ آپ عربی فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ دوسری طرف بہت سی کتابوں کے علاوہ آپ تین مذہبی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ آپ نے ایک اخبار سید الاخبار بھی جاری کیا تھا اور اس اخبار کی ترقی کے لئے کوشاں بھی رہے تھے آثار قدیمہ کے حوالے سے بھی آپ نے بہت خدمت انجام دی اور دہلی کی پرانی عمارات کے حالات ''آثار الصنادید'' کی صورت میں لکھے۔ علاوہ ازیں آپ نے بہت سی کتابیں لکھ کر ہندوستان کے عوام میں مقبولیت حاصل کی۔

متحدہ ہندوستان کے مسلمان سرسید احمد خاں کے رہتی دنیا تک ممنون احسان رہیں گے کیونکہ انہوں نے رات دن محنت کر کے مسلمانوں کے لئے علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھا جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی بن گئی جہاں پر ہندوستان کے ہر حصے سے مسلمانوں کے بچے دولت علم سے فیض یاب ہو کر ملک وقوم کی خدمت میں نمایاں حصہ لیتے رہے ہیں۔ اس کار خیر میں کچھ لوگ جو دور اندیش نہیں تھے آپ کو برا بھلا کہا کرتے تھے۔ مگر آپ نے کسی کی پروا کئے بغیر اپنا مشن جاری رکھا اور ادارے کی تعمیر کے لئے آپ کو قوم کے آگے ہاتھ بھی پھیلانے پڑے تو اس میں بھی عار نہ سمجھی۔ وہ کہتے تھے میری قوم کے مستقبل کا سوال ہے مجھے جو کچھ بھی کرنا پڑا کروں گا مگر قوم کو زیور علم سے آراستہ کر کے چھوڑوں گا۔ انہوں نے صحیح

معنوں میں ایسا کر کے بھی دکھا دیا جس کے نتیجے میں جو لوگ آپ کے شدید دشمن تھے آہستہ آہستہ نہ صرف آپ سے اتفاق کرنے لگے بلکہ آپ کے مداح بن گئے۔

علی گڑھ کے فارغ التحصیل ہندو پاک میں علمی اعتبار سے ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سر سید احمد خان تعلیم کے میدان میں اس قدر نمایاں خدمت انجام نہ دیتے تو مسلمان قوم تعلیم میں بہت پیچھے رہ جاتی اور اگر مسلمان قوم ناخواندہ رہ جاتی تو ان میں محمد علی جناحؒ پیدا نہ ہوتے نہ اقبالؒ نہ لیاقت علی خانؒ نہ دوسرے زعما جو علم کی شمع ہاتھ میں لے کر قوم کی راہنمائی کر گئے۔ قوم کا درد رکھنے والا یہ عظیم انسان ۱۹۰۱ء میں ہم سے جدا ہو گیا۔

علامہ اقبالؒ

حکیم الامت دانائے راز، مرد خود بین وخود آ گاہ مفکر ملت علامہ اقبالؒ نے اپنی قومی شاعری اور ایمان افروز پیغامات سے مسلمانان عالم کو بالعموم اور مسلمانان ہند کو بالخصوص خواب غفلت سے جگا کر تصور پاکستان پیش کیا۔ تخلیق ارض پاک انہی کی فکری کاوشوں سے سرانجام پائی۔

آپ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ آپ کے والد بزرگوار شیخ نور محمد نہایت پرہیز گار اور متقی انسان تھے۔ ابتدائی تعلیم ایک دینی مدرسہ میں پائی اور میٹرک پاس کرنے کے بعد مرے کالج سیالکوٹ میں داخلہ حاصل کیا یہیں سے انہوں نے ایف اے پاس کیا۔ اس کے بعد بی اے اور ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور سے امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور پنجاب بھر میں اول آئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد جب آپ سیالکوٹ کے مشن میں پہنچے تو وہاں پر آپ کو مولوی میر حسن جیسے فاضل اور شفیق استاد مل گئے جنہوں نے ان کے جوہر قابل کو پہچان لیا۔ انہوں نے ان کی ذہنی تربیت فرمائی اور ان میں اسلامی ذوق پیدا کیا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں آپ کو پروفیسر آرنلڈ جیسی شخصیت کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا جنہوں نے اقبال میں تجسس اور تحقیق کی صفات کو اجاگر کر دیا۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر آپ پہلے اورینٹل کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں آپ قانون

کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے بار ایٹ لاء کی سند حاص کی۔ فلسفہ ایران پر ایک کتاب لکھ کر آپ نے جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں آپ وطن واپس آ گئے۔

علامہ اقبال کو اپنے فاضل اور شفیق استاد سر آرنلڈ سے بہت محبت تھی۔ قیام انگلستان کے دوران آپ نے ارادہ کرلیا تھا کہ شعر نہیں کہیں گے مگر آرنلڈ کے کہنے پر آپ نے اس ارادہ کو ترک کر دیا اور پھر سے شعر کہنے لگے۔ جب آپ کو آرنلڈ کے انتقال کی خبر ملی تو بے اختیار آپ کی زبان سے نکلا۔ آہ آج اقبال اپنے عظیم دوست اور مشفق استاد سے محروم ہو گیا۔

علامہ صاحب انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر بھی منتخب ہوئے اور انجمن کے اداروں کو نہایت خوبی سے چلاتے رہے۔ بعد میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر چنے گئے۔ پھر آپ کو پنجاب مسلم لیگ کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ شاعری کی وجہ سے آپ کی شہرت ہندوستان کی سرحدوں کو عبور کر کے تمام دینا میں پھیل گئی۔ قوم نے آپ کو ترجمان حقیقت، شاعر مشرق اور حکیم الامت کے خطابات سے نوازا۔ حکومت برطانیہ نے آپ کو ''سر'' کا خطاب دیا۔ ریاست بھوپال کی طرف سے آپ کے لئے پانچ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔

علامہ اقبالؒ کی ساری کی ساری شاعری میں قوم کے لئے تڑپ موجود ہے۔ ہر شعر ملت کے لئے اصلاح کا پیغام دیتا ہے۔ کبھی وہ اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر مسلمانوں کا لہو گرماتے ہیں۔ کبھی افلاک پر کمند ڈالنے کو کہہ کر نوجوانان اسلام کو

دعوت عمل دیتے ہیں۔ عقاب و شاہین کی تمثیل سے نوجوانوں کو بلند خیالی اور بلند پروازی کا درس دیتے ہیں۔ اویس قرنیؓ کا قصہ چھیڑ کر حب رسولؐ کی ترغیب دیتے ہیں۔ آپ سچے عاشقان رسولؐ میں سے تھے۔ حضورؐ کے عشق میں ان کی آنکھیں ہمیشہ پرنم رہتی تھیں۔ علامہ صاحب نے خودی پر بہت زور دیا ہے۔ خودی سے ان کی مراد تکبر یا خودنمائی نہیں ہے بلکہ وہ قوم کو خودشناسی سکھانا چاہتے تھے اور اسے احساس دلانا مقصود تھا کہ تمہارے اندر قدرت نے جو جوہر پنہاں رکھے ہیں، ان کو کام میں لا کر اپنے آپ کو اس قابل بناؤ کہ خدا تعالیٰ کے منتخب بندوں میں شامل ہو جاؤ اور عملی اور ذہنی طور پر اللہ کے اس قدر مقرب بن جاؤ کہ اس کی رحمتیں تم پر برسنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ کا تمام کلام اسلامی نظریات کے عین مطابق ہے۔ آپ کا سارا کلام احکام الٰہی اور اسوۂ حسنہ کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر ان کے صرف ایک ہی شعر پر انسان عمل پیرا ہو جائے تو کامیاب مسلمان بن جاتا ہے اور دین و دنیا کی دولت اس کے قدموں تلے آ جاتی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اگر اس شعر کے متعلق یہ کہا جائے کہ آپ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے

تو بالکل بجا ہوگا۔ کیونکہ اس میں علامہ نے کتاب وسنت کے بہت سے تقاضے پورے کر دیئے ہیں۔

آپ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں رحلت فرمائی اور شاہی مسجد کے سامنے حضوری باغ میں دفن ہوئے۔ عام دنوں میں بھی لوگ ان کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتے ہیں مگر خاص مواقع مثلاً یوم اقبال پر بہت زیادہ لوگ حاضری کے لئے جاتے ہیں۔ یوم اقبال کے موقع پر ملک کے سربراہان کی طرف سے بھی ان کے مزار پر پھول چڑھائے جاتے ہیں اور بے شمار علمی اور ادبی اداروں اور انجمنوں کی طرف سے بھی چادریں چڑھائی جاتی ہیں اور فاتحہ خوانی کی جاتی ہے۔

اقبالؒ کا پیغام

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

علامہ اقبال صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ وہ ایک فلسفی بھی تھے اور قوم کے ہمدرد رہنما بھی تھے۔ وہ قوم کی اصلاح کر کے اسے عظیم قوم بنانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنی شاعری کو ذریعے کے طور پر استعمال کیا۔ چنانچہ ان کی شاعری محض شاعری نہیں، اس میں قوم کے لئے پیغام ہے۔

اقبال نے اپنے پیغام میں خودی پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ نظریہ اقبال یہ ہے کہ خدا پر پورا پورا بھروسہ رکھو۔ اپنے اعتقادات و نظریات پر مضبوطی سے کاربند رہو۔ عمل پیہم کو اپنا شعار بناؤ۔ بے ہمتی اور محض تقدیر پر تکیہ کرنے کی بجائے حالات کا ہمت سے مقابلہ کرو اور کوشش کرو کہ حالات کے ساتھ ساتھ خود ڈھل جانے کی بجائے حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا جائے اور اس کے لئے مشکل کو سہنے کا حوصلہ پیدا کیا جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جس قدر مشکل درپیش ہو انسان کو اسی قدر باہمت ہونا چاہیے کیونکہ مشکلات ہی انسان میں مقابلہ کی قوت پیدا کرتی ہیں۔ اعمال اچھے ہونے چاہئیں اور ان میں تسلسل ہونا چاہیے۔ انسان کی کوشش میں شوق اور لگن اس قدر بڑھتا جانا چاہیے کہ وہ عشق کی شکل اختیار کر لے۔ اقبال کہتے ہیں۔

تو راہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول

لیلےٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

گویا جدوجہد کے دوران ٹھہراؤ نہ آنے پائے۔ یہ شوق، یہ لگن، یہ عشق انسان کی زندگی کو ہدایت بخش دیتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو پہچانو، اپنے فرائض کو پہچانو اور تن دہی سے ان کو سرانجام دو تو تسخیر کائنات بھی تمہارے لئے کوئی مسئلہ نہ ہوگا اور یہ ہے اقبال کا مقام خودی اور یہی ہے مقام خود آگاہی۔

اقبال انگریز کے دور میں پیدا ہوئے۔ اسی کا مقرر کردہ نصاب پڑھا۔ انہوں نے مغرب میں خاصا قیام کیا اور وہاں پر تہذیب مغرب کا بھی مطالعہ کیا اور انہوں نے اس کے افکار و نظریات کو خوب جانچا پرکھا۔ مگر وہ اس سے متاثر ہونے کی بجائے اس سے متنفر ہو گئے اور مغربی تہذیب کے بارے میں صاف صاف کہہ دیا۔

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

مغربی تہذیت سے اپنی نفرت کے اس برملا اظہار کے بعد انہوں نے اس کے بارے میں کھلی پیش گوئی بھی کی کہ۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

اقبال نے دور انحطاط میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان باہمی انتشار و افتراق کا شکار ہیں اور قوم بے ہمت اور مایوس ہو چکی ہے۔ انہوں نے محسوس کر لیا

کہ اگر ان پر مغربیت کا ملمع چڑھ گیا تو یہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو کر رہ جائیں گے کیونکہ پہلے ہی مسلمان سیاسی اور اقتصادی طور پر بہت پیچھے تھے۔ لہٰذا اقبال نے نظریات مغرب سے ہٹا کر قوم کو خودی کا پیغام دیا اور عمل پیہم اور جہد مسلسل کی دعوت دی اور مسلمانان ہند کو یہ کہہ کر خبردار کیا کہ۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اقبال جانتے تھے کہ انگریز کے نظریات کیا ہیں اور ہندو کے ارادے کیا ہیں۔

اقبال نے خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ پر زور دیا ہے۔ انہوں نے غیر کے آگے دست احتیاج پھیلانے کو لعنت سمجھا اور اپنی کوشش سے اپنی ہی سرزمین سے پیدا کردہ اشیاء پر انحصار کرنے کو آبرومندانہ اقدام قرار دیا۔

وہ اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

اقبال کی شاعری اتنی وسیع ہے کہ اپنے ملک کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی قدر کی نظروں سے دیکھی جا رہی ہے کیونکہ اس میں زندگی کے ہمہ جہتی مسائل، فلسفۂ حیات اور ترقی و ارتقاء کے مسائل کی عقدہ کشائی کی گئی ہے۔ اقبال کی شاعری نظریات و افکار میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ زندگی کو شگفتگی اور تازگی بخشتی ہے۔ ترقی فکر و تمدنی ارتقاء کا درس دیتی ہے۔ دعوت عمل اور جہد مسلسل کی طرف

رہنمائی کرتی ہے۔ آپ نے کرگس و شاہین کا مقابلہ کر کے سمجھایا ہے کہ عزت کی زندگی اور ذلت کی زندگی میں کیا فرق ہے۔ اقبال کے ایک ایک شعر سے تقویٰ، یقین محکم، عمل پیہم اور محبت کا پیغام ملتا ہے۔

اقبال کی شاعری میں عشق رسولؐ کا جذبہ بھی موجزن نظر آتا ہے۔ اسی پیکر ہدایت کا دیا ہوا درس اقبال نے اپنی شاعری میں دہرایا ہے۔ اسی کے اسوۂ حسنہ کا سہارا لیا ہے۔ اسی در نایاب کی دمک سے اپنے اشعار کو چمکایا ہے۔ اسی کی پرسوز لے میں ملت اسلامیہ کو اپنے نغمات سنائے ہیں اور اسی کی تقلید میں اقبال نے مخلوق خدا سے بھی محبت کا اظہار کیا ہے۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

قائداعظمؒ

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانان ہند نہایت ذلت آمیز اور غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب ان کے سامنے کوئی لائحہ عمل نہ تھا۔ ان میں علم اور ہمت کی بھی کمی تھی وہ سیاسی اور اقتصادی طور پر بری طرح دبے ہوئے تھے۔ ان کا جذبہ آزادی مردہ ہو چکا تھا۔ ان کی ایمانی قوت عمل ضعیف ہو چکی تھی۔ قوم انتشار و افتراق کا شکار تھی۔ امراء انگریز کے زیر اثر تھے اور مغربی تہذیب کے دلدادہ بن کر رہ گئے تھے۔ دنیوی لالچ نے ان کی زبانیں بند کی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کی کوئی قیادت نہ تھی۔ ہندو ہر میدان میں آگے نکل گئے تھے اور ہر شعبہ میں انہی کا سکہ چلتا تھا۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کے سبب ان کے لئے ترقی کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ ایسے میں ایک مرد مجاہد جو دیکھنے میں نہایت دبلا پتلا اور کمزور تھا مگر ارادہ مصمم، قوائے عمل فولادی اور نگاہ بلند رکھتا تھا میدان میں نکلا۔ اس نے انگریز اور ہندو دونوں کو للکار کر کہا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ ان کی مذہبی اور معاشرتی اقدار ہندوؤں سے بالکل الگ ہیں۔ ان کی تہذیب و تمدن جدا ہے۔ مسلمان اپنے مخصوص فلسفہ حیات کی ترقی اور نشوونما کے لئے ایک الگ ملک چاہتے ہیں جہاں پر وہ یہ ثابت کر سکیں کہ مسلمان واقعی ایک الگ قوم ہیں جس کے نظریات بھی الگ ہیں۔ وہ مرد مجاہد ہمارے عظیم قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے جن کی سیاسی بصیرت اور بے مثال جرات و استقلال کی بدولت پاکستان معرض وجود میں آیا۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا

تعلق خوجہ خاندان سے تھا۔ آپ کے والد گرامی کا نام پونجا جناح تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد گجرات کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے۔ چونکہ آپ کے والد محترم بھی لمبے اور دبلے پتلے تھے اور گجراتی زبان میں لمبے اور دبلے پتلے آدمی کو ''جینا'' کہتے ہیں لہٰذا انہیں بھی لوگ پونجا جینا کے نام سے پکارتے تھے۔ بعد میں یہی لفظ جینا جناح بن گیا۔ پونجا جناح کراچی میں چمڑے کے سوداگر تھے۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے ابتدائی تعلیم گوکل داس پرائمری سکول بمبئی میں پائی اور میٹرک کا امتحان سندھ مدرستہ العلوم ہائی سکول کراچی سے پاس کیا۔ ۱۸۹۳ء میں آپ سولہ سال کی عمر میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ چلے گئے اور ۱۸۹۶ء میں بیرسٹری پاس کر کے وطن واپس آ گئے۔

۱۸۹۶ء میں آپ نے کراچی میں وکالت شروع کر دی۔ اگلے سال آپ بمبئی چلے گئے اور وہاں کے بہت کامیاب وکیلوں میں شمار ہونے لگے۔ ۱۹۰۰ء میں آپ پریذیڈنسی مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ آپ نے بڑی دیانت داری اور محنت سے کام کیا۔ بمبئی ہائی کورٹ کے جوڈیشل سیکرٹری نے آپ کی کارکردگی اور قابلیت سے متاثر ہو کر آپ کو مستقل ملازمت کی پیش کش کی جس کی ماہانہ تنخواہ اس وقت پندرہ سو روپے تھے۔ لیکن آپ نے اسے ایک تاریخی جواب دیا۔

''پندرہ سو روپے تو میں ایک روز میں کمانا چاہتا ہوں اور آپ مجھے ایک ماہ کی تنخواہ پندرہ سو روپے دیں گے۔'' چنانچہ آپ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ محنت اور لگن سے کام کیا جائے تو اس کا پھل ضرور ملتا ہے۔

قائداعظمؒ کا رجحان بچپن سے ہی سیاست کی طرف تھا۔ انگلینڈ میں ہی آپ نے سیاسیات کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ دادا بھائی نوروجی، مسٹر گوکھلے اور فیروز شاہ مہتہ جیسے منجھے ہوئے سیاست دانوں کی صحبت سے ان میں اور بھی پختگی پیدا ہوگئی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں کانگرس کے اس وقت کے صدر دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کانگرس میں شرکت کی۔ اس سے قبل ۱۹۰۰ء میں جب آپ نے کانگرس کے اجلاس میں وقف علی الاولاد کے متعلق ایک کامیاب تقریر کی تو بڑے بڑے سیاست دان بول اٹھے کہ یہ دبلا پتلا نوجوان ایک دن بہت بڑا سیاست دان ہوگا۔

۱۹۰۹ء میں آپ کو بمبئی کے مسلمانوں نے وائسرائے کی قانون ساز کونسل کا ممبر منتخب کیا۔ ۱۹۴۷ء تک آپ کونسل کے ممبر رہے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ جب کانگرس نے چمسفورڈ سکیم کو نامنظور کیا اور عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو قائداعظم چند اصولی اختلافات کی بنا پر کانگرس سے مستعفی ہو گئے۔ قائداعظم کے کانگرس سے علیحدہ ہو جانے کا بنیادی سبب یہ تھا کہ انہوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہندوؤں کی حکمت عملی سے مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے اور وہ ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوؤں سے بد دل ہو کر جب کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی تو آپ نے تمام اہل ہند کی بجائے صرف مسلمانوں کی خدمات انجام دینے اور ان کی آزادی کے لئے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہی وہ فیصلہ تھا جس کے تحت آپ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو

گئے۔ ۱۹۱۴ء میں وزیر ہند کی کونسل کی اصلاحات کے سلسلے میں آپ ایک وفد کے ہمراہ لندن گئے اور وہاں ہندوستان کی نمائندگی بڑی خوبی سے سرانجام دی۔ ۱۹۱۷ء میں تحریک ہوم رول میں شامل رہے اور وقت کے سب سے بڑے دنیاوی حاکم لارڈ ولنگڈن کو ناک چنے چبوائے۔ جب وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن یہاں سے رخصت ہونے لگا تو لوگوں نے اسے بمبئی میں ایک ضیافت دینی چاہی۔ صرف جناح ہی تھے جنہوں نے عین جلسے میں کھڑے ہو کر وائسرائے کے خلاف تقریر کی اور اس کے عہد کے ظلم وستم بھی گنوائے۔ قائداعظمؒ کی اس بے باکی اور حریت پسندی سے خوش ہو کر اہل بمبئی نے ایک شاندار ہال تعمیر کیا جو آج بھی جناح ہال کے نام سے مشہور ہے۔

ہندوؤں کی مسلم کش کوششوں سے متاثر ہو کر قائداعظمؒ نے ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ کی صدارت کی اور نئے عزائم کے ساتھ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی سعی شروع کر دی۔ ۱۹۲۸ء میں آپ نے آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت کی اور نہرو رپورٹ کی مسلم کش دفعات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

اسی سال دہلی کے اجلاس مسلم لیگ میں اپنے مشہور چودہ نکات کا اعلان کیا جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مطالبات تھے۔ اب مسلم لیگ کی آواز ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچ چکی تھی۔

۱۹۴۰ء میں لاہور ریزولیوشن جسے قرارداد پاکستان بھی کہا جاتا ہے کے ذریعے

پاکستان کا مطالبہ کیا گیا۔ انگریز اور ہندو نے اسے ایک مجذوب کی بڑ قرار دیا۔ مگر جوں جوں مخالفت بڑھتی گئی مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوتے گئے اور زیادہ مضبوط اور متحد ہو گئے۔ آخر انگریز اور ہندو مجبور ہو گئے اور ۱۹۴۷ء میں حکومت برطانیہ کو اعلان پاکستان کرنا پڑا۔

قائداعظمؒ نے مسلم قوم کو ہندو کے ظلم وستم سے محفوظ رکھنے کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ غیر تو غیر اپنوں نے بھی ان کی بے حد مخالفت کی مگر مشیت ایزدی نے آپ کی مدد کی اور آزادی کا سہرا آپ کے سر بندھ گیا۔ آپ کی کوششوں کے نتیجے میں ملنے والی آزادی نے دس کروڑ مسلمانوں کو آزاد قوموں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ آپ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔ اس وقت آپ کی عمر بہتر (72) سال تھی۔ کثرت کار کی وجہ سے آپ کی صحت خراب ہو گئی۔ آپ بحالی صحت کے لئے کوئٹہ تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے زیارت چلے گئے لیکن آپ کی صحت بحال نہ ہو سکی۔ آخر ۱۹۴۸ء کو وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

قائداعظمؒ کا پیغام

محسن ملک وملت بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح معمار پاکستان ہیں۔ آپ نے قوم کی قیادت اس وقت سنبھالی جب مسلمانان ہند کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ انگریز اور ہندو کی انتہائی مخالفت کے باوجود انہوں نے پاکستان حاصل کر کے ہی دم لیا۔ آپ شروع ہی سے کمزور جسم رکھتے تھے۔ آپ پر کام کا دباؤ اس قدر زیادہ پڑ گیا تھا کہ آپ کی صحت اتنی خراب ہوگئی کہ ڈاکٹروں نے انہیں مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر وہ تو اس اولوالعزم مجاہد کی مانند تھے جو ایک لمحہ کے لئے نہ تلوار ہاتھ سے چھوڑتا ہے نہ گھوڑے کی پشت۔ آپ کی زندگی کیا تھی۔ بس کام کام۔ سفر سفر۔ آپ نصف صدی تک نگاہ بلند سے قوم کی رہنمائی کرتے رہے اور درس حریت دیتے رہے اور جواب دشمناں دینے کا فریضہ پوری لگن ہمت اور خلوص سے سرانجام دیتے رہے۔ آپ نے نظریہ اقبال کی کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور ان کی مذہبی، سیاسی معاشرتی ترقی کے لیے علیحدہ خطۂ ارض چاہیے، خوب ترجمانی کی۔ انہوں نے انگریز اور ہندو سے مطالبہ پاکستان منوا کر ہی دم لیا۔

ہمارے عظیم قائد نے قوم کا اتحاد، یقین اور تنظیم کا درس دیا۔ اپنی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے انہوں نے خود محنت کر کے یہ ثابت کیا کہ محنت انسانی ترقی کے لئے اس طرح ضروری ہے جس طرح زندگی کو چلانے کے لئے خوراک۔ اتحاد قوت ملی کا دوسرا نام ہے۔ یقین جذبہ ایمانی اور نصب العین کی کامیابی کے لیے اشد ضروری ہے اصول نظم وضبط اور تنظیم اعمال و کردار کی صحیح راہیں متعین کر کے

منزل مقصود تک پہنچنے میں آسانی پیدا کرتا ہے۔ ہم آہنگی بلندیٔ فکر و نظر پیدا کرتی ہے۔ ترقی و وسعت کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ قائداعظمؒ نے جرات، استقلال اور سعی پیہم کو شعار بنا کر قوم کو اس پر کاربند رہنے کا پیغام دیا۔ قوم ایک مشینری کی مانند ہے اس میں ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے اور اس کی صحیح کارکردگی کا انحصار ان تمام پرزوں پر ہے جو اس میں کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح سے ملک و قوم کا ہر فرد ایک اہم پرزہ ہے جسے اپنی اپنی جگہ پر پورے خلوص ہمت اور احساس فرض شناسی سے کام کرنا چاہیے۔ اقبال نے مسلمانوں بالخصوص مسلم نوجوانوں کی زندگی گزارنے کا صحیح ڈھنگ بتانے کے لئے ان الفاظ میں اپنے پیغام کی وضاحت کی۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

اقبال نے جو درس لفظوں میں دیا قائداعظمؒ نے اس پر عمل کر کے دکھایا اور ہمیشہ اس اصول پر کاربند رہے۔ آپ کے دل میں سوائے پروردگار عالم کے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ آپ سچی بات بے خوف و خطر کہہ دیتے تھے اور اپنے حق کو دوسرے سے تسلیم کروا کر چھوڑتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کسی مقدمہ کی پیروی کے لئے بمبئی کی ایک عدالت میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ عدالت میں جو کرسیاں وکلاء کے لیے مخصوص ہوتی ہیں ان میں سے کوئی بھی خالی نہیں تھی۔ سب کرسیوں پر وکلاء بیٹھے تھے اور ایک کرسی پر بمبئی کارپوریشن کا میئر بیٹھا تھا جو حکمران قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ قانون دان تھے اس لئے جانتے تھے کہ یہ کرسیاں صرف وکلاء کے لئے

مخصوص ہیں اور ان پر وکیلوں کے سوا کسی اور کو بیٹھنے کا کوئی حق نہیں ۔ قائداعظم جیسے جلیل المرتبت وکیل کے لئے کوئی سیٹ خالی نہ تھی ۔آپ نے جھٹ چپڑاسی کو حکم دیا کہ مئیر سے کہو کہ کرسی چھوڑ دے ۔ یہ کرسیاں وکلاء کے بیٹھنے کے لئے ہیں ۔ چپڑاسی بیچارہ گھبرا گیا کہ ایک تو بمبئی کارپوریشن کا مئیر اور دوسرے انگریز۔ اسے اٹھانے کی جرات نہ کر سکا۔ گرج دار آواز سے دوبارہ چپڑاسی کو حکم دیا اور مجبوراً اسے مئیر کو اٹھانا پڑا۔ وہ انگریز با اصول انسان تھا اس نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ اس نے بابائے قوم کی جرات کو بہت پسند کیا اور بہت تعریف کی ۔

آپ کے ایک موکل نے آپ کو ایک مقدمہ دیا۔ آپ نے اس مقدمہ کی ذمہ داری قبول کر کے اس کی پیروی شروع کر دی مگر عدالت نے فیصلہ مسٹر جناح کے موکل کے خلاف کیا جو بہت غیر متوقع تھا۔ آپ کو اس کا بہت دکھ ہوا۔ آپ نے اپنے موکل کو مشورہ دیا کہ عدالت نے فیصلہ غلط کیا ہے جو سراسر قانون کے خلاف ہے ۔ بہتر ہے کہ آپ اپیل دائر کر دیں ۔ چونکہ آپ کو اپنے موکل سے بہت ہمدردی تھی اس لئے آپ چاہتے تھے کہ کسی طور اسے اس کا حق مل جائے ۔ اپیل کا فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا تو موکل نے خوش ہو کر قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر بطور نذرانہ عقیدت گراں قدر فیس پیش کی ۔ آپ مسکرائے اور فیس لینے سے انکار کر دیا۔ موکل نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ جب آپ مقدمہ ہار گئے تھے تو میں نے آپ سے محض ازراہ ہمدردی اپیل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں محض اور محض آپ کی ہمدردی تھی فیس لینے کا کوئی خیال تک نہ تھا۔

اب چونکہ آپ نے مقدمہ جیت لیا ہے لہٰذا میں اپنے ضمیر کو دھوکا دے کر آپ سے فیس نہیں لے سکتا۔ جس ذہن سے میں نے آپ کو مشورہ دیا تھا اسی ذہن پر میں اب بھی قائم ہوں۔ ہمارے عظیم قائد نے ہمارے لئے ایسے ایسے اعلیٰ کردار کے نمونے چھوڑے ہیں جن کی قندیلیں روشن کر کے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اپنے ایمان کو مضبوط کر کے عمل پیہم اور نظم وضبط اور اتحاد کے ذریعے ہم اپنے ملک کو اس قدر ترقی یافتہ بنا سکتے ہیں کہ دنیا رشک کی نگاہ سے اسے دیکھے اور ہماری کامیابی وکامرانی دنیا بھر میں ایک مثال بن جائے۔

قائداعظمؒ کا یوم ولادت

ماہ دسمبر کا پچیسواں دن ہماری قومی تاریخ میں ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دن ہمارے محسن، بانی پاکستان بابائے قوم اور عظیم قائد کا یوم پیدائش ہے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ ایک عام تاجر پونجا جناح کے گھر پیدا ہونے والا بچہ مسلمانان ہند کی رہنمائی کر کے سب سے بڑے اسلامی ملک کی تعمیر کرے گا۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ یہ بچہ بھنور میں پھنسی ہوئی قوم کو ساحل امید تک لے جائے گا۔ کسے علم تھا کہ یہ نوزائیدہ بچہ ایک قائداعظم بنے گا اور ایک دنیا اس کے کارناموں پر فخر کرے گی۔

زندہ قومیں اپنے رہنماؤں کی یاد تازہ رکھتی ہیں۔ وہ ان کی یاد کو طاق نسیاں پر نہیں رکھ دیتیں بلکہ ان کی یاد کی تقریبات کو دیدہ و دل کے لہو سے گلرنگ کرتی ہیں تاکہ ان کے اصول و کردار زندہ رہیں اور تاریخ میں ایسے نقوش چھوڑ دیئے جائیں جن پر آنے والی نسلیں ناز کریں۔ وہ قومیں جو اپنے رہنماؤں کی یاد کو ختم کر دیتی ہیں زمانہ بھی ان کو ختم کر دیتا ہے۔

خوشی و مسرت کے مواقع کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب یہ مواقع پوری زندگی کی ترجمانی کرتے ہوں۔ جب یہ لمحے انفرادیت کی آغوش میں بیٹھ کر اجتماعیت کے جذبے کا دم بھرتے ہیں تو بے جان ذرے بھی جھومنے لگتے ہیں جیسے انہیں دست مسیحا نے چھو لیا ہو۔ قوم کا ہر فرد ایسی مسرت محسوس کرتا ہے جو زندہ قوموں کا ایک امتیازی نشان ہے۔

اس سال بھی پاکستان بھر میں قائداعظمؒ کا یوم ولادت انتہائی عقیدت و احترام سے منایا گیا۔ لاہور میں بھی یوم قائداعظم منایا گیا۔ اس روز لاہور کا ذرہ ذرہ جاگ اٹھا۔ حریم چمن میں دلکش شگوفے بہاروں کے حسین خواب کی تعبیر بن کر مسکرانے لگے۔ اقبال کے شاہین بچوں نے قائداعظم کی یاد میں جلوس نکالے۔ بینڈ نے فضا میں نغمے بکھیرے۔ ننھے منے بچوں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ بعض بچوں کی ٹولیاں عربی لباس میں تھیں۔ لوگ ان بچوں کے ذوق کی داد تالیاں بجا بجا کر دے رہے تھے۔ یہ سلسلہ تین گھنٹوں تک جاری رہا۔ قدموں کی چاپ، بازوؤں کی حرکت، دل کا جوش اور نظر کی تمکنت سے ایسا خاموش اظہار ہو رہا تھا جو خراج عقیدت کی شکل اختیار کر گیا۔ ان کے بعد ملٹری کے دستے آئے جنہوں نے انتہائی جوش و خروش سے مارچ کیا اور سلامی دی۔ لوگوں کے دل خوشی سے جھوم رہے تھے۔ خصوصاً اس موقع پر ننھے منے بچوں نے جس خلوص اور یک جہتی کا اظہار کیا اس کی یاد اہل لاہور کے دل میں ہمیشہ رہے گی۔ یہ بچے کل کے وارث ہیں اور قومی مستقبل کی تابناکی کے ضامن۔

شام کو لوگوں نے قائداعظمؒ کی ولادت کی خوشی میں چراغاں کیا۔ ان کے قلب و نظر روشن تھے۔ فضا اجالوں سے منور تھی۔ ماحول پر نور تھا اور رات کے اندھیرے اجالے بن گئے تھے۔ سرکاری عمارتوں کا سماں دیکھنے کے لائق تھا۔ ریلوے اسٹیشن، واپڈا ہاؤس، الفلاح بلڈنگ، عجائب گھر اور دوسری عمارات کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ لوگوں نے اپنی اپنی عمارات کو رنگ برنگ کے قمقموں سے سجایا

ہوا تھا۔ قائداعظم کا یوم ولادت یادگار دن ہے۔ اس روز ہم بابائے قوم سے اپنی عقیدت اور ارادت کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسی تقریبات قوموں کی زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کی قومیں اپنے عظیم رہنماؤں کی یاد مناتی ہیں اور انہیں خراج عقیدت پیش کرتی ہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

شہید ملت لیاقت علی خانؒ

قائد ملت خان لیاقت علی خاں کا شمار ان عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے جو پاکستان کے لئے پیدا ہوئیں، پاکستان کے لئے زندہ رہیں اور اپنی عزیز پاکستان ہی کے لئے قربان کی۔ آپ تعمیر پاکستان کے حوالے سے ملک کے صف اول کے اکابرین میں سے تھے۔ آپ قائداعظمؒ کے دست راست اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے آپ بابائے قوم کے معتمد خاص تھے۔

آپ کرنال کے نواب خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب ایران کے مشہور فرمانروا نوشیرواں سے ملتا ہے۔ آپ کا خاندان مشرقی پنجاب اور یوپی میں بہت بڑی جاگیروں کے مالک تھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے یوپی میں ہی حاصل کی۔ بی اے علی گڑھ یونیورسٹی سے کیا اور بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ جا کر آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں آپ نے قانون کی ڈگری حاصل کی۔

فارغ التحصیل ہو کر آپ نے ہندوستان واپس آ کر سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا اور ۱۹۲۶ء میں یوپی میں لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ عرصہ چھ سال تک ڈپٹی پریذیڈنٹ بھی رہے ۱۹۴۰ء میں مرکزی کونسل کے ممبر منتخب ہو کر مسلم لیگ کی نمائندگی بطور پارٹی لیڈر کی۔

آپ فطرتاً خاموش طبع اور محنتی انسان تھے۔ آپ کے دل میں قوم کا گہرا درد تھا۔ ظاہر داری تصنع اور منافقت سے آپ کو نفرت تھی۔ اسی لئے قائداعظم کی مردم

شناس نگاہوں نے آپ کو بھانپ لیا اور آپ کی قابلیت اور فرض شناسی کی قدر کرتے ہوئے آپ کو اپنا سیکرٹری منتخب کرلیا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک آپ نے قائداعظم کے سیکرٹری کے طور پر اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور تندہی سے سرانجام دیئے۔

۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو آپ پاکستان کے پہلے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ یوں ایک نہایت اہم تر ذمہ داری آپ کے کندھوں پر آن پڑی۔ آپ نے اپنی مسلمہ قابلیت، تدبر اور سیاسی سوجھ بوجھ کا پورا پورا ثبوت دیا۔ ایسے ایسے مسائل جو حل نہیں ہو رہے تھے آپ کے حسن تدبر سے حل ہو گئے۔ عالمی برادری میں بھی آپ نے پاکستان کا نام بلند کیا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد تو آپ پر بہت ہی ذمہ داری پڑ گئی تھی۔ آپ ہر مشکل کا مقابل نہایت مدبرانہ تحمل مزاجی سے کرنے کے عادی تھے۔ آپ نے اپنی قوت فیصلہ، خود اعتمادی اور نظم و ضبط کی بدولت عوام کا اعتماد حاصل کرلیا۔ آپ کی عظیم خدمات کے اعتراف کے طور پر قوم نے آپ کو قائد ملت کا خطاب دیا۔ آپ میں یقینی طور پر جرات، مستقل مزاجی اور بہترین انتظامی قابلیت موجود تھی جس سے شب و روز کام لے کر آپ نے آخری دم تک ملک و ملت کی بے غرض خدمت انجام دی۔

آپ نے ملک کے داخلی امور کو بھی نہایت بلند حوصلگی، جرات، تحمل، رواداری اور حسن تدبیر سے حل کیا۔ دستور پاکستان کے سلسلہ میں آپ نے ''قرارداد مقاصد'' کی تشکیل کی جس کی رو سے پاکستان کا آئندہ دستور اسلام اور جمہوریت

کی روشنی میں مرتب ہونے کی توقعات پیدا ہوگئیں۔ اس میں آپ نے پاکستان دستور کی اساس مندرجہ ذیل مسلمات پر رکھی۔

۱۔ انسانی قوانین اور حاکمیت کی بجائے حاکمیت خدا تعالیٰ کی ہے۔

۲۔ بنیادی طور پر شریعت اسلامیہ کے قوانین دستور کی اساس ہوں گے۔

۳۔ خلاف شریعت قوانین میں ترمیم کر لی جائے گی۔

۴۔ حکومت پاکستان اپنے اختیارات کو اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرے گی۔

آپ کے سکے کی قیمت میں کمی کے فیصلے کو بہت سراہا گیا اور پاکستان کی اقتصادیات پر اس فیصلے کا بہت اچھا اثر پڑا۔ آپ نے امریکہ کا دورہ کیا اور وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شامل ہو کر پاکستان کی حقیقت کو تسلیم کروایا۔ جب بھارت نے پاکستانی سرحدوں پر فوج جمع کی تو آپ نے بھارت کو مکا دکھا کر اپنی قوم کو متحد ہونے کی تلقین کی اور بھارت کو کہا کہ ہم کمزور نہیں ہیں، تمہارا مقابلہ پوری قوت اور جوانمردی سے کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کی ہی قابلیت اور آپ کے حسن نظر کا نتیجہ تھا کہ لیاقت نہرو معاہدہ طے پا گیا جس نے دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا۔

جلال الدین افغانی کی طرح آپ بھی مسلمانان عالم کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے خواہشمند تھے۔ اسی سلسلے میں ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو آپ راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ایک اہم تقریر کرنے والے تھے۔ آپ نے کھڑے ہو کر ابھی

صرف اتنا ہی کہا تھا۔ ''میرے پیارے پاکستانی بھائیو'' کہ ایک شقی القلب نے پستول سے آپ پر فائرنگ کی۔ کئی گولیاں آپ کے سینے میں لگیں جس کے نتیجہ میں آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قوم کو داغ مفارقت دے گئے۔ ملک و ملت کو ایسے مخلص اور قابل سیاست دان بہت مشکل سے ملا کرتے ہیں۔ قوم آپ کو ''شہید ملت'' کہہ کر یاد کرتی ہے۔ آپ کو پاکستان سے اس قدر محبت تھی کہ بوقت شہادت بھی آپ کی زبان سے جو جملہ نکلا وہ یہ تھا۔ ''خدا پاکستان کی حفاظت کرے۔''

پاکستان کا مطلب کیا؟

پاکستان خدا تعالیٰ کی خاص نعمت ہے جو ہمیں عطا کی گئی۔ اس نعمت خداداد کے وجود میں آنے سے پہلے کے حالات وواقعات جب بھی ذہن میں آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب خالق پاکستان کے یقین محکم، عمل پیہم، عظمت کردار، بلندی نظر، پختگی ارادہ، جذبہ حریت وقومیت اور خلوص و ایثار کی وجہ سے شرمندۂ تعبیر ہوا ورنہ ہندو اور انگریز جیسی دو دھاری تلوار سے بچ کر نکلنا ہی مشکل تھا چہ جائے کہ سلامت بچ کر حصول مقصد میں کامیابی بھی حاصل کی جائے۔ آج سے تقریباً نصف صدی قبل برطانوی حکومت دنیا کے بیشتر حصے پر چھائی ہوئی تھی، طاقت کے اعتبار سے بہت مضبوط حکومت کے رموز کے پوری طرح واقف، انگریز کی نظر محتاط، ذہن چالاک اور اس پر مستزاد اندرون ملک کی اکثریتی ہندو قوم کی اس حاشیہ بردار لومڑی کی طرح عیار اور منافق مسلمان کے کے لئے مار آستین بنی ہوئی تھی۔ ایسے حالات میں قدرت نے پاکستان بنانے کا شرف قائداعظم محمد علی جناح کو بخشا جنہوں نے آخری سانس تک وطن عزیز کی خدمت کی۔

ہندو چالاک تھا اور انگریز اس کی پشت پر تھا۔ اس قوم میں بہت ذہین صاحب علم سیاستدان اور اپنی قوم کے لئے مخلص گاندھی، سبھاش چندر بوس اور جواہر لال نہرو جیسے لیڈر پیدا ہو چکے تھے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے لوگ ہندوستانی ہیں۔ یہ سب ایک قوم ہیں۔ مذہب کے اعتبار سے ہندو اور مسلمان دو قومیں تصور نہیں ہونی چاہئیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انگریز کے بعد

ہندوستان میں متحدہ حکومت بنائی جائے۔ چونکہ ہندو اکثریت میں تھے لہٰذا ملک کی باگ دوڑ یقینی طور پر اکثریتی قوم یعنی ہندو کے ہاتھ میں رہتی اور اکثریتی قوم ہمیشہ اقلیتی قوم پر ہر لحاظ سے سوار رہتی ہے اگر خدانخواستہ ایسا ہو جاتا تو حاکمیت حقیقی معنوں میں اکثریتی قوم کو ہی حاصل ہوتی۔ اقلیتی قوم یعنی مسلمان اکثریتی قوم کے ماتحت ہی رہتی۔ سیاست و تجارت قانون سازی، عدلیہ اور انتظامیہ میں ہر جگہ ہندوؤں ہی کی بالادستی ہوتی۔

ستم بالائے ستم مسلمان ایک بہت بڑی محرومی سے بھی دوچار تھے۔ انکے پاس تجارت تھی، نہ علم۔، نہ ہی وہ کلیدی اسامیوں پر قابض تھے۔ بس بالکل بے یارومددگار تھے۔ جو لوگ صاحب فہم و دانش تھے یا جن سے قوم کی رہنمائی کی توقع کی جاسکتی تھی ان کو ہندو نے پہلے ہی نظریہ متحدہ حکومت کا حامی بنا کر کانگرس میں شامل کرلیا تھا۔ ایسے مسلمان لیڈر جو کانگرس میں شامل ہو چکے تھے۔ انہیں یہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ کانگرس کی آزاد قومی اور جمہوری حکومت درحقیقت مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور قومی وجود کے لئے موت کا پیغام تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی تمام قوتیں مل کر آزادی حاصل کریں اور بعد میں بھی باہم ایک قوم کی صورت میں ملک پر حکومت کریں تو ملک میں زیادہ استحکام ہوگا۔ مگر قائداعظم چونکہ ہندوؤں کو بہت قریب سے دیکھ چکے تھے اس لئے وہ ان کے ہم نوا نہ بنے۔

کانگرس کی چال منافقانہ تھی۔ ظاہری شکل میں تو وہ اتحاد و اتفاق کی تلقین کرتے تھے مگر اندرون خانہ مسلمانوں کو زیر کرنے کی فکر میں تھے اور یہ کچھ بعد میں

ثابت بھی ہوا۔ گاندھی، نہرو اور سبھاش اعلان تو بار بار یہی کرتے تھے کہ متحدہ قومی حکومت میں مسلمانوں کے حقوق کی پامالی کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کے لئے بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لیکن ان میں تعصب اس قدر تھا کہ اردو زبان میں سے عربی فارسی کے الفاظ نکال نکال کر ہندی اور سنسکرت کے الفاظ ٹھونسنے شروع کر دیئے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے مطابق کانگرس کے اصل عزائم بے نقاب ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آزادی کے ان علمبرداروں نے اس ایکٹ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے ایک قومی حکومت کا قیام قبول کرلیا۔ اس ایکٹ میں جمہوری نظام تھا جو کانگرس کے متعصبانہ عزائم کو پورا کرتا تھا۔ اس نظام کے تحت اکثریتی قوم ایسی قانون سازی کر سکتی تھی جس سے آہستہ آہستہ اسلامی تہذیب کا خاتمہ ہو جاتا۔ ''ودیا مندر سکیم'' اور ''واردھا سکیم'' کے تحت مسلمان بچوں پر ہندو تہذیب کا رنگ چڑھانے کی کوششیں کی گئیں جو آزادی کی متحدہ جدوجہد کے پرستاروں کے لئے عبرت کا سامان تھیں۔

اس وقت مسلمانوں کو ایسی قیادت کی اشد ضرورت تھی جو آہنی ارادے کی مالک ہو۔ صاحب نظر ہو۔ بکاؤ مال بھی نہ ہو۔ بے خوف اور نڈر ہو، ہندوؤں اور انگریزوں کی چالوں سے واقف ہو اور ان کا دندان شکن جواب دینے کے قابل بھی ہو۔ مفکر پاکستان علامہ اقبال نے مسلمانوں کا خون اپنے نغمہ ہائے جاں سوز سے گرمایا اور قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اس ڈگمگاتی کشتی کو لب ساحل تک لانے کے لئے اپنی جان کی پروانہ کی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ وہ مکمل آرام کریں لیکن وہ

کہتے تھے کہ ہندو قوم جاگتی ہے ان کے لیڈر آرام سے گہری نیند سو سکتے ہیں۔ میری قوم سو رہی ہے میں کیسے آرام کر سکتا ہوں۔ بہر کیف پشاور سے راس کماری تک سارا ملک نعرہ پاکستان، پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ہر شخص نے پاکستان کے مطالبہ کی بھرپور حمایت کی۔ ان لوگوں نے تو اس مطالبے کی حمایت کرنی ہی تھی جنہوں نے پاکستان میں رہنا تھا مگر جذبے کی شدت کا یہ حال تھا کہ ان لوگوں نے بھی پوری حمایت کی جنہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ اور ساری عمر بھارت میں ہی رہنا تھا۔ انہوں نے محض اس لئے اس کی حمایت کی کہ انہیں اپنی دینی اقدار کی بقاء مطلوب تھی نتیجتاً ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکت خداداد پاکستان دنیا کے نقشہ پر ظہور میں آئی۔

اس تحریک کے بنیادی مطالبات و نظریات تھے کہ:

الف: ہندوستان کے مسلمان ایک علیحدہ خطہ ارض کا مطالبہ کرتے تھے تا کہ اپنی معاشرتی تہذیبی اور مذہبی اقدار کی بقاء اور نشوونما کر سکیں۔

ب: مسلمان یہ ثابت کرنے کے لئے ایک ایسا موقع تلاش کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ یہ ثابت کر سکیں کہ مسلمان ہندوؤں سے بالکل مختلف ایک قوم ہیں جس کی بنیاد رنگ و نسل جغرافیائی حدود یا وطنیت پر نہیں بلکہ دنیا میں جہاں جہاں بھی کلمہ توحید پڑھنے والے ہیں وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس سرزمین پر صرف اور صرف خدا کا قانون چل سکتا ہے جو ساری دنیا کے لئے پیغام امن ہے۔ دنیا کے سامنے اسلامی نظام حیات کو نافذ کر کے اس کی عملی سبقت ثابت کی جا

سکے۔

پاکستان حاصل کیے ہوئے لگ بھگ نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ہمارے ملک نے ہر جہت میں ترقی کے مراحل طے کئے ہیں۔ صنعتی تجارتی زرعی اور اقتصادی میدان میں بہت ترقی کی ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ جس مقصد کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا ہم اسے یک سر بھول چکے ہیں۔ پاکستان اسلامی نظام کو عملی شکل دینے کے لئے حاصل کیا گیا تھا تا کہ یہاں کے مسلمان خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کر کے اس خطہ زمین کو گہوارۂ امن بنا سکیں۔ مگر افسوس کہ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو احکام الٰہی کو اپنے دکھوں کا مداوا نہیں سمجھ رہے۔ اگر خدانخواستہ ہم نے خدا کے بھیجے ہوئے دین پر لبیک نہ کہا اور اس مقصد کو فراموش کر دیا جس کے لئے پاکستان معرض وجود میں آیا تھا تو ہم خسارے میں رہیں گے۔ لہٰذا ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ پاکستان کس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔

حب وطن

انسان کی پہچان فقط اس کا وطن ہے
انساں ہے وہی جس کا کوئی اپنا وطن ہے
(اطہر صدیقی)

انسان جس خطۂ ارض میں پیدا ہوتا ہے، بچپن گذارتا ہے اور جہاں کھیل کود کر جوان ہوتا ہے، جہاں اس کے عزیز و اقارت رشتہ دار رہتے ہیں، جن سے وہ گھل مل کر پیار اور محبت سے دن گزارتا ہے۔ جہاں کے سبزہ زاروں سے اسے انس ہو جاتا ہے اسے وہاں کی ہر چیز سے لگاؤ ہو جاتا ہے۔ یہی عزیز ترین خطہ اس کا وطن کہلاتا ہے۔ جس کا ہر ذرہ ایک محبّ وطن انسان کو پیارا ہوتا ہے اور بقول شاعر اسے محسوس کرتا ہے کہ

جنت سے کہیں بڑھ کر حسیں میرا وطن ہے
ہم سر ہے فلک کی جو زمیں میرا وطن ہے
(حفیظ صدیقی)

ہر شخص کو اپنے وطن کے ذرے ذرے سے محبت ہوتی ہے۔ اسے وہاں کے ماحول سے دلی محبت ہوتی ہے۔ وہاں کے گلی کوچے اسے جان سے عزیز ہوتے ہیں۔ اس کے جہاں جہاں قدم رکھے ہوتے ہیں کبھی بھلا نہیں سکتے۔ ان جگہوں کی یادیں اس کی طبیعت کا حصہ بن گئی ہوتی ہیں۔ قدرت نے انسان کے دل میں حب یعنی محبت کا مادہ بھی پیدا کیا ہے۔ جذبہ حب کے بغیر انسانیت کی تکمیل

نہیں ہوتی۔ وطن سے محبت کو حب وطن کہتے ہیں۔ جذبہ حب وطن مقدس، باوقار اور آبرومندانہ جذبہ ہے۔ ناموس وطن کے لئے جان پر کھیل جانا ایک عظیم عمل ہے۔

وطن کی کشش کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے وطن سے دور بیٹھا ہو۔ وطن کی ایک ایک چیز کی یاد اسے ستاتی رہتی ہے۔ اپنے وطن کی بہاریں جب اسے یاد آتی ہیں تو اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اڑ کر وطن پہنچ جائے۔ غیر جگہ پر نہ اسے وہ ماحول ملتا ہے نہ یاران دل بند ملتے ہیں۔ نہ وہ فضا ملتی ہے نہ والدین ہوتے ہیں نہ عزیز و اقارب ہوتے ہیں نہ وہ ندی نالے نہ وہ کوہسار و سبزہ زار، وطن سے باہر ہر چیز مل سکتی ہے مگر لذت یگانگت نہیں مل سکتی۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ

جب وطن از ملک سلیماں خوشتر
خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

جذبہ حب وطن نہایت اعلیٰ و ارفع جذبہ ہے۔ ہم اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں تو اس کی ہر چیز سے محبت کرتے ہیں۔ وطن سے پیار کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے ذرے ذرے کو اپنی آبرو سمجھ کر اس کی حفاظت کی جائے کہ وطن کی زمین بھی ماں کی آغوش کی مانند ہوتی ہے جس سے ہمیں اس شعر کے مصداق ماں جیسی محبت ہونی چاہیے۔

محبت ٹوٹ کر کرتی ہوں اس سے

زمیں بھی ماں کی صورت مہرباں ہے

(زاہدہ صدیقی)

جس مقام پر بھی کوئی ہے اسے وطن کے لئے اور وطن کی ترقی کے لئے کوشاں رہنا چاہیے۔ وطن کی تجارت، تعلیم، تہذیب، صنعت وحرفت، اقتصادیات اور ہر شعبے میں ترقی کے لئے خلوص دل سے محنت کرنا ہر فرد کا فرض اولین ہے۔ اس مٹی کا مفاد ہمارا مفاد ہے۔ یہاں کے بسنے والوں کی منفعت ہماری منفعت ہے۔ اس کی بہاروں میں گل کھلیں گے تو ہمارے اپنے دماغ معطر ہوں گے۔ یہاں کی پیداوار بڑھے گی تو ملکی سرمایہ بڑھے گا۔ یہاں کی صنعت وتجارت اگر دنیا پر چھا جائے گی تو گویا ہم چھا جائیں گے۔ حب وطن کا جذبہ ہمیں طاقت عطا کرتا ہے۔ اگر ہم طاقت ور ہوں گے تو ہماری طرف کوئی ملک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گا۔ ہم باوقار زندگی بسر کریں گے۔

حب وطن کا صحیح تقاضا تو یہ ہے کہ انسان کو اپنے اہل وطن کے دکھ درد کا پورا پورا احساس ہو۔ اپنے ہم وطنوں کے مسرت وغم میں برابر کا شریک ہونا چاہیے اور ان کی مصیبت میں ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ جو لوگ صاحب علم ہیں انہیں چاہیے کہ وہ اپنے علم کو اپنے تک محدود نہ رکھیں بلکہ اس نور کو دور دراز تک پھیلائیں۔ انجینئروں پر لازم ہے کہ وطن کے لئے نئی نئی چیزیں ایجاد کر کے ملک کو ترقی کی راہ پر چلائیں۔ ڈاکٹروں کا فرض ہے کہ دکھی انسانیت کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں۔ محض حصول زر ہی ان کا مطمع نظر نہیں ہونا چاہیے بلکہ انہیں سمجھنا چاہیے کہ انہوں

نے پیغمبری پیشہ اپنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو حکمت بخشی تھی۔ انہوں نے ساڑھے تین ہزار سال کی عمر پائی۔ مگر جب عزرائیل فرشتہ آیا تو اس نے سوال کیا یا حضرت اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت دی آپ تو سونے کے محل بنا سکتے تھے لیکن آپ تو ایک جھونپڑی میں پڑے ہیں۔ انہوں نے فرمایا بھئی تمہارے انتظار میں لگا رہا یا دکھی لوگوں کی خدمت کرتا رہا۔ اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ محل بنانے کے لئے سوچ سکوں۔ بہر حال کاشتکار ہو یا تاجر طالب علم ہو یا استاد ہر فرد کو اپنا فرض منصبی پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھانا چاہیے۔ سرمایہ دار ہو یا مزدور دونوں کو مل کر وطن عزیز کے تعمیری اور ترقیاتی منصوبوں کی تشکیل کے لئے شب و روز مستعد رہنا چاہیے۔ جو لوگ سرکاری ملازم ہیں ان کو یہ سمجھ کر اپنی ڈیوٹی پر نہیں جانا چاہیے کہ کام کریں یا نہ کریں تنخواہ تو ہمیں مل ہی جائے گی بلکہ یہ سمجھ کر اپنے فرائض کو ادا کرنا چاہیے کہ ہم جس قدر محنت اور حسن کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے اسی قدر ہمارا ملک ترقی کرے گا۔

جو لوگ خود غرض ہیں اور محض حصول زر کے لئے کوشاں رہتے ہیں ان کا نظریہ صرف پیسہ ہوتا ہے چاہے وہ رشوت سے حاصل کریں یا ملاوٹ سے، ذخیرہ اندوزی سے یا سمگلنگ سے۔ غلط ذرائع سے پیسہ کمانے والے وطن کے دشمن اور عوام کے قاتل ہیں۔ یہ ناقابل معافی لوگ ہیں۔ ہر محبّ وطن کو ان پر کڑی نظر رکھنا چاہیے۔ ہر ممکن کوشش کی جائے کہ ان لوگوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔ یہ لوگ وطن کے غدار ہیں اور ننگ وطن ہیں۔ بعض ایسے بدکردار بھی دیکھے گئے ہیں جو مریضوں

تک سے بھی دھوکا کرتے ہیں اور ادویات میں ملاوٹ کرتے ہیں یا نقلی ادویات تیار کرتے ہیں۔ وہ لوگ قانونی اور اخلاقی مجرم ہیں۔ دوسری طرف دیکھئے ایسے ایسے لوگ بھی ہیں جو ناموس وطن پر کٹ مرتے ہیں۔ یہ لوگ شہدائے وطن ہوتے ہیں اور تاریخ انہیں فراموش نہیں کرتی۔ ان شہدائے وطن میں میجر عزیز بھٹی، کیپٹن سرور، میجر طفیل اور سوار محمد حسین جیسے نام بھی ہیں، جو تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے گئے ہیں، قیامت تک ان کی لحد پر رحمت برستی رہے گی کہ انہوں نے وطن عزیز کے لئے اپنی جان تک کی پروانہ کی۔

الٰہی وطن میرا آباد رکھ
ابد کی گھڑی تک اسے شاد رکھ
مرے اس وطن کو تو آزاد رکھ
یہ تجھ سے دعا ہے مری ہر گھڑی
کروں اس پہ قربان میں ہر خوشی
کہ میرا وطن ہے مری زندگی

(زاہدہ صدیقی)

ہمارا وطن عزیز

مرے دیس کے ذرے ذرے میں تنویر جمال خوباں ہے
اس گلشن کا ہر برگ و شجر تصویر جمال خوباں ہے
اس دیس کی مست ہواؤں میں تاثیر جمال خوباں ہے
ہر انساں کی تقدیر یہاں تقدیر جمال خوباں ہے
(طاہر شادانی)

ہمارا وطن پاکستان وہ وطن نہیں جو وراثت میں اس کے بسنے والوں کو ملا ہو بلکہ پاکستان کی بنیادیں استوار کرنے کے لئے متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہڈیاں اینٹوں کی جگہ، گوشت گارے کی جگہ اور خون پانی کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ اتنی گراں قدر تخلیق کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے تعمیر پاکستان میں تن من دھن بیوی بچے، بہن بھائی، عزیز و اقارب قربان کئے۔ پاکستان یونہی حاصل نہیں ہو گیا تھا۔ اس کے حصول کے لئے لاکھوں مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ کتنی ماؤں کے سامنے ان کے بچے قتل کر دیئے گئے۔ کتنے بے بسوں کے سامنے ان کے خاندان کو مکانوں میں بند کر کے نذر آتش کر دیا گیا کتنی پاکدامنوں نے نہروں اور کنوؤں میں ڈوب کر پاکستان کی قیمت ادا کی۔ کتنے بچے یتیم ہوئے جو ساری عمر اپنے والدین کی شفقت کے لئے ترستے رہے۔

اس کی وادیاں اپنے اندر فردوس کی رعنائیاں لئے ہوئے ہیں۔ ہرے بھرے اور وسیع و عریض کھیت سونا اگل رہے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہمیں ہر قسم کی

آزادی اور ہر طرح کا سامان آسائش و آرائش میسر ہے مگر ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس میں سلطان ٹیپو کا خون، سرسید کی نگاہ دوربین، اقبال کے افکار، قائداعظم کی جہد مسلسل اور دوسرے اکابرین کا ایثار بھی شامل ہے۔ ان لوگوں کا مقصد کیا تھا۔ ''ایک آزاد اور خودمختار اسلامی مملکت کا حصول۔''

چودہ اگست ۱۹۴۷ء وہ مبارک دن تھا جب مملکت خداداد پاکستان معرض وجود میں آئی۔ مسلمانوں کے اتفاق اور قائداعظم کے خلوص کی وجہ سے یہ عظیم اسلامی سلطنت وجود میں آئی۔ ہندوؤں نے طرح طرح کی مکاریوں سے پاکستان کی مخالفت کی۔ انگریزوں نے بھی بہت رکاوٹیں پیدا کیں مگر خدا کا شکر ہے پاکستان بن کر رہنا تھا اور بن کر ہی رہا۔ اس وقت مسلمانوں کا یہی نعرہ تھا۔

لے	کے	رہیں	گے
بن	کے	رہے	گا

پاکستان

اور

پاکستان	کا	مطلب	کیا
لا	الٰہ	الا	اللہ

دشمنوں نے قائداعظم کی اس تجویز کی تضحیک کی اور اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ہمارا مطالبہ پاکستان حق وصداقت پر مبنی تھا۔ حق اپنے آپ کو منوا لیتا ہے۔ اور دشمنوں کے ناپاک عزائم خاک میں مل جاتے ہیں۔ آج پاکستان اپنی عظمت کو دنیا سے تسلیم کروا چکا ہے۔

ہمیں پاکستان سے محبت ہے۔اس کے بانی سے عقیدت ہے۔اس کے مصور سے دلی لگاؤ اور ان کے مجاہدین کے لئے ہمارے پاس مغفرت کی دعائیں ہیں جنہوں نے اس کے لئے قربانیاں دیں، اور تاج برطانیہ کے خلاف اپنے گھر بار کو قربان کیا اپنی اولاد کی پروانہ کی اور سلاسل و زنداں کی سختیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ جب آزادی کے جذبہ سے تمام ہندی مسلمان سرشار ہوگئے تو زنداں کی دیواریں لرز اٹھیں۔فرنگی استعمار کو زوال آ گیا اور غلامی کی زنجیریں موئے آتش دیدہ بن گئیں۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا
اقبال

قدرت نے پاکستان کو ہر نعمت سے نوازا ہے۔دریاؤں ندی نالوں کی افراط ہے جن سے زمین سیراب و آباد کی جارہی ہے۔اس ملک کے نوجوان تنومند، حوصلہ مند اور ہنر مند ہیں۔وہ تجارتی، صنعتی اور زرعی میدان میں بھی خوب ترقی کر رہے ہیں اور جنگی مہارت میں بھی دنیا کے بہترین ماہرین میں شامل ہیں۔یہاں پر گیہوں، کپاس، تیل نکالنے کے بیج اور چاول کثرت سے ہوتے ہیں جو ایکسپورٹ بھی ہوتے ہیں۔معدنیات کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔مثلاً نمک مٹی کا تیل کوئلہ اور سیمنٹ بنانے کا پتھر جپسم اور زمرد کے ذخائر بھی دریافت ہو چکے ہیں۔مزید تحقیق جاری ہے۔وقت آئے گا جب ہم تیل میں بھی انشاءاللہ خود کفیل

ہو جائیں گے۔

بین الاقوامی معاملات میں بھی پاکستان بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔ پاکستان اپنے ہمسایوں سے دوستی کا خواہاں ہے اور تمام دوسرے ملکوں سے بھی تجارتی اور ثقافتی تعلقات بڑھا رہا ہے۔ اسلامی ممالک سے خاص طور پر معاہدے کئے جا رہے ہیں اور ہر اس ملک سے دست تعاون بڑھایا جا رہا ہے جو امن کے لئے کوشاں ہیں۔ ہم پر امن رہنے میں یقین رکھتے ہیں، مگر اپنی بقا کے لئے اپنی قوت کو قائم رکھنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر پاکستان کو اس ملک عزیز سے سچی محبت کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

مجھے اپنے وطن عزیز سے محبت کیوں ہے؟

سبز ہلالی پرچم اپنا ہے اپنی پہچان
اس کو جب لہراتا دیکھیں جان میں آئے جان
(حفیظ صدیقی)

مجھے اپنے وطن عزیز سے کیوں محبت ہے؟ میرے پاس اس کا یہی جواب ہے کہ میرا وطن میری ماں کی گود ہے، مجھے اس سے محبت کیوں نہ ہو؟ میں اس میں پل کر جوان ہوا ہوں۔ اسی نے اپنی آغوش محبت میں میری پرورش کی ہے۔ میں اس کے جسم کا حصہ ہوں۔ میرا وطن میری ماں ہے۔ میرا پیار ماں سے پیار کی مانند بالکل فطری ہے۔ اس سے پیار میری آبرو ہے۔ اس کی خدمت میری عظمت ہے۔ اس کی سرحدوں کی حفاظت میرا ایمان ہے۔ اس کے لئے قربان ہونا میری شہادت ہے۔

مولائے کائنات نے جذبہ حب وطن انسان کی فطرت میں ودیعت کر رکھا ہے۔ یہ پاکیزہ جذبہ ہر اچھے شہری میں ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ میرا جزو ایمان ہے۔ میں اپنے وطن کی بے لوث خدمت کرنے کا متمنی ہوں۔ کوئی شخص جہاں بھی جائے گا اس کی ذات نہیں پوچھی جائے گی۔ وہ اپنی پہچان اپنے ملک سے کروائے گا۔ میں پاکستان ہوں۔ میں افغانی ہوں۔ میں امریکن ہوں، میں جرمن ہوں، میں فرانسیسی یا ترکی ہوں۔ اسی نام سے اس کی عزت ہوگی اور اسی قدر عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا جس قدر اس کے باشندے اپنے وطن سے مخلص ہوں

گے یا جس قدر وہ اپنے وطن سے محبت کرتے ہوں گے یا جس قدر اپنے ملک کی ترقی وخوشحالی کے لئے کوشاں ہوں گے۔ گویا ہر شخص کی عزت کا معیار اسی قدر ہی بلند ہوگا جس قدر اس کی قدر و قیمت اس کے باشندوں نے پہچانی ہوگی۔ جس ملک کے لوگ اپنے ملک کے وفادار ہیں اس کے لئے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں اور جان و مال اور فکر و عمل سے اس کی خدمت کرتے ہیں ان کا ملک ترقی کرتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت اور عزت بڑھتی ہے اور اسی رشتہ اور مناسبت سے اس کے باشندوں کی عزت و وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی شخص کے وقار کا انحصار اس کے ملک کی عزت پر ہے اور ملک کا انحصار اس کے باشندوں کے کردار و افعال پر ہے۔ اگر آج کسی ترقی یافتہ ملک کا وقار بلند ہے تو اس لئے ہے کہ اس ملک کے باشندوں نے اپنے ملک کی پورے خلوص سے خدمت کی ہے اور جس قدر وہ ترقی یافتہ ہے اسی نسبت سے اس کے باشندوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ گویا ملک وقوم کی خدمت کرنا اپنی خدمت کرنے کے مترادف ہے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے ملک کو نقصان پہنچانا اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہوا۔ وطن سے وفاداری اپنے آپ سے وفاداری ہے۔

مجھے اپنے ملک کے لہلہاتے سبزہ زاروں سے محبت ہے۔ مجھے اس کے پہاڑوں، کوہساروں، میدانوں، ندی نالوں اور دریاؤں سے محبت ہے۔ مجھے اس کا ذرہ ذرہ آفتاب کی مانند روشن لگتا ہے۔ اس کے گل وسمن میں میں ماہتاب کی رنگینیاں پاتا ہوں۔ اس کے نغمہ ہائے مرغان چمن کو اپنے لئے باعث سکون و

طمانیت سمجھتا ہوں۔ اس کے گل ہائے رنگیں میری آنکھوں کا نور اور میرے دل کا قرار ہیں۔ مجھے اپنے وطن کی مٹی سے پیار کی خوشبو آتی ہے۔ مجھے اس کے باشندوں اور اس کے شہروں، قصبوں اور دیہات سے دلی لگاؤ ہے۔ اس کی عمارات اور اس کی سڑکیں مجھے بھلی لگتی ہیں۔ اس کے کسانوں، دہقانوں اور مزدوروں سے مجھے محبت ہے۔ اس کے علماء فضلاء سے مجھے عقیدت ہے۔ میں اس کے سائنسدانوں، دانشوروں، ماہرین اور فن کاروں کی عظمت کی تعریف کرتا اور انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں جہاں بھی چلا جاؤں اور جس حال میں بھی ہوں میرا دل وطن کی محبت کے لئے تڑپتا ہے۔

میرے وطن پاکستان کو قدرت نے ہر نعمت سے نوازا ہے۔ یہاں کی مٹی بہت زرخیز ہے۔ زراعت و صنعت کے مواقع بہت زیادہ ہیں۔ پیداوار بہت ہوتی ہے۔ اناج میں ہم خود کفیل ہو چکے ہیں۔ معدنیات کا ذخیرہ موجود ہے۔ مثلاً زمرد، جپسم، سیمنٹ بنانے کا پتھر اور کوئلہ وغیرہ۔ مزید تحقیق جاری ہے۔ وقت آئے گا جب ہم تیل میں بھی خود کفیل ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ۔

یہاں کے باشندے ذہین، محنت کش اور پرعزم ہیں۔ سائنسدان، انجینئر اور پیشہ وارانہ ماہرین کافی تعداد میں پیدا ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ نونہالان قوم فنی تعلیم و تربیت کے حصول کے لئے بھی روز و شب کوشاں ہیں۔ یہاں کے عوام مہمان نواز، خوش اخلاق، وسیع الظرف اور باہمت ہیں اور جذبہ حب وطن سے سرشار ہیں۔ وہ وقت آنے پر جان و مال کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ مجھے

اس حق گوئی میں کوئی باک نہیں کہ میرا ملک ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں نہیں ہے مگر اس کا شمار ترقی پذیر ملکوں کی صف میں ہے۔ ہم روز بروز ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں اور انشاء اللہ وقت آئے گا کہ ہمارا شمار بھی ترقی یافتہ ملکوں میں ہونے لگے گا۔

بین الاقوامی معاملات میں بھی پاکستان بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔ پاکستان اپنے تمام ہمسایوں سے دوستی کا خواہاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دوسرے ممالک سے تجارتی اور ثقافتی معاہدے کئے جا رہے ہیں۔ اسلامی ممالک بھی ہمارے لئے جذبہ اخوت سے سرشار ہیں اور ہماری مشکلات میں ہمارے ساتھی ہیں۔ ہمسایہ ملک چین سے ہمارے بہت ہی زیادہ دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ آڑے وقت میں ہمارے کام آتا ہے۔ ہماری خارجہ پالیسی بالکل آزاد اور غیر جانبدار ہے۔ ہم ہر اس ملک سے دست تعاون بڑھانے کے لئے تیار ہیں جو امن کے لئے کوشاں ہے کیونکہ ہم پرامن رہنے میں یقین رکھتے ہیں۔ تاہم اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے قوت دفاع کو یقینی بنانا اور بامر مجبوری دشمن کی ہر چال اور اس کے ہر وار کو ناکام بنانا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر پاکستان کو اس ملک عزیز سے سچ محبت کی توفیق عطا فرمائے اور اس میں رہنے والوں کا حامی و ناصر ہو۔

یوم پاکستان اور اس کا مقصد

آج کے دن آزاد ہوئے ہم
آج کے دن سب دور ہوئے غم
لہرایا آزاد فضا میں
چاند ستارے والا پرچم

(شاہدہ صدیقی)

تاریخ انسانی کے اوراق ہمت و استقلال کی ان سنہری داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جن کی خوشبوئے جانفزا سے دنیائے علم و عمل ہمیشہ معطر رہے گی۔ پاکستان بھی ایسے ہی جلیل القدر اور اولوالعزم مجاہدین صف شکن کی سعی و کوشش کا ثمر ہے۔ ہندوستان کی ہزار سالہ حکمرانی سے محروم ہو جانے کے بعد ہندوستانی مسلمان فرنگی سامراج اور ہندوؤں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو کر ذلت آمیز غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جب ہندوؤں کے تعصب اور انگریز سے ان کی ملی بھگت کا علم ہوا تو حکیم الامت علامہ اقبال کے نغمہ ہائے پرسوز کے ہم نوا بن کر قائداعظمؒ کی قیادت میں مسلمانوں کا کاروان آزادی حصول پاکستان کی منزل کی طرف رواں دواں ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان پاس ہوئی اور صرف سات سال کے قلیل عرصے میں پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ اسے معجزہ کہہ لیجئے یا اس مرد مجاہد کی شب و روز کی مسلسل اور انتھک محبت کا نتیجہ کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو سلطنت پاکستان دنیا کی سب سے بڑی مسلمان ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھری۔

تعمیر پاکستان میں سب سے بڑی قربانی حضرت قائداعظمؒ کی شامل ہوتی ہے۔ اگرچہ قائداعظمؒ طبعی موت مرے لیکن فی الحقیقت ہم سے ان کی جلد جدائی کا سبب ان کی سخت محنت تھی۔ ڈاکٹروں نے انہیں سختی سے زیادہ کام کرنے سے روکا مگر انہوں نے کہا کہ ہندو قوم جاگتی ہے۔ اس لئے گاندھی اور نہرو آرام بھی کرلیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر میری قوم سوئی ہوئی ہے میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی آرام کیا تو میری قوم بہت پیچھے رہ جائے گی۔ اس لئے مجھے شب و روز محنت کرنا ہے اور قوم کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹنا ہے۔ ہر وقت کام کام اور بس کام ہی کو آپ نے اصول زندگی بنا رکھا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنی صحت بھی گنوالی۔ اسی طرح دوسرے اکابرین قوم نے بھی بہت سی قربانیاں دیں۔ جب پاکستان بنا تو اس میں لاکھوں بے گناہوں کا خون بھی شامل ہوگیا۔ ہزارہا بچے یتیم ہوگئے۔ بے شمار عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ ہزاروں مائیں اپنے بیٹوں کے غم میں بے نور ہوگئیں اور بے شمار بہنوں نے اپنے بھائیوں کو سامنے قتل ہوتے دیکھا۔ بے شمار عورتوں نے اپنی عصمت بچانے کے لئے اپنے آپ کو موت کے سپرد کرنے پر ترجیح دی۔ پاکستان بہت ہی قربانیوں اور لاکھوں دکھ جھیلنے کے بعد حاصل ہوا ہے۔ قوم کو اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ پاکستان کی قدر ان لوگوں کو ہے جن کا خون تعمیر پاکستان میں کام آیا۔

جب یوم پاکستان منایا جاتا ہے تو ہمارے دلوں میں ان قربانیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ہم تصور کی وادیوں میں دور دراز تک نکل جاتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے

لے کر ۱۹۴۷ء تک کے تمام واقعات ہماری نگاہوں میں فلم کی طرح گھوم جاتے ہیں اور فکر وخیال کا دھارا پاکستان تک آ کے رک جاتا ہے اور یہاں سے ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کے لئے نئے ولولے، نئے حوصلے اور نئی امنگوں کی ضرورت ہے۔

ایسی تقریبات قوموں کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ قوموں کی ترقی کی دوڑ میں یہ مواقع اور یہ تقاریب ایک ہلکا سا ٹھہراؤ ہوتی ہیں جہاں قومیں ایک لمحہ کے لئے رکتی ہیں اور ماضی کی جدوجہد کا جائزہ لیتی، نئے عزم کا اعادہ کرتی ہیں اور آئندہ بھی کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرنے کا عہد کرتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر تاریخ کو یاد کیا جاتا ہے۔ اسلاف کی معین کردہ راہوں پر چلنے کے عزائم میں نئی روح پھونکی جاتی ہے۔ ایسی تقاریب قوموں کو ایک ولولہ، ایک زندگی، ایک جوش، ایک عزم، ایک جذبہ دے جاتی ہیں جن کے سامنے تاریخ کے ایوان سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ پہاڑ رائی بن جاتے ہیں۔ سمندر راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ آندھیاں رخ بدل لیتی ہیں اور دشمن غبار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ یوم پاکستان محض ایک رسم بن کر نہ رہ جائے کیونکہ جب کوئی چیز رسم بن جاتی ہے تو اس کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی دھڑکنیں خاموش ہو جاتی ہیں اور ولولے ساکت ہو جاتے ہیں۔ قوموں کی زندگی دل زندہ سے عبارت ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ یوم پاکستان مناتے ہوئے جلوس بھی نکالیں، نعرے بھی لگائیں اور جلسے بھی منعقد کریں کیونکہ قوموں کے ولولوں کے

لئے یہ جلوس اور جلسے بھی ضروری ہیں۔ مگر ہمیں اس موقع پر سوچنا چاہیے کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ ہمیں اپنے عمل کی راہیں متعین کرنا چاہئیں اور عہد کرنا چاہیے کہ ہمارے کسی فعل، کسی حرکت اور کسی بات سے وطن کی عزت پر آنچ نہ آئے۔ ہمیں چاہیے کہ متحد ہو جائیں اور ذاتی اغراض کو قومی اغراض پر قربان کر دیں۔ ہمارے اتحاد سے دشمنوں کے تمام ناپاک ارادے خود بخود ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ خدا کرے کہ ہماری نگاہوں میں نگاہ مرد مومن کی کیفیت آ جائے۔ ہمارے دلوں میں یقین سما جائے۔ ہمارے قدموں میں استقامت اور حوصلوں میں جرات آ جائے۔ ہمارے دل نور ایمان سے منور ہو جائیں اور ہم ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیں جن پر تاریخ کو فخر ہو۔ یوم پاکستان بھی اسی جذبہ اور اسی مقصد کے لئے منایا جاتا ہے تاکہ ہم آئندہ نسل کے لئے ایسے عمل چھوڑ جائیں جن سے وہ اپنے دلوں کو گرماتے رہیں۔

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا ؟

مشکلے نیست کہ آساں نشود
مرد باید کہ ہراساں نشود

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مشکل ایسی نہیں کہ آسان نہ ہو سکے۔ انسان کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ گویا انسان گھبرانے کی بجائے صبر اور ہمت سے کام لے تو ہر مشکل آسان ہو سکتی ہے۔

چنانچہ انسان کو ہمت، تحمل اور بردباری اور پختہ ارادے سے ہر کام سرانجام دینا اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سعی کرنی چاہیے اور اس میں جو دشواریاں اور مشکلات آئیں انہیں برداشت کر کے اور ثابت قدم رہ کر کامرانی و کامیابی سے ہمکنار ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمت مشکل سے مشکل کام کو بھی آسان بنا دیتی ہے۔ ہمت خداداد نعمت و صلاحیت ہے۔ اس صلاحیت سے ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے نوازا ہے۔ اگر کوئی اس صلاحیت سے کام لیتا ہے اور اس سے فائدہ بھی اٹھاتا ہے تو یہ اس میں زیادہ سے زیادہ بڑھتی رہتی ہے۔ جو اس صلاحیت کو استعمال نہیں کرتے وہ اس صلاحیت سے محروم ہو کر سست کاہل اور نکمے ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جتنی صلاحیتیں بخشی ہیں ان کو نکھارا بھی جا سکتا ہے اور انہیں فروغ بھی دیا جا سکتا ہے۔ ان کو فروغ عطا کرنے سے یہ مفید تر ثابت ہوتی ہیں اور اگر ان کو دبا دیا جائے تو یہ صلاحیتیں ختم بھی ہو جاتی ہیں۔

دنیا کی تمام تر ترقی، ایجادات، تحقیق و تجسس، سائنس کے کارنامے اور بے شمار

اشیا مثلاً انجن ریل گاڑیاں، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون، ایٹمی توانائی وغیرہ انسان کا چاند تک پہنچنا، انسان کی ہوا، آگ اور پانی پر حکمرانی یہ سب ہمت کے ہی کرشمے ہیں۔ ہمت کے بل بوتے پر انسان نام پیدا کرسکتا ہے۔ علم حاصل کرسکتا ہے۔ مٹی سے سونا پیدا کرسکتا ہے۔ گمنامی کی تاریکیوں سے نکل کر شہرت و دولت حاصل کرسکتا ہے۔ کسی شخص نے بھی آج تک ہمت اور محنت کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کی۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا، تب نگیں ہوا

بڑے بڑے رہنما، ڈاکٹر، سائنسدان، سیاستدان، موجد و مہن جو انجینئر اور ماہرین فن یہ سب لوگ ہمت، محنت، استقلال اور بردباری سے ہی کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے ارادے مصمم تھے۔ انہوں نے مشکلات و مصائب کا حوصلہ سے مقابلہ کیا۔ اپنے نصب العین کی طرف ثابت قدمی سے بڑھتے رہے اور جب کبھی ان کے راستے میں کوئی مشکل مقام آیا تو اس کا مقابلہ پامردی سے کیا۔ سعی و کوشش کو اور بھی تیز کر دیا۔ حوصلہ اور ہمت سے پہاڑوں، سمندروں، صحراؤں اور دشت و بیاباں کو روندتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ ہمت اور محنت کے مقابلے میں کوئی کام نہ مشکل ہے اور نہ ناممکن۔ مشکل کام وہ ہے جس میں ارادہ کی پختگی اور ہمت درکار ہوتی ہے۔ اور ناممکن کام وہ ہے جسے کرنے کی انسان میں اہلیت ہی نہ ہو۔ جس کام کو سرانجام دینے کی اللہ تعالیٰ نے انسان کو صلاحیت دی

ہوئی ہے وہ کام انسان کے لئے ناممکن نہیں۔ وہ کام جو صرف خدا ہی کر سکتا ہے انسان کے لئے ناممکن ہے۔ چاند سورج، زمین و آسمان، کوہسار و ریگزار، ہوا، پانی، آگ کو تسخیر کر لینا، انسان کے لئے ممکن ہے۔ ان میں سے تو انسان کے لئے کوئی بھی چیز ناممکن نہیں ہے۔ صرف ہمت، محنت، لگن، استقلال اور عزم صمیم کی ضرورت ہے۔

ہمت کے آگے نہ سمندر رکاوٹ بن سکتا ہے، نہ پہاڑ پائے ہمت میں لغزش پیدا کر سکتے ہیں۔ نہ دشت و صحرا راستہ روک سکتے ہیں۔ تاریخ ایسے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ طارق بن زیاد کا مشہور واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ جنگ بدر میں مجاہدین اسلام نے عزم و ہمت کا عملی ثبوت دیا۔ اندلس کی سرزمین مسلمانوں کی ہمت و عظمت کی گواہ ہے۔ ابھی کل ہی کا واقعہ ہے کہ ہمارے عظیم راہنما قائداعظمؒ نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان معرض وجود میں آ جائے گا۔ ایک طرف انگریز کی طاقت تھی، ہندوؤں کا تعصب، مکاری چالبازی اور تھی اور ستم بالائے ستم اپنوں میں سے بھی بیگانے بنے ہوئے تھے۔ قائداعظمؒ نے ہمت سے کام لیا اور ثابت قدم رہے۔ انہوں نے شجاعت و بردباری سے تمام دشمنوں کا مقابلہ کیا اور مضبوط چٹان کی طرح ان کے مقابل ڈٹے رہے۔ بالآخر خدا نے انہیں کامیابی دی۔ اسی طرح سے دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں کی سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمت، محنت و استقلال ہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔

قائداعظمؒ کا قول ہے کہ کسی کام کو کرنے سے پہلے سو بار سوچو کہ کیا یہ کام ٹھیک ہے۔ اور کیا ایسا کرنا چاہیے۔ جب تمہارا ذہن فیصلہ دے دے کہ ہاں ایسا کرنا درست ہے اس میں کوئی برائی نہیں تو اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا مصمم ارادہ کرلو اور دم اس وقت لو جب اسے پورا کرلو۔ اس بات سے نہ گھبراؤ کہ راستے میں مشکلات آئیں گی۔ رکاوٹیں ہوں گی۔ دشمنوں کی مخالفت ہو گی۔ اپنی منزل کی طرف نگاہ کر کے آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ انشاء اللہ کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔

انسانی ہمت اور اس کے نتائج کی بات کرتے ہوئے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

علامہ نے اس شعر کے ذریعے یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ عمل ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکتا ہے اور عمل ہی سے اسے پر آشوب بھی بنا سکتا ہے۔ اب یہ اس کی اپنی مرضی ہے کہ جس طرح کا عمل اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اسے تفکر کی صلاحیت بخشی ہے۔ سعی و کوشش کی خوبی سے نوازا ہے۔ ترقی کے زینے طے کرنے کے لئے انسان کو اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی قدرتوں اور قوتوں سے مالا مال کیا ہے۔ اس نے اگر انسان کو اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے تو اسے وہ تمام اوصاف بھی دے کر بھیجا ہے جن سے وہ ترقی کے تمام مراحل طے کر سکے اور خیر و شر میں تمیز کر سکے۔ خدا نے اسے ہمت دی، استقلال دیا، بردباری دی، عقل سلیم دی، عرفان دیا اور اسی طرح سے بہت سے اوصاف دیئے اور اختیار بھی دیا کہ وہ اپنے لئے جو راستہ مناسب سمجھے منتخب کر سکتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی خوشحال ہے کوئی مفلس ہے۔ جو مفلس ہے اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی دشمنی نہیں کہ وہ دولت سے محروم ہے۔ وہ ناانصاف نہیں ہے۔ وہ تو خود کہتا ہے کہ ''انسان کے لئے کچھ نہیں ہے۔ سوائے اس کے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔'' جس نے عمل کیا، کوشش کی، ترقی کی راہ اختیار کی اسے ترقی

ملی۔ جوئندہ یابندہ۔ جس نے جس چیز کی تلاش کی اس کو مل گئی۔ کامیاب لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے۔ انہوں نے بے حساب جدوجہد کی۔ وہ شب و روز محنت کرتے رہے اور عمل پیہم کے ذریعے کہاں تک پہنچ گئے اور جو لوگ نان شبینہ کے بھی محتاج ہیں اس کا سبب ان کی کم ہمتی اور بے عملی ہے۔ تدبیر کو چھوڑ کر تقدیر پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنے اور خود کچھ نہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ساری عمر ہی روتے رہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ کبھی کبھی کوشش کے باوجود انسان ناکام ہو جاتا ہے مگر جب ہم اپنی سوچ اور اپنے عمل کا بغور جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ فلاں فلاں غلطیوں کی وجہ سے ہمیں ناکامی ہوئی ہے۔ ایک حوصلہ مند اور باہمت انسان اپنی قسمت آپ بناتا ہے۔ کش مکش حیات میں انسان کو با تدبیر عمل اور صحیح سمت میں سعی سے کامیابی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ محنت، لگن اور دیانتداری سے فرائض زندگی ادا کرتے ہیں ان کا انجام ہمیشہ بخیر ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو اگر خدانخواستہ کسی وقت اپنی متوقع منزل نہیں ملتی تو بجائے اس کے کہ اپنی تقدیر کا گلہ کریں وہ اپنی ہمت کو بلند تر رکھتے ہیں اور پہلے سے بھی زیادہ عزم کے ساتھ مصروف عمل ہو جاتے ہیں اور اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا محاسبہ کرتے ہیں۔ وہ تقدیر کو نہیں کوستے۔ تدبیر کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ حوصلہ استقامت پامردی اور عمل پیہم سے کام لیتے ہیں۔ بہادر اور باہمت انسان اپنی بگڑی ہوئی قسمت تدبیر و عمل سے سنوارتے ہیں۔

جو لوگ بے ہمتی، کاہلی، تلون مزاجی اور بزدلی کی وجہ سے ناکام رہتے ہیں۔

اپنی تقدیر کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ خدا نے اپنی تقدیر میں یہی لکھا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تقدیر کے مطلب کو یہ سمجھتے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فلاں وقت میں یہ کام ہوگا۔ فلاں آدمی فلاں وقت میں یہ کام کرے گا۔ جو کچھ انسان کے متعلق آنے والے حالات اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ پر لکھے ہوئے ہیں وہ تقدیر ہے۔ تقدیر کا مطلب یہ نہیں کہ کسی کو کسی کام کے کرنے کے لے پابند کر دیا گیا ہے یا کسی سے بحکم خداوندی اس کی دولت یا خوشی چھین لی گئی ہے۔ لوح پر آنے والے حالات کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ جس طرح آنے والے وقت کی ڈائری لکھ دی گئی ہو۔ مگر وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہماری ناکامی ہماری تقدیر کے سبب ہوئی ہے بالکل غلط ہے۔ انسان نے آنے والے وقت میں جو اچھے یا برے اعمال سرانجام دینے ہیں ان کو خدا تعالیٰ نے قلمبند کر دیا ہے۔ پست ہمت لوگ سمجھتے ہیں کہ وہی ہوگا جو تقدیر میں ہوگا ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔

اگر ہم بڑے آدمیوں کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ انہوں نے کیا اپنے عزم و استقلال سے کیا۔ ہمت و جوانمردی سے کیا۔ تدبیر و عمل سے کیا۔ انہوں نے عزت، شہرت، شان و شوکت، سب جہد مسلسل اور عمل پیہم سے حاصل کیا۔ اپنی زندگی میں انہیں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا تو انہوں نے پامردی سے کیا۔ ہمت و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اپنے ارادے کو چٹان کی طرح مضبوط رکھا۔ ایک لمحہ کے لئے بھی وہ اپنے مقصد سے غافل نہیں

ہوتے تھے۔ یوں ہی فضول گفتار میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ گفتار کے غازی تھے تو ساتھ ساتھ کردار کے بھی غازی تھے۔ ان کی کامیابی عظمت و شہرت کا انحصار عمل پر تھا۔ ان کی زندگیاں ہمیں دعوت عمل دیتی ہیں۔ انسان کی زندگی اس کے اپنے اعمال و کردار سے بنتی ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

www.iqbalcyberlibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006

قومی زندگی میں نظم وضبط کی اہمیت

لفظ ''نظم'' یا ''ضبط'' اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ ہر کہیں اس کی موجودگی محسوس ہوتی ہے۔ جہاں پر نظم نہیں ہے وہاں پر افراتفری اور غلط نتائج ہی نظر آئیں گے۔ دنیا کا ہر کام کسی نہ کسی ضابطے یا قاعدے کے تحت ہوتا ہے۔ یہ زمین وآسمان، یہ چاند ستارے اور سورج کسی نظام کے تحت کام کر رہے ہیں۔ یہ سب کسی قاعدے یا قانون کے تابع رہ کر چل رہے ہیں۔ سورج کی گرمی، اس کی چمک، چاند کی دمک، لیل ونہار کا گھٹنا، بڑھنا، موسموں کا تغیر وتبدل یہ سب کچھ ایک قانون کے ماتحت ہو رہا ہے۔ سورج کا نکلنا، اس کا غروب ہونا، زمین کا گھومنا اور رات دن کا پیدا ہونا ان سب کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ ان میں سے کوئی بھی عمل اپنے وقت مقررہ سے ایک سیکنڈ بھی ادھر ادھر نہیں ہوسکتا۔ یہ سب کسی قانون کی بدولت ہے۔ حیوانات، نباتات اور جمادات بھی ایک مخصوص قاعدے کے تابع ہیں۔ غرض کائنات کی ہر چیز کے لئے کوئی قاعدہ مقرر ہے اور وہ اس قاعدے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ ندی نالے، دریا، سمندر بھی ایک خاص ضابطے کے تحت بہتے ہیں۔ پھلدار اور پھولدار درخت بھی کسی قانون میں جکڑے ہوئے ہی پیدا ہوتے ہیں اور اسی طرح سے ختم ہوتے ہیں۔ کوئی چیز کوئی انسان قانون اور ضابطے سے باہر نہیں ہوسکتا۔ انسان کے جسم میں جو اعضاء بنائے گئے ہیں وہ سارے کے سارے اپنا اپنا کام ایک مخصوص ضابطے یا قانون کے تحت کرتے ہیں۔ دماغ کے لئے ایک ضابطہ مقرر ہے۔ وہ اس کے تحت کام کر رہا ہے۔ دل

کے لئے بھی جو کام مقرر کیا گیا ہے وہ وہی کرتا ہے۔ پھیپھڑے، معدہ، جگر اور اسی طرح سے جسم کے دوسرے اعضاء بھی اپنے مقررہ قاعدے کے تحت ہی کام کرتے رہتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قانون اور ضابطہ ایک ایسی چیز ہے جس سے کوئی چیز باہر نہیں۔

انسان کی بقاء و ارتقاء کے لئے مخصوص ضابطوں کی پابندی لازمی ہے۔ اسلام اپنے اندر ایک مکمل ضابطہ حیات رکھتا ہے۔ نبی کریم بھی اسی ضابطہ حیات کی تبلیغ و ہدایت کے لئے تشریف لائے۔ آپؐ نے عملی طور پر ثابت کیا کہ انہوں نے جو نظام زندگی دنیا کو دیا اسی میں دکھی انسانیت کا مداوا ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات پیش کرتا ہے، جس پر عمل کر کے اس قانون کے تحت زندگی بسر کر سکتے ہیں جو ہمیں راہ نجات دکھا سکتی ہے اور ہمارے لئے دین و دنیا میں فلاح کا سبب بن سکتی ہے۔

معاشرے میں رہتے ہوئے ہم پر دو قسم کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ایک انفرادی ہے اور دوسری اجتماعی، ہمارا ہر فعل معاشرہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر ہم کوئی برائی کرتے ہیں تو اس کے اثرات دوسروں پر ضرور مرتب ہوں گے اور اگر ہم کوئی اصلاحی کام کرتے ہیں تو اس کا اثر بھی دوسروں پر ہوگا۔ کوئی قول یا فعل انفرادی طور پر کیا جائے یا اجتماعی طور پر اس کے نتائج معاشرے پر ضرور ظہور پذیر ہوں گے۔ تو ایسے میں ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم دوسروں کے جذبات و احساسات کا احترام کریں اور ہمارا ہر قول و فعل سوسائٹی کے لئے مفید ثابت ہو۔ اگر ہم

معاشرے میں رہتے ہوئے کسی قانون اور ضابطہ کا خیال نہیں کرتے تو اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ ایک ٹیم ہی کو لے لیجئے۔ ٹیم کے کھلاڑی اگر اپنے کپتان کے حکم کے تابع نہیں ہیں اور کھیلتے ہوئے پورے نظم وضبط سے کام نہیں لیتے تو ٹیم کی شکست یقینی ہوگی۔ اس می کھلاڑیوں کا بھی نقصان ہوگا اور شکست قوم و ملک کے لئے بدنامی کا باعث ہوگی۔ قوموں کی بقاء اور ارتقاء کے لئے نظم وضبط کا ہونا نہایت لازمی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے لوگوں کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا جو نظم وضبط کو اپنا شعار نہیں بناتے۔

بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ نے بھی اسی لئے قوم کو اتحاد، یقین اور تنظیم کا عظیم سبق دیا ہے۔ جس قوم میں نظم وضبط نہیں ہوتا وہ ملت جلد صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ اسلام کا عروج بھی قومی نظم وضبط، اتحاد و تنظیم کے طفیل ہوا۔ قومی اتحاد، یقین اور تنظیم کی بدولت مسلمان تھوڑی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی بڑی بڑی سلطنتوں کو فتح کرتے چلے گئے۔ یہ اتحاد اور نظم وضبط کا ہی کرشمہ تھا کہ عرب قوم جو جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی تمام اقوام عالم سے آگے نکل گئی۔

معاشرے کے استحکام، قوموں کی آزادی اور سلطنتوں کی ترقی کے لئے نظم و ضبط نہایت ضروری ہے۔ بڑے بڑے سیاستدان اس پر متفق ہیں کہ نظم ریاست کے عناصر خمسہ میں شمار ہوتا ہے۔ جہاں پر نظم وضبط اور یک جہتی کا فقدان ہوگا اور بے ضابطگیوں کا راج ہوگا وہاں ذلالت، غلامی اور زوال قوم کا مقدر ہوگا۔

اگر ہمیں اپنے آپ سے محبت ہے اور اپنے معاشرے اور وطن سے پیار ہے

اور ہم واقعی اپنی قوم سے مخلص ہیں اور اسے دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی صف میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا چاہیے اور اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر مقام پر ہر وقت اتحاد اور نظم وضبط کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے افکار و افعال میں نظم وضبط کے اصول کو کبھی فراموش نہ کریں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ہر کہ خدمت کرد اومخدوم شد

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

خدمت خلق ہی ایک ایسا فعل ہے جس سے انسان کی عظمت کا صحیح طور پر پتا چلتا ہے۔ کسی انسان کی عظمت کا اندازہ کرن کے لئے نہ صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے اندر کس قدر جوہر پوشیدہ ہیں اور وہ کن اعلیٰ اوصاف کا مالک ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی اسے پرکھنا ہوگا کہ اس کے دل میں خلق خدا کے لئے کس قدر درد موجود ہے۔ خلاق عالم نے انسان کے ذمے دو فرائض لگائے ایک اس مالک کل کی اطاعت دوسرے اس کے بندوں سے پیار۔ یعنی ایک حقوق اللہ اور دوسرا حقوق العباد۔ حقوق اللہ میں اگر کوئی کوتاہی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے وہ معاف کر سکتا ہے لیکن اگر حقوق العباد کا جرم سرزد ہو جائے تو اسے وہ معاف نہیں کرے گا۔ حالانکہ وہ قادر مطلق ہے مگر اس مقام پر اس نے معاف کرنے کا حق صرف اور صرف اسی کو دیا ہے جس کا حق مارا گیا ہو یا جس کا حق ادا نہ کیا گیا ہو۔ خلق خدا کی خدمت، ان سے ہمدردی اور پیار حقوق العباد میں سرفہرست ہیں۔

خدمت خلق کی عظمت کو ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ فرض کریں آپ کسی شخص سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی عزت و احترام کرتے ہیں، اس کے ہر حکم کی تعمیل بعجلت کرتے ہیں۔ ہر مجلس میں اس کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ مگر اس کی اولاد سے جو اس کو بہت ہی عزیز ہے آپ کو کوئی لگاؤ نہیں۔ کوئی پیار نہیں، کوئی

ہمدردی نہیں۔ان کے لئے آپ کوئی ایثار بھی نہیں کرتے تو سوچ کر بتائیے کہ کیا وہ شخص جس سے آپ پیار کرتے ہیں آپ کو اچھا سمجھے گا۔جواب یقیناً نفی میں ہو گا۔اسی طرح سے خداوند عالم کو اپنی مخلوق بہت پیاری ہے۔الخلق عیال اللہ تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔اگر ہم محض خدا سے ہی پیار کرتے ہیں اور اس کے بندوں سے پیار ہمدردی نہیں کرتے۔ان کے لئے جذبہ ایثار نہیں رکھتے تو خدا کبھی خوش نہیں ہوسکتا۔

ایک بزرگ کے پاس ایک شخص آیا۔انہوں نے اس کا حال واحوال پوچھا تو کہنے لگا کہ بس ٹھیک ہے۔کما لیتے ہیں اور کھا لیتے ہیں۔کہنے لگے پھر تو تم کچھ بھی نہیں کماتے۔دوسرا شخص آیا اس سے بھی پوچھا تو کہنے لگا کہ اللہ کا کرم ہے کما لیتے ہیں خود کھا لیتے ہیں اور جو بچتا ہے۔دوسروں کو دے دیتے ہیں۔فرمایا تھوڑی کمائی کرتے ہو۔تیسرا شخص آیا اس کی خیریت دریافت کی۔اس نے جواب دیا۔حضرت سارا دن محنت و مشقت کر کے کماتے ہیں اس میں سے لوگوں کو کھلاتے ہیں اور جو کچھ بچتا ہے ہم کھا لیتے ہیں۔فرمایا شاباش خوب کمائی کرتے ہو۔تو اصل نیکی تو یہی ہے کہ انسان دوسروں کے لئے جیئے۔خدا کے بندوں کے لئے جذبہ ایثار و قربانی رکھے۔ورنہ حیوان میں اور انسان میں فرق ہی کیا ہے۔اپنے لئے تو حیوان بھی سب کچھ کرتا ہے۔

اسی طرح سے ابراہیم بن ادھم کا ایک واقعہ ہے۔ایک رات ایک فرشتہ سونے کی کتاب ہاتھ مین لئے ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ادھم نے پوچھا اس کتاب

میں کیا لکھ رہے ہو۔فرشتے نے جواب دیا اس کتاب میں ان لوگوں کے نام لکھ رہا ہوں جو خدا سے محبت کرتے ہیں۔ابراہیم بن ادھم نے دریافت کیا اس کتاب میں میرا نام بھی شامل ہے۔فرشتے نے جواب دیا نہیں۔ادھم نیکہا اچھا تم میرا نام ان لوگوں میں لکھ لو جنہیں خدا کے بندوں سے پیار ہے۔اس کے بعد فرشتہ چلا گیا۔ دوسرے روز فرشتہ پھر آیا پہلے کی طرح کمرہ روشن ہو گیا وہی سونے کی کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔ادھم نے پھر پوچھا کہ اس کتاب میں کیا لکھا ہے۔تو فرشتے نے جواب دیا کہ اس کتاب می ان لوگوں کے نام ہیں جن کو خدا خود پیار کرتا ہے۔ادھم نے دریافت کیا کہ کیا اس میں میرا نام بھی شامل ہے۔فرشتے نے جواب دیا آپ کا نام سرفہرست ہے۔گویا عظمت انسان اس وقت عیاں ہوتی ہے جب اس میں خلق خدا سے محبت وایثار پیدا ہو جائے۔اسی لئے تو علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

تاریخ شاہد ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہ ہر دل عزیز بنا نہ عظیم بنا نہ مخدوم بنا جب تک اس نے خدمت خلق کو اپنا شعار نہ بنایا۔جس نے ملک وقوم کے لئے قربانی نہ دی،جس نے خدا کے بندوں سے پیار نہیں کیا چاہے وہ کتنا دولت مند ہو کتنا طاقت ور ہو نہ قرب الٰہی حاصل کر سکا اور نہ دنیا میں ہی عزت حاصل کر سکا۔ سر سید احمد خاں کی طرف دیکھئے۔ان کے دل میں قوم کا کس قدر درد تھا۔قوم کے لئے محنت کی۔علامہ اقبال کی مثال لیجئے وہ ساری عمر قوم کے لئے تڑپتے رہے۔وہ

قوم کے لئے بالخصوص اور ساری دنیا کے لئے بالعموم مشعل راہ بنے رہے۔ بابائے قوم محمد علی جناح نے یونہی قائداعظم نہیں کہلوالیا انہوں نے قوم کے لئے تن من دھن کی قربانی دی۔ ایسے لوگ مر کر بھی زندہ جاوید رہتے ہیں۔ لوگ جب بھی ان کا نام لیتے ہیں بڑے ادب و احترام سے لیتے ہیں اور ان کی مغفرت کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ تاریخ میں ہمیشہ ایسے لوگوں کے نام سنہری حروف میں لکھے جاتے ہیں۔

حقیقت میں انسان کو دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ خدا کے بندوں کی خدمت کرے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہو۔ ان کی غم گساری کرے۔ اگر ان کو راحت پہنچانے کے لئے ایثار بھی کرنا پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے۔ اگر تخلیق انسان کا مقصد صرف خدا کی عبادت ہی ہوتا تو اس کے لئے تو فرشتے ہی کافی ہیں جو رات دن اس کی تسبیح کرتے ہیں۔

درد دل کے واسطے پیدا کی انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

پاکستان کا نظام تعلیم

علم افراد کی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جس طریقے سے لوگوں کو زیور علم سے آراستہ کیا جاتا ہے اسے نظام تعلیم کہا جاتا ہے۔ اصل میں نظام تعلیم ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے عوام میں وہ شعور پیدا کیا جاتا ہے جو زندگی گزارنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اپنی پیدائش کے بعد جب انسان بچہ ہی ہوتا ہے تو اس کی تمام صلاحیتیں ناپختہ ہوتی ہیں۔ ان صلاحیتوں میں پختگی پیدا کرنے کے لئے صحیح تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ اگر تعلیم و تربیت اچھی ہوگی تو وہ ایک اچھا انسان بن سکے گا اور اگر تعلیم و تربیت ہی ناقص ہوگی تو اس میں وہ صلاحیتیں پیدا نہیں ہوسکیں گی جو ملک و معاشرہ اور خلق خدا کے لئے کارآمد ثابت ہوں۔ تعلیم و تربیت کی برکت ہی سے انسان ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ قومیں اپنے نظام تعلیم پر سب سے زیادہ توجہ دیتی ہیں۔ قومیں افراد سے بنتی ہیں۔ اگر افراد کو صحیح تربیت ملے گی تو قوم کا ذہن بھی خود بخود صیقل ہو جائے گا۔

کسی قوم کی ترقی و بقاء کے لئے نیز اس کی ذہنی نشوونما کے لئے نئی نسل کی صحیح تربیت کی اشد ضرورت ہے۔ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار اس کی نئی نسل پر ہی ہوتا ہے۔ اگر نئی نسل صحیح راستے پر گامزن ہوگی تو نتیجتاً وہ ایک ترقی یافتہ قوم بنے گی اور اگر ان کی تعلیم و تربیت بیکار قسم کی ہوگی تو وہ قوم پستی کے گہرے گڑھے میں گر جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنی نئی نسل کی تربیت اس طرح کرتی ہے جس سے ان

کے عزائم بلند ہوں اور ان کی سیرت اور ان کے کردار نہایت اعلیٰ قسم کے ہوں۔ نظام تعلیم اس قسم کا ہونا چاہیے جس سے نئی نسل آئندہ کی ارجع قوم بن سکے۔

ہم مسلمان ہیں اور ایک آزاد مملکت کے شہری ہیں۔ ہم نے پاکستان اسلام کی سربلندی ثابت کرنے کے لئے بنایا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ہمارا اولین فریضہ تھا کہ ہم نوجوانان قوم کی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے قوم کو ایسا نظام تعلیم و تربیت دیتے جس سے اقوام عالم میں ہم فخر سے سر اونچا کر سکتے۔ پاکستان بنانے کا ہمارا مقصد ہی یہی تھا کہ چونکہ ہم مسلمان ہیں اور امن کے داعی ہیں اور ہمارا ضابطہ حیات دنیا کے تمام ضابطوں سے اعلیٰ وارفع ہے اس لئے ہم قوم کے لئے ایسا نظام تعلیم مقرر کریں جس سے ہمارا نظریہ پایہ تکمیل کو پہنچ سکے اور دنیا ہم پر رشک کرے۔

نظام تعلیم اس طرح کا ہونا چاہیے جس سے قوم میں صلاحیتیں اور بلند کردار کی صفات پیدا ہوں جو ایک آزاد قوم کے لئے ضروری ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ نئی نسل کو پاکستان کے بنیادی تصورات سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی روایات کو زندہ رکھ سکے۔ قوم کے افراد منشاء پاکستان کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اس قابل بن سکیں کہ وہ مقاصد پاکستان کی تکمیل پوری صلاحیت سے پورے کر سکیں۔ اس وقت جو نظام تعلیم چل رہا ہے وہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے بالکل ناموزوں ہے۔ یہ نظام تعلیم انگریز کا مقرر کردہ ہے جس کا مقصد اصل میں یہاں کے لوگوں کو ایک آزاد منش اور حریت پسند شہری بنانے کا نہیں تھا بلکہ اس نے تو تعلیم کو صرف اس لئے یہاں رواج دیا تھا کہ انہیں اپنی مرضی کے پڑھے لکھے

لوگ میسر آ سکیں جو ان کی ہاں میں ہاں ملائیں اور بوقت ضرورت انہیں اپنا آلہ کار بنا سکیں۔ آج تک ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے اور اب بھی ہمارا نظام تعلیم انہیں خطوط پر چل رہا ہے۔ انگریزوں نے اپنے ملک انگلستان میں جو نظام تعلیم مقرر کیا ہوا تھا وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔

ہمارا نظام تعلیم اس قسم کا ہونا چاہیے جس کے تحت تربیت پا کر ہم میں فکر و نظر اور تحقیق و تجسس کا شعور پیدا ہو جو ہماری صلاحیتوں کو اس قابل بنا دے کہ ہم کسی دوسرے کے محتاج نہ ہوں۔ ہماری ذہنی اور فکری تربیت ہمارے اسلامی نظام حیات کے عین مطابق ہو جس میں ہم اجتماعی مفادات کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ ہمارا نصب العین بلند ہو۔ ہم میں ہمدردی، ایثار اور جذبہ خدمت پیدا ہو۔ ہم ہر میدان میں ترقی کریں اور ہم میں بڑے بڑے عالم فاضل، مجتہد، مفسر اور فقیہہ پیدا ہوں ماہرین معاشیات و طبیعات اور قابل انجینئر اور ڈاکٹر پیدا ہوں۔ جو ہمہ وقت اس جذبہ سے کام کریں کہ ہم نے ملک و قوم کی خدمت کرنا ہے اور ہمیں اپنے ملک کو اس قابل بنانا ہے کہ ہمیں کسی دوسرے ملک کی احتیاج نہ رہے اور ہم میں زندہ قوموں کی صفات پیدا ہوں۔ ایسا ہی نظام تعلیم ہماری قومی و ملی زندگی کی بقاء اور ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے اور یہی ہماری ملی امنگوں اور قومی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا نظام ہمارے لئے نہ مفید ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس مقصد کو پورا کر سکتا ہے۔ جس کے لئے قربانیاں دے کر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔

علم بڑی دولت ہے

علم ایسا بیش بہا خزانہ ہے جسے نہ تو چور چرا سکتا ہے اور نہ ہی وہ استعمال کرنے سے کم ہوتا ہے۔ حضور رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ مہد سے لحد تک علم کی تلاش میں لگے رہو اور یہ بھی فرمایا کہ علم حاصل کرو، خواہ اس کے لئے تمہیں چین کیوں نہ جانا پڑے۔ یہ حقیقت ہے کہ علم ایک ایسی قوت ہے جو دنیا کی تمام قوتوں سے بڑھ کر ہے۔ اس کو زوال نہیں۔

علم ہی کی بدولت انسان نے قدرت کے سربستہ رازوں کو کھولا اور ان پر پڑے ہوئے تمام پردے اٹھا دیئے۔ علم کے ذریعے ہی مختلف قسم کی ایجادات کی گئیں۔ علم کی بدولت ہی انسان ہوا پر سوار ہو جاتا ہے، سمندروں کو چیرتا ہے اور پل بنا کر دریاؤں کو عبور کرتا ہے۔ علم ہی سے انسان نے ہزاروں میل کے فاصلے پر قابو پا لیا ہے۔ علم ہی کی بدولت آج دنیا کی تمام وسعتیں انسان کے سامنے سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ یہ اسی علم کا کرشمہ ہے کہ آج انسان خلا کی وسعتوں پر حاوی ہے اور وہی مظاہر قدرت جن کو کبھی وہ دیوتا سمجھ کر پوجتا تھا آج اس کی خاک راہ ہیں۔ علم ہی کی بدولت آج انسان چاند تک رسائی حاصل کر چکا ہے اور گھر بیٹھے دوسرے ممالک کے حالات سنتا اور دیکھتا ہے۔

یہ علم ہی کی شان ہے کہ انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ سرسید احمد خاں، علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ جیسے عظیم رہنماؤں نے علم کے ذریعے ہی قوم کی سچی خدمت کی اور آج ان کے نام زندہ جاوید ہیں۔ بزرگان دین بھی علم کی شمع جلا

کرلوگوں کو ہدایت کی راہ دکھاتے رہے اور آج ان کے نام زندہ ہیں اور بے علم تو خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔

انسان نے علم کی بدولت اپنے لئے آسائش و آرائش کے سینکڑوں سامان پیدا کئے ہیں۔اس نے ایسی ایسی شاندار عمارتیں تعمیر کی ہیں جو آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔اس نے موٹر کار، ہوائی جہاز، جیٹ طیارے اور راکٹ تک تیار کر لئے ہیں۔ ٹیلیفون اور ریڈیو سے وائرلیس اور ٹیلی ویژن تک، ٹائپ رائٹر سے لے کر چھاپہ خانے اور ٹیلی پرنٹر تک خوردبین اور دوربین سے لے کر رصد گاہوں تک کے وسیع نظام تک ایجادات اور اکتشافات کا ایسا لامتناہی سلسلہ ہے جو علم کی بدولت ہی وجود میں آیا ہے۔

دنیا کی ترقی کا دارومدار علم پر ہے۔علم ہی انسان کو انسان بناتا ہے اور نیکی بدی میں تمیز کرنا سکھاتا۔علم ہی سے انسان دوسرے انسان پر سبقت حاصل کر سکتا ہے۔ وہی انسان جو کبھی بجلی کی گرج سے ڈر جاتا تھا آج بجلی کو اس طرح قابو کر چکا ہے کہ وہ اس کی تابع فرمان ہو چکی ہے اور وہ جو کام چاہے اس سے لے سکتا ہے اور جس وقت جہاں چاہے لے سکتا ہے۔تمام کارخانے، ریل گاڑیاں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسری ایجادات میں بجلی استعمال کی جا رہی ہے۔علم کی ہی بدولت انسان اپنی تفریح کا سامان بھی پیدا کرتا ہے اور اس نے اپنے لئے قسم قسم کی سہولتیں پیدا کر لی ہیں۔علم کی بدولت ہی انسان نے سورج، چاند اور ستاروں کی بناوٹ، ماہیت اور بلندی معلوم کی ہے۔

علم ایسا نور ہے جس سے جہالت اور گمراہی اور تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ علم کی بدولت انسان کی چشم بصیرت روشن ہوتی ہے جس سے وہ نیکی بدی اور حق و باطل کو پہچانتا ہے۔ یہ ایسا بیش بہا جوہر ہے جو عقل کو صیقل کرتا ہے۔ علم سے انسان کے اطوار شائستہ اور اخلاق پاکیزہ بن جاتے ہیں۔ وہ دل و دماغ کو جہالت کے مہیب اندھیرے سے نکال کر اس عالم میں پہنچا دیتے ہیں جہاں حسد و بغض، دشمنی اور عداوت و حرص اور لالچ کا گذر نہیں ہوتا۔

ترقی یافتہ ملکوں نے علم سے ہی ترقی کی ہے۔ امریکہ، روس اور دوسرے ممالک نے بھی علم ہی کی بدولت حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ علم کی بدولت ہی انسان آج خلاء کو مسخر کر رہا ہے۔ انسان نے علم کے ذریعے ہی دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا اور قطب شمالی سے لے کر قطب جنوبی تک زمین کو روندتا چلا گیا۔ علم انسان کو جرات، ہمت، استقلال، تدبر اور بردباری اور ہر قسم کی عقدہ کشائی کی صلاحیت بخشتا ہے۔

علم ہی انسان کو باعزت، سرفراز، باوقار اور عظیم بناتا ہے۔ علم ہی سے انسان اپنے لئے دولت کماتا ہے جس سے وہ اپنی اور دوسروں کی خدمت کر سکتا ہے اور اپنے لئے دنیاوی جاہ و جلال بھی حاصل کر سکتا ہے۔ جتنے بڑے آدمی ہوئے ہیں علم کی بدولت ہی کمال عروج پر پہنچے۔ بڑے بڑے مراتب اور مناصب حاصل کئے۔ سقراط، بقراط، بوعلی سینا، غزالی، فردوسی کتنے بڑے نام ہے۔ ان سب نے علم کی بدولت ہی نام پایا۔ آج بھی ان کا نام بڑے ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔

تعلیم نسواں

ہر مرد و زن کا علم کی دولت سے بہرہ ور ہونا بہت ضروری ہے۔ علم کے بغیر دنیا اندھیر ہے۔ کور نظری سے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ وہی قوم ترقی کرتی ہے جس کے افراد زیور علم سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کسی ملک میں جس قدر علم زیادہ ہوگا اسی قدر وہ ملک ترقی یافتہ ہوگا۔ جو ملک پسماندہ ہیں ان میں علم کا فقدان ہوتا ہے۔ وہاں کے لوگ جاہل، اندھے اور غیر مہذب ہوتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بغیر علم کے انسان خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا اور نہ ہی دنیا کا کوئی کام صحیح انداز سے انجام دیا جا سکتا ہے۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے بھی حصول علم لازمی ہے۔ مرد کے لئے بھی اور عورت کے لئے بھی، علم حاصل کے لئے تاکید ہے چاہے اس کے دور دراز بھی جانا پڑے۔ زیور علم سے آراستہ ہونا اشد ضروری ہے۔ علم اندھیرے میں اجالا کرتا ہے۔ زندگی کی اقدار میں نکھار اور وقار علم سے ہی آ سکتا ہے۔

مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ گاڑی کبھی ایک پہیے سے نہیں چل سکتی۔ اس کے لئے دونوں پہیوں کا ہونا اور صحیح حالت میں ہونا لازمی ہے۔ اگر کسی وجہ سے ایک پہیہ ٹوٹ جائے یا خراب ہو یا سرے سے ہو ہی نہ تو گاڑی کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے۔ اس کا چلنا ممکن نہیں ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ پرندے کے دو بازوؤں میں سے ایک ٹوٹ جائے تو پرندہ اڑنے کے قابل نہیں رہتا۔ یہی حال ہمارے معاشرے کا ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں کی اہمیت یکساں

ہے۔ جب تک دونوں علم سے بہرہ ور نہیں ہوں گے ہم کسی صورت ترقی نہیں کر سکتے۔ ترقی کا زینہ ہمیشہ سے علم ہی رہا ہے۔ اسی کے ذریعے کامیابی اور کامرانی کی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔

قدرت نے جو فرائض عورت کو سونپے ہیں ان میں سب سے اہم فریضہ بچے کی پرورش کا ہے۔ ماں کی گود ہی بچے کی اولین درسگاہ ہوتی ہے وہاں سے جو درس بچے کو ملے گا وہی سیکھے گا۔ اگر ماں تعلیم یافتہ اور سلیقہ شعار ہے تو اولاد بھی صاحب علم اور مہذب ہوگی کیونکہ بچے کا زیادہ وقت ماں کے پاس ہی گزرتا ہے۔ بچے پر ماں کی طبیعت کا پرتو زیادہ ہوتا ہے۔ بچہ ماں کے طور طریقوں اور عادات و اطوار سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ جاہل و ناخواندہ ماں بچے کے اخلاق و عادات نہیں سنوار سکتی لیکن پڑھی لکھی اور سمجھدار ماں اپنے بچے کی تربیت میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اور اس کی نگہداشت صحیح طور پر کر سکتی ہے اور اس کے خیالات و کردار کو نکھار سکتی ہے۔ وہ اس کے دل و دماغ کی اقدار کو صیقل کرتی ہے اور اس میں اخلاق، ہمدردی اور ایثار پیدا کر کے جذبہ حب وطن بیدار کر دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ باپ کا بھی بچے کی پرورش میں بہت حصہ ہوتا ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابتدائی تعلیم ماں کی گود میں ہی ملتی باپ کو تو گھر کی فکر معاش ہی چین نہیں لینے دیتی۔ بڑی بڑی شخصیتوں نے ماں سے ہی تربیت پائی۔ اسی چھوٹے مدرسے سے بچے کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ماں ہی بچے کے منہ میں الفاظ ڈالتی ہے۔ اسے ابتدائی تہذیب وہیں سے ملتی ہے اور یہی تعلیم

بڑے ہو کر اس کی فطرت میں راسخ ہو جاتی ہے۔

فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت مرد سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ عورتیں مردوں سے کم ذہین نہیں ہوتیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ملکہ نور جہاں، وکٹوریہ، چاند بی بی، رضیہ سلطانہ اور دور حاضر کی وزیر اعظم تھیچر اور اندرا گاندھی نے مردوں کے ہم پلہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں اور دے رہی ہیں۔ بلکہ دور جہانگیری میں جب آفتاب خاندان مغلیہ پورے عروج پر تھا تو ملکہ نور جہاں کا ہی ذہن کام کرتا تھا انہوں نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں جنہیں مرد حکمران پایہ تکمیل کو نہ پہنچا سکے۔

جو لوگ عورتوں کو تعلیم دلوانے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ ان کی تعلیم کو صرف ناظرہ قران مجید تک محدود رکھتے ہیں۔ انہیں دیگر علوم نہیں پڑھاتے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ تعلیم یافتہ عورتیں فیشن پرست ہوتی ہیں۔ فضول خرچ ہوتی ہیں اور گھر کے کام کاج نہیں کرتیں۔ گھر کے فرائض صحیح طور پر سرانجام نہیں دیتیں۔ وہ گھر کی زینت بننے کی بجائے نمائش محفل بن جاتی ہیں۔ ہمہ وقت سیر و تفریح کے لئے تیار رہتی ہیں۔ خاوند کے لئے سامان دلجوئی نہیں پیدا کرتیں بلکہ تکلیف و تنازعہ کا سبب بن جاتی ہیں۔ تو اس میں قصور لڑکیوں کا نہیں ہے جن کو ہم تعلیم دیتے ہیں۔ اول تو تعلیم روشن خیال بناتی ہے اور ذمہ داری سکھاتی ہے۔ اس کے برعکس کچھ نہیں سکھاتی۔ جو لوگ بگڑے ہوئے ہیں وہ تعلیم حاصل کئے بغیر ہی بگڑے ہوئے ہیں چاہے وہ مرد ہوں یا عورت۔ دوسرے اس تعلیم کا بھی کچھ قصور ہو سکتا ہے جو ہم

دیتے ہیں۔ جو تعلیم ہم ان کو دیں گے وہ وہی سیکھیں گی۔ یہ قصور اس غلط تربیت اور غیر موزوں نصاب و ماحول کا ہے۔ شروع سے ہی اگر ایسے انتظامات ہوں کہ لڑکیوں کی تربیت صحیح خطوط پر ہو اور انہیں پاکیزہ اور برائیوں سے پاک ماحول ملے تو کوئی وجہ نہیں کہ تعلیم نسواں معاشرے میں کسی بگاڑ کا باعث بنے۔ اچھی تعلیم کے نتائج حوصلہ افزا برآمد ہوں گے۔ لہٰذا جو فطری صلاحیتیں قدرت نے عورت کو دی ہیں ان کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے، اور ان میں مطلوبہ صفات تبھی پیدا ہو سکتی ہیں جب انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔

مخلوط تعلیم

لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے کسی ایک درسگاہ میں تعلیم پاتے ہوں تو اس طریقے کو مخلوط تعلیم کا نام دیا جاتا ہے۔ تعلیم کے متعلق بہت سے مسائل حل طلب پڑے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی ایک ملی مسئلہ ہے جس کو حل کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ ابھی تک ہم تعلیم نسواں کا مسئلہ ہی حل نہیں کر سکے۔ انکے نصاب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک طبقے کا خیال ہے کہ لڑکیوں کو صرف ایسی تعلیم دینا کافی ہے جس سے وہ گھر کی ذمہ داری سنبھال سکیں اور بطور صنف نازک اپنے فرائض گھر کے اندر ہی سرانجام دے سکیں۔ کچھ لوگ مغرب پسند ہیں کچھ مشرق پسند۔ سب کی اپنی اپنی رائے ہے۔

مخلوط تعلیم بھی ایک قومی اور ملی مسئلہ ہے۔ اس کے متعلق بھی مختلف آراء ہیں۔ آزاد خیال لوگوں کا نقطہ نظر ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو اکٹھے تعلیم دینے میں کوئی حرج نہیں بلکہ اس کے بہت سے فائدے ہیں۔ ہمارا ملک ایک غریب ملک ہے الگ الگ درسگاہوں کے اخراجات کا متحمل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مل جل کر آزادانہ تعلیم حاصل کرنے سے منفی جذبات ختم ہو جاتے ہیں اور سکون کے ساتھ حصول تعلیم کا کام جاری رہتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا اچھی طرح سے موقع ملتا ہے۔ ان کی باہمی جھجک بھی دور ہو جاتی ہے۔ آپس میں تبادلہ خیالات سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں اور بہت سے اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں میں بزدلی کے بجائے جرات پیدا ہوتی ہے جو عملی زندگی میں

مفید ثابت ہوتی ہے۔ان میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔مخلوط تعلیم سے ایک اور بھی فائدہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔لڑکیاں کوشش کرتی ہیں کہ ہم لڑکوں سے قابل تر بن کر دکھائیں اور لڑکے یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ اگر لڑکیاں ہم سے آگے نکل گئیں تو ہماری اس میں بے عزتی ہے۔لہٰذا دونوں لڑکے لڑکیاں خوب محنت کرتے ہیں۔اس طرح سے ان کا معیار تعلیم بلند ہو جاتا ہے اور وہ محنت کے عادی ہو جاتے ہیں۔مقابلے کے امتحانات میں آسانی سے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔جن لڑکیوں نے مخلوط تعلیم پائی ہو وہ زیادہ بیبا کی اور جرات سے آدمیوں کے دوش بدوش بغیر کسی جھجک کے کامیابی سے کام کر سکتی ہیں۔جو لوگ مخلوط تعلیم کے حق میں ہیں وہ یہ کہنے میں کسی حد تک اپنے آپ کو درست سمجھتے ہیں کہ فی زمانہ صرف مرد ہی کام کرے تو سارے کنبے کا گزارہ مشکل ہو جاتا ہے اور اگر اس میں عورت بھی شریک ہو تو بہت حد تک بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔زندگی آسانی سے گزرتی ہے۔بچوں کو لائق بنانے کے لئے زر کثیر کی ضرورت ہوتی ہے۔اگر مرد اور عورت دونوں ہی کمائیں تو اس وقت دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑتا اور اس طرح زندگی زیادہ خوشگوار گزرتی ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو مخلوط تعلیم کے حق میں نہیں ہیں۔ان کا خیال ہے کہ مخلوط تعلیم سے پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ حیوانات میں صنفی ملاپ قدرت نے اس حد تک رکھا ہے کہ جو بقائے نسل کے لئے کافی ہو اور ان کی صنفی کشش ایک

خاص مدت اور وقت کے تحت پیدا ہوتی ہے مگر انسانوں میں وقت کی پابندی نہیں یہ ہر موسم اور وقت میں آزاد ہیں۔ صرف اصول پسندی اور حیا ہی ان کو پابند رکھ سکتی ہے۔

زمانہ تعلیم نوجوانی کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس میں احساس ذمہ داری اور نیکی اور بدی کی تمیز بہت کم ہوتی ہے اور اکٹھے مل جل کر رہنے سے جنسی ہیجان کو قابو میں رکھنا بہت ہی مشکل کام ہے جب کہ ہمارے کالجوں کی فضا میں اخلاقی اور مذہبی قیود بھی کم ہوں ہر طالب علم اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے یہاں تک کہ اکثر خودسری کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ فحش قسم کا جنسی لٹریچر معاشرے میں پھیل رہا ہے جس کے برے اثرات تو ہونے ہی ہیں لیکن اگر تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم کا رواج ہوگا تو لڑکے اور لڑکیوں کے خیالات میں پراگندگی پیدا ہوگی۔ ثقافت اور آرٹ کے نام پر جو مواد چھپتا ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ قارئین کی اصلاح نہیں کرتا بلکہ نوجوان طبقہ کے لئے نقصان دہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ ویسے تو ہدایت حاصل کرنے والے کے لئے بری چیز میں بھی ہدایت مل جاتی ہے مگر ان کا انداز فکر اکثر مثبت نہیں ہوتا۔ اس لئے بے راہ روی کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں اور جب لڑکے لڑکیوں میں آزادانہ میل جول ہوگا تو اس کے اثرات زیادہ برے ہوں گے۔

ان لوگوں کی رائے ہے کہ عورت صرف عورت کی ہی ذمہ داریاں چار دیواری کے اندر رہ کر ہی سنبھالے تو ٹھیک ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کے جسم میں مختلف صلاحیتیں ہیں۔ مرد کا جسم سخت پختہ محنت کا عادی اور مشکلات کا مقابلہ کرنے

کے قابل ہوتا ہے اور عورت کا جسمانی نظام نرم و نازک اور اس طرح کا بنایا گیا ہے کہ وہ بچے کو جنم دینے اور اس کی پرورش کرنے کے قابل ہو۔ اسی لئے تو قدرت نے اسے نازک بدن اور نرم دل دیا ہے۔ مامتا اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے تا کہ ایک ماں شب و روز میں سے ایک لمحہ کے لئے بھی بچہ سے پیار و محبت کرنے کے بغیر نہ رہ سکے اور اس طرح سے بچے کے لئے قدرت نے اس کی پرورش کا صحیح انتظام کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کا یہ خیال بھی ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے بھی مخلوط تعلیم کا طریقہ غلط ہے۔ اس میں لڑکیوں کو بے پردہ رہنا پڑتا ہے اور اس طرح سے بے حیائی بڑھتی ہے اور معاشرہ خراب ہو جاتا ہے۔

معاشرے میں عورت کا مقام

آفتاب اسلام کے طلوع ہونے سے قبل عورت کو کوئی باعزت مقام نہیں دیا جاتا تھا۔عورت سراپا مظلومیت کا پیکر تھی ۔اس وقت کا کوئی فرد بھی عورت کو اس کا صحیح حق دینے کے لئے تیار نہیں تھا بلکہ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ لڑکی کے پیدا ہوتے ہیں زندہ دفنا دیا جاتا تھا۔ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو جو مقام اور احترام بخشا وہ اسے کسی مذہب، کسی ملک، کسی معاشرے، کسی تہذیب اور کسی قوم نے نہیں دیا کیونکہ کسی بھی اور مذہب کے عقائد واصول میں اتنی وسعت نہیں۔

تہذیب مغرب نے عورت کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر اسے دفتر اور صنعتی مراکز میں لا بٹھایا۔ان سے مرد کے برابر کام لینے لگے اور عورت اور مرد کی مکمل مساوات کا نظریہ اختیار کیا۔ہمیں اس سے بحث نہیں ۔اس وقت ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ عورت کا صحیح مقام کیا ہے اور ہمارے نظریات کے مطابق ہمیں صنف نازک کو کیا مقام دینا چاہیے اور کس قدر عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھنا اور سلوک کرنا چاہیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت اور مرد انسان ہونے کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں ۔انسانیت کے رشتے سے عورت یکساں عزت و احترام کی مستحق ہے۔ لیکن دیکھنا یہ بھی ہے کہ مرد کو کس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور عورت کو کس مقصد کے لئے ۔قدرت نے مرد کیا صلاحیتیں بخشی ہیں اور عورت کو کیا صلاحیتیں

دی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے ذمے کیا فرائض ہیں یا کن کن فرائض کو وہ خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے ہیں تا کہ فطرت کے تقاضوں کے مطابق نظام چل سکے۔ اگر ہم خلاف فطرت کوئی نظام چلائیں گے تو یقیناً اس میں خرابی پیدا ہو گی۔

یہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ بحیثیت انسان مرد اور عورت دونوں یکساں عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ لیکن قدرت نے جو فرق عورت اور مرد کے درمیان رکھ دیا ہے اسے ہم کیسے دور کر سکتے ہیں۔ اگر واقعی یہ درست ہے کہ عورت اور مرد صلاحیتوں اور قوتوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو ان کے فرائض اور ان کا دائرہ عمل بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو گا۔ عورت کو قدرت نے ایسا جسم دیا ہے جو نرم و نازک ہے کیونکہ اس نے بچے کی پیدائش اور اسے پرورش کرنے کے فرائض ادا کرنے ہیں۔ سب سے بڑی ذمے داری عورت پر یہ بھی عائد ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو ایسی تربیت دے جس سے ان میں وہ خوبیاں پیدا ہو جائیں کہ وہ معاشرے کے لئے بہترین افراد ثابت ہو سکیں اور یہ فرائض ایک مرد کسی صورت میں بھی ادا نہیں کر سکتا۔ قدرت نے عورت کو انہی فرائض کی انجام دہی کے لئے پیدا کیا ہے اور وہی یہ فرائض بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہے۔

اب مرد کو لیجئے۔ اس کے جسم کی بناوٹ سخت اور مضبوط ہے۔ اس نے محنت و مشقت سے اپنے کنبے کے لئے کسب معاش کا فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ اپنے کنبے کی پاسبانی بھی اسی کے سپرد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری اجتماعی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اسی کے کندھوں پر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قدرت نے دونوں میں

صلاحیتوں اور فرائض کے اعتبار سے یکسانیت نہیں رکھی۔ یہ حقیقت بھی ہے اور نظام پیدائش کے خلاف بھی ہے کہ اگر فرائض اور صلاحیتیں ایک ہی ہوں تو دونوں میں جسمانی فرق کی ضرورت بھی نہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ دو صنفوں کی ضرورت ہی کیا تھی ایک ہی صنف کافی تھی۔

انسانوں کے علاوہ حیوانات کو دیکھ لیجئے وہ بھی بحیثیت حیوان کے ایک جیسے ہی حقوق رکھتے ہیں۔ مگر ان کا جسم بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے اور ان کی صلاحیتوں اور قوتوں میں بھی اختلاف ہے۔ ان میں بھی مذکر کو مونث پر برتری حاصل ہے۔ حالانکہ ان میں مونث اپنی خوراک اور دوسری ضروریات میں مذکر کا محتاج نہیں ہوتا مگر پھر بھی مذکر سے صلاحیتوں اور قوتوں کے اعتبار سے کم تر ضرور ہوتا ہے اور یہ فرق خالق کل نے خود ہی رکھا ہے۔ اگر ہم اپنی عقل ناقص سے اس میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں تو اس کا نتیجہ یقینی طور پر غلط ہی برآمد ہوگا۔

ہمارے خیال میں برتری اور کم تری کا لفظ اصل میں عورتوں کے ذہن میں سمایا ہوا ہے۔ وہ یہ کہتی ہیں کہ ہم مرد سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ درست ہے اور ان کی یہ بات قابل قبول ہے۔ ان کے حقوق مرد کے برابر ہیں۔ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے رفیق و دمساز ہیں۔ نہ عورت مرد کی زرخرید غلام ہوتی ہے نہ مرد عورت کا غلام ہوتا ہے۔ مرد نے باہر کے فرائض انجام دینے ہوتے ہیں۔ عورت اپنے گھر کی چار دیواری کے انتظامات میں خودمختار ہوتی ہے۔ مگر بعض ایسے مسائل بھی ہیں جو عورت حل نہیں کر سکتی مرد ہی کر سکتا ہے۔ وہ ہے عورت کی کنات،

پاسبانی اور اسی لئے قدرت نے مرد کو عورت سے برتر بنایا ہے کہ اس کے ذمے اس اہم ترین فریضہ کی ادائیگی ہے۔

یہ کہنا کہ فی زمانہ اکیلے مرد کے لئے کسب معاش مشکل ہو گیا ہے اور اس میں عورت اگر ہاتھ بٹائے تو بہت سے تفکرات اور بت سے بوجھ کم ہو سکتے ہیں درست ہے مگر اس کے لئے ایسے طریقے اختیار کرنا چاہئیں جس سے عورت ذریعہ نمائش نہ بنے۔ ان کے دائرہ کار اور طریقہ کار کو اس طرح مرتبت کرنا چاہیے کہ جس سے ان کی بے حرمتی نہ ہو۔ ان کے احترام میں کوئی فرق نہ آئے۔ بدقماش لوگوں کی نظر و نفس کی تسکین کا مرکز نہ بن جائیں۔ عورتیں معاشرے کی اصلاح اور قوم کی ترقی کے لئے بہت کچھ کر سکتی ہیں مثلاً وہ تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دے سکتی ہیں۔ اصلاح نسواں کے لئے کام کر سکتی ہیں۔ قلم و قرطاس اور شعر و ادب کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت کر سکتی ہیں۔ انہیں چاہیے کہ ان میدانوں میں اپنے جوہر دکھائیں۔

عورت کے حقوق

حق بات تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے مرد اور عورت کو انسان ہونے کے ناطے سے یکساں حقوق دیئے ہیں اور انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔ وہ عادل مطلق ہے۔ اس کی نظر میں مرد اور عورت یکساں ہیں اور یکساں حقوق کے مالک ہیں۔ ایک نوع کی دو اصناف ہونے کی حیثیت سے ان میں جو امتیازات ہیں ان کے قائم رہتے ہوئے بھی ان کے حقوق یکساں ہیں۔

اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں ایک طویل دور ایسا رہا ہے جس میں عورت مال و متاع کی طرح ایک شے تھی۔ اسے تھوڑی بہت اہمیت دی بھی جاتی تھی تو ایک خادمہ یا کنیز سے زیادہ نہیں۔ نہ اسے حصول علم کی اجازت تھی۔ نہ اس کی کوئی اجتماعی زندگی تھی۔ قانونی ملکیت کے حق سے عورت محروم تھی۔ اس سے صرف کھانا پکانا کپڑے سینے دھونے اور بچوں کی پرورش کا کام لیا جاتا تھا۔ علوم دین و دنیا سے وہ ناآشنا رہتی تھی اور اسے فطرت اور قانون الٰہی کے خلاف بالکل حیوان سمجھا جاتا تھا۔

اے انسانو! ہم نے تم کو مرد و عورت سے پیدا کیا اور تم کو باہمی تعارف کے لئے کنبوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا۔ (البقرہ)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔ ''اور (ان دونوں) مرد و عورت کے ذریعے سے اس نے بہت سے مرد اور عورتیں (کائنات) میں پھیلا دیں۔'' (نساء)

لہٰذا انسانیت کے لحاظ سے بھی دونوں برابر ہیں اور انسانی حقوق میں بھی

دونوں کے لئے یکساں آزادی ہے۔مرد کے مقابلے میں اس اعتبار سے عورت پر کسی قسم کی ایسی پابندی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس حق سے محروم، یا مرد کے مقابلے میں پست و مقہور سمجھی جائے۔

''اور عورتیں کے لئے بھی اسی طرح حقوق مردوں پر ہیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں۔'' (بقرہ)

''عورتیں تمہارے لباس ہیں اور تم عورتوں کے لباس ہو۔'' (بقرہ)

رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

''بلاشبہ عورتیں (حقوق انسانیت میں) مردوں کے برابر ہیں۔''

''علم سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔''

اسلام نے ازدواجی زندگی کے لئے نکاح کے مسئلہ میں بھی عورت کے اقرار و انکار کو اسی طرح آزادی بخشی ہے جس طرح مرد کو عطا کی ہے۔

ایک نوجوان عورت رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرے والد نے میرا نکاح اپنے بھتیجے سے اس لئے کر دیا ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنی مالی تنگی دور کرے۔ نبی اکرمؐ نے اس کو اختیار دیا کہ وہ اس نکاح کو باطل کر دے۔تب اس عورت نے کہا میں نکاح کو باقی رکھتی ہوں۔اس طرح کرنے سے میری غرض یہ تھی کہ عورتوں کو بتا دوں کہ شریعت نے باپ کو بالغ لڑکی پر نکاح کے معاملے میں زبردستی کا حق نہیں دیا۔'' (ابن ماجہ وغیرہ)

اسی طرح سخت مجبور کن حالات میں جس طرح مرد کو ''طلاق'' کا حق دیا ہے

اسی طرح عورت کو بھی یہ حق ''خلع'' کی شکل میں عطا فرمایا ہے اور بغیر شرعی یا معاشرتی مجبوری کے دونوں کو ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔

اسلام نے قانونی حقوق میں عورت کو مرد کے مساوی ہی رکھا ہے۔ وہ مرد کی طرح مال و جائیداد کی مالک ہوسکتی ہے اور ہبہ، بیع، رہن وغیرہ کے اختیارات رکھتی ہے۔ وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے دیوانی عدالت میں ہر قسم کے دعوے دائر کرسکتی ہے۔ وہ حدود و قصاص اور تعزیری حقوق میں اپنے مخالف مرد پر اسی طرح حد جاری کرا سکتی ہے جس طرح مرد عورت کے خلاف کرا سکتا ہے۔ وہ سیاسی و شہری معاملات میں صلح و جنگ میں اسی طرح حقدار ہے جس طرح مرد حقدار ہے۔ غرض تمام اس قسم کے معاملات میں وہ مرد ہی کی طرح سمجھی گئی ہے اور ان امور کی شہادت کے لئے میراث، وصیت، مہر، حدود و قصاص اور صلح و جنگ سے متعلق آیات اور اسی سلسلے کی تمام احادیث و جزئیات فقہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت اپنے حقوق انسانی میں مرد کے برابر ہے۔ عورت انسانی دنیا میں ایک مکمل اور مستقل فرد ہے اور اجتماعی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود عورت صنفی اعتبار سے ایک الگ اور مستقل صنف ہے جس کو صنف نازک کہا جاتا ہے۔ فطرت نے اس لحاظ سے عورت کو مرد سے جدا کر دیا ہے کیونکہ مرد مرد ہے عورت نہیں اور عورت عورت ہے مرد نہیں۔ پس اسلام نے اپنی ''اخلاقی تعلیم'' میں عورت کو انسانی حقوق کے باوجود صنفی نزاکت کے اعتبار سے مرد کے مقابلے میں وہی حیثیت دی ہے جو سخت کے مقابلہ میں

نازک کو ملنی چاہیے اور اسی لئے ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے۔

''اور عورتوں کے حقوق مردوں پر اسی طرح ہیں جس طرح مردوں کے عورتوں پر ہیں اور مردوں کو عورتوں پر (فضیلت کا) ایک درجہ حاصل ہے۔''

اور پھر خود ہی اسی درجہ فضیلت کی تشریح بھی فرما دی۔

''مرد عورتوں کے سربراہ اور کارفرما ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر (خاص خاص باتوں میں) فضیلت دی ہے نیز اس لئے کہ مرد اپنا مال (جو ان کی محنت سے جمع ہوتا ہے عورتوں پر) خرچ کرتے ہیں۔''

یعنی مرد کو عورت پر ایک درجہ حاصل ہے اور وہ درجہ سربراہی اور کارفرمائی کا ہے اور اس فضیلت کے درجہ کے لئے علت بھی خود ہی بیان فرما دی تا کہ غلط فہمی نہ ہو۔ دونوں اصناف میں برابری کے باوجود کچھ خاص خاص فضیلتیں ایسی ہیں جو دوسری صنف میں نہیں ہیں۔ مثلاً یہ فضیلت مرد کی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی محنت کا سرمایہ عورت پر خرچ کرتا ہے اور ایسا کرنا اس پر فرض ہے۔ مرد عورت کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ اس کی رہبری و رہنمائی کا فرض بھی ادا کرتا ہے اور اس کے لئے ہر سامان آرام و آسائش مہیا کرنے کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اسی وجہ سے مرد کو عورت پر فضیلت ہے۔ اجتماعی زندگی میں کسی ایک کو تو سربراہ، رہنما، کارفرما یا محافظ ماننا ہی پڑتا ہے۔

پس اگر فرق ہے تو یہاں آ کر پڑتا ہے۔ ہم اس کا موازنہ دوسری طرح کر لیتے ہیں کہ چلو ہم یہ فضیلت عورت کو دے دیتے ہیں۔ تو سربراہی، رہنمائی،

کارفرمائی اور محافظت عورت کے ذمے آ جاتی ہے۔ یہاں دیکھنا یہ ہے کہ کیا عورت ان فرائض کو بجا طور پر انجام دے سکتی ہے۔ کیا عورت مرد کی معاونت کے بغیر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی ہے یا عورت کو اگر مرد کا محافظ بنا دیا جائے تو ان کی حفاظت کر سکتی ہے یا حفاظت کی ضرورت صنف نازک کو ہے یا صنف سخت کو۔ مرد کے مقابلے میں ضرورت بھی عورت کو ہے اور وہ اس فریضہ سے عہدہ برآ بھی نہیں ہو سکتی۔ تو کیا وجہ ہے کہ مرد کو یہ فضیلت نہ دی جائے جب کہ اس میں عورت کو منفعت ہے خسارہ نہیں؟ لہٰذا یہ عورت کے لئے باعث فخر ہے اور فرائض سے سبکدوشی کے مترادف بھی کہ عورت کا سربراہ، کارفرما، کفیل و محافظ مرد کو بنا دیا گیا ہے اور مرد کے سوا اس کی حفاظت کر بھی کون سکتا ہے۔ عورت مرد کی ناموس ہے چونکہ بار کفالت و حفاظت قدرت نے مرد کے کندھوں پر رکھ دیا ہے اور اسی لئے مرد کو بجا طور پر فضیلت دی گئی ہے۔ اس میں عورت کی کسی طرح بھی حق تلفی نہیں ہوتی جب کہ عورت ہر شعبہ میں مرد کے برابر ہے اور اسے وہی حقوق حاصل ہیں جو ایک مرد کو۔ انسانی حقوق میں عورت مرد سے ذرہ برابر بھی کم نہیں۔

مطالعہ کا طریقہ

فی زمانہ کوئی کام بغیر علم کے نہیں ہوسکتا حصول علم کے لئے مطالعہ بہت ہی ضروری ہے۔ مطالعہ بھی ایک فن ہے۔ اگر اس فن کو صحیح طور پر اپنایا جائے تو نتائج اچھے نکلیں گے اور اگر غلط طور پر اپنایا جائے تو ظاہر ہے نتائج بھی اسی قسم کے ہوں گے۔ آیئے دیکھیں مطالعہ کے لئے کون کون سے آداب ولوازم اختیار کئے جائیں جن سے مطالعہ سے پورا پورا استفادہ کیا جا سکے۔

مطالعہ کے لئے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ مطالعہ کرنے والے کو داخلی اور خارجی سکون میسر ہو۔ مطالعہ کرنے والے کا ذہن وقلب پریشانیوں اور الجھنوں سے بالکل آزاد ہو اور وہ جہاں پر مطالعہ کر رہا ہو وہاں پر بھی مکمل سکون میسر ہو۔ کوئی بیرونی مداخلت اس کے ذہن کو مطالعے سے نہ ہٹا سکے۔ اسے مکمل یک سوئی حاصل ہو۔ اگر وہ ذہنی طور پر مطمئن نہیں تو اس کا دماغ پڑے ہوئے کو محفوظ نہیں رکھ سکے گا دوسرے اگر وہاں پر شور وغل مچ رہا ہے، کوئی بیرونی مداخلت اس کے مطالعہ کے تسلسل کو توڑ دیتی ہے یا اسے ایسا ماحول میسر نہیں ہے اور اس کا ذہن بے چین ہے تو اس کا مطالعہ بے کار ہوگا یا وہاں پر ایسے انتظامات نہیں ہیں جو اس کے مطالعہ میں مددگار ثابت ہوں۔ مثلاً روشنی کا صحیح انتظام نہیں ہے یا ضرورت سے زیادہ روشنی ہے دونوں صورتوں میں اس کی بینائی پر برا اثر پڑے گا۔ بیٹھنے کے لئے مناسب جگہ ہو ماحول پاک وصاف ہو۔ روشنی سامنے کی طرف سے نہیں آنی چاہیے۔ بہتر ہے کہ بلب بائیں جانب لگا ہوا ہوتا کہ اس کی آنکھوں کو نقصان بھی

نہ پہنچے اور اگر لکھنے کی ضرورت محسوس ہو تو قلم یا ہاتھ کا سایہ رکاوٹ نہ بنے کتاب بھی ایک مخصوص فاصلے پر ہونا لازمی ہے آنکھوں اور کتاب کے درمیان ایک یا ڈیڑھ فٹ کے قریب فاصلہ ہونا چاہیے۔

مطالعہ کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ طالب علم جو چیز پڑھ رہا ہو اس میں وہ دلچسپی بھی رکھتا ہو اس طرح جوں جوں وہ پڑھتا چلا جائے گا اسی قدر اس کا ذہن اسے محفوظ کرتا چلا جائے گا اور اس کی دلچسپی بھی اسی قدر بڑھتی چلی جائے گی اور طبیعت میں اکتاہٹ بالکل محسوس نہیں ہوگی۔ جس مضمون میں دلچسپی نہیں ہوتی اس کے مطالعہ سے طبیعت بہت جلد اکتا جاتی ہے اسے ایک بوجھ سمجھ کر پڑھنے سے وہ ذہن میں محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ وہ اس کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ لہٰذا جو چیز پڑھی جائے اس میں مطالعہ کرنے والے کی دلچسپی ضروری ہے۔ اگر کوئی ایسا مضمون ہے جو اس کی طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتا اور اسے پڑھنا بھی ضروری ہے تو اسے مشکل نہ سمجھے اور ذہن سے یہ بات نکال دے کہ میں اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ گویا نفسیاتی طور پر اسے اپنے ذہن کو پڑھنے کے لئے تیار کرنا چاہیے اور اس میں دلچسپی پیدا کرنی چاہیے۔ اس سے زیادہ دلچسپی پیدا کرنے کا سبب اور کیا ہوگا کہ اس نے اسے ضرور پڑھنا ہے اور اس کے پڑھنے سے اور کامیابی حاصل کرنے میں ہی اس کا مفاد ہے۔ مثال کے طور پر ایک طالب علم انگریزی میں دلچسپی نہیں رکھتا مگر اسے انگریزی ضرور پڑھنا پڑتی ہے اور اس میں کامیابی حاصل کرنا لازمی ہے۔ ایسے طالب علموں کو چاہیے کہ وہ یہ بات اپنے ذہن سے نکال دیں کہ انگریزی ایک

مشکل مضمون ہے۔ کسی وجہ سے وہ اس میں توجہ شروع سے نہیں دے سکے جس کی وجہ سے وہ کمزور رہ گئے اور ان کی مزید بے توجہی ان کو اس مضمون میں کمزور سے کمزور تر کرتی چلی گئی۔ ایسے طالب علم کو چاہیے کہ وہ سمجھے کہ یہ میرے لئے کامیابی کا زینہ ہے اور مجھے اسے پڑھنا ہے۔ اس پر بغیر ذہن پر بوجھ ڈالے اس میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جب ایک سبق یا ایک گرامر کا طریقہ یاد کر لے گا تو دوسرا اس کے لئے آسان معلوم ہوگا۔ آگے چلنے کے لئے سابقہ پڑھے ہوئے پر زیادہ توجہ دینی چاہیے تاکہ راستہ کھل جائے۔ یہی کامیابی آپ کی دلچسپی کا سبب بن جائے گی۔ ذرا دلچسپی پیدا ہوئی تو آپ کامیاب ہیں۔

مطالعہ کے لئے اپنی طبیعت کو ایک حد سے زیادہ مجبور نہیں کرنا چاہیے جہاں تک ذہن قبول کرے بس یہی اس کی حد ہے۔ اس حد کو مشق کے ذریعے بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ تازہ دم ہونے کے لئے تھوڑا سا توقف کر لینا یا تازگی کے لئے کوئی انتظام رکھنا چاہیے۔ مطالعہ کا وقت کس قدر ہو یہ اپنی اپنی طبیعت پر منحصر ہے۔ کئی زیادہ دیر تک پڑھتے رہتے ہیں اور کئی چند گھنٹے پڑھتے ہیں۔ مگر مطالعہ کے لئے کم از کم چار پانچ گھنٹے ضرور ہونے چاہئیں۔ اس دوران ایک دفعہ توقف کر لیا جائے یا تازگی طبع کے لئے کسی مشروب مثلاً چائے یا پھل کا انتظام کر لیا جائے تو بہتر ہوگا۔

مطالعہ کے لئے ایک چیز کافی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ یہ کہ مطالعہ کے لئے ایک پروگرام ترتیب دینا لازمی ہے۔ جو لوگ طالب علم نہیں ہیں اور محض معلومات عامہ کے تحت مطالعہ کرتے ہیں ان کے لئے بھی اور جو طالب علم ہیں جن کے لئے

خاص مضامین کی تیاری کرنا ہوتی ہے کے لئے بھی وقت کا تعین ضروری ہے کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک ہم نے مطالعہ کرنا ہے اور روزانہ کرنا ہے۔اس سے مطالعہ کا تسلسل نہیں ٹوٹتا جو ایک دن پہلے پڑھا ہوا ہوتا ہے۔اس سے دوسرے دن کی کڑی مل جاتی ہے۔جن طلباء نے مختلف مضامین کی تیاری کرنا ہوتی ہے انہیں ٹائم ٹیبل اپنی ضرورت کے مطابق بنالینا چاہیے اور دوبارہ تیاری کے لئے مختصر نوٹ رکھنے چاہئیں تا کہ دوبارہ انہیں یادداشت کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔نوٹ وقت بھی بچائیں گے۔ایک مختصر سا اشارہ آپ کو سارا پیرایا مضمون یاد دلانے کے لئے کافی ہوگا۔

All rights reserved
©2002-2006

میرا نصب العین

طالب علمی کا زمانہ وہ ہوتا ہے جس میں تعمیر انسانیت ہوتی ہے۔ اسی میں کردار کی تعمیر ہوتی ہے اور اعلیٰ خیالات پرورش پاتے ہیں۔ آئندہ زندگی کے راستوں کا تعین ہوتا ہے۔ ان راستوں کو طے کرنے کے لئے زادراہ اسی زمانہ میں اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ اس زمانے میں طالب علم کی کبھی کسی کام کی طرف رغبت ہو جاتی ہے کبھی کسی کام کی طرف۔ تذبذب کی کیفیت اکثر ہوا کرتی ہے۔ ان متلاطم و متصادم خیالات میں بھی میرا ذہنی رجحان زیادہ تعلیم و تدریس کے پیشے کی طرف ہے۔ مجھے اور بھی بہت سے اچھے اچھے پیشے نظر آتے ہیں مگر میرا ذہنی رجحان زیادہ اسی طرف ہے۔ جہاں تک دولت کمانے اور شوکت و عزت کا تعلق ہے ڈاکٹری کا پیشہ ہے۔ انجینئری کا پیشہ ہے۔ تجارت ہے۔ ان تمام پیشوں میں عزت شہرت پیسہ سب کچھ مل جاتا ہے مگر معلمی کے پیشے میں مجھے جس قدر پاکیزگی، خدمت انسانیت، تعمیر نو نہالان قوم، سادگی، خلوص اور احترام انسانیت نظر آتا ہے دوسرے کسی پیشے میں نہیں نظر آ رہا۔ لہٰذا میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں ایک معلم بنوں گا۔ معلم بھی وہ جس کے دل میں قوم کے بچوں کو سنوارنے کی تڑپ ہو۔ جس کا مطمع نظر صرف حصول دولت نہ ہو۔ جس کا نصب العین ہر وقت خدمت ملک و قوم ہو۔ جو قوم کے طلباء کو سائنس کے شعبے میں تحقیق و تجسس کے میدان میں شہسواری کے لئے تیار کر کے تعلیم و تدریس کا مقصد فریضہ بھی سرانجام پاتا رہے اور قوم کے نوجوانوں کی خدمت ملک کے لئے تیار کرنے کا فرض بھی پورا ہو سکے۔

میں اس وقت دسویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ میں نے سائنس کے مضامین لے رکھے ہیں۔ بفضلہٖ میں جماعت کے سب لڑکوں سے لائق ترین ہوں۔ میرا رجحان بھی سائنس کی طرف ہے۔ ویسے بھی قدرت نے مجھے یہ ملکہ بخشا ہے کہ میں بات کو اچھی طرح سے سمجھا سکتا ہوں اور خوب ذہن نشین کروا سکتا ہوں۔ میٹرک کرنے کے بعد ایف ایس سی، پھر بی ایس سی اور ایم ایس سی کرنے کے بعد بیرون ملک سے پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے والدین بھی میرے اس پروگرام سے پوری طرح سے متفق ہیں جس کی وجہ سے میرا ارادہ اور بھی پختہ ہوگیا ہے اور میں بڑی جدوجہد اور مستعدی سے حصول علم کے لئے کوشاں رہتا ہوں۔

پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اپنے ملک واپس آ کر یونیورسٹی میں فریضہ تدریس سنبھالوں گا اور ساتھ ہی ساتھ سائنسی تحقیق کا کام بھی کروں گا میرا ارادہ الیکٹرانکس میں پی ایچ ڈی کرنے کا ہے تاکہ قوم کے طلباء کو الیکٹرانکس میں اس قابل بنا سکوں گا کہ وہ میری طرح قوم کی خدمت کا مقدس فریضہ سرانجام دیں سکیں اور میری زندگی کے بعد بھی میرا مشن جاری رہے۔

استاد اور شاگرد کا رشتہ ایک مقدس اور پاکیزہ رشتہ ہے تعلیم و تدریس ایک پیغمبری پیشہ ہے جس میں لوگوں کو ہدایات دی جاتی ہیں اور انہیں نیک و بد کی تمیز سکھائی جاتی ہے۔ استاد کو حق کی تبلیغ اور قوم کی رہنمائی کا فریضہ سونپا گیا۔ مگر بدقسمتی آج اس پیشہ کی قدر و قیمت کم ہوگئی ہے۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ احساس ذمے

داری نہیں رہا ہے اور لوگوں کے دلوں سے ادب و احترام اٹھ گیا ہے۔ ویسے آج استاد بھی استاد نہیں رہا اور شاگرد بھی شاگرد نہیں رہا ہے۔ استاد کو احساس فرض نہیں۔ شاگرد کو مادی نظریات نے اندھا کر دیا ہے۔ وہ سمجھنے لگ گیا ہے کہ جس طرح بازار سے اور چیزیں خریدی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح سے تعلیم بھی خریدی جاتی ہے۔ استاد کو ہم تنخواہ دیتے ہیں وہ پڑھاتا ہے۔ اسی طرح سے استاد سمجھتا ہے کہ مجھے تنخواہ تو ہر حال میں مل ہی جائے گی شاگرد لائق ہو جائیں یا نالائق رہ جائیں۔ وہ بھی مادہ پرستی کے جنون میں شاگردوں سے ٹیوشن کی صورت میں پیسے بٹورنے شروع کر دیتا ہے اور وہ فریضہ جس کی ادائیگی اس کے ذمے درس گاہ کی چار دیواری کی حدود کے اندر تھی ناجائز منفعت کی شکل میں اپنے گھر پر مزید وصول کرتا ہے ان دونوں وجوہات کی بناء پر استاد بے چارگی کی حالت میں مبتلا ہے۔ نہ اس کا پیٹ بھرتا ہے نہ معاشرہ اس کی عزت کرتا ہے اور نہ شاگرد۔ یہ تمام ہمارے معاشرے کا قصور ہے احترام استاد جب تک نہیں ہوگا۔ تب تک قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ مغربی ممالک میں بڑی سے بڑی برائیاں ہیں مگر احترام استاد کا جذبہ اب بھی اسی طرح سے موجود ہے وہ معلم کو آج بھی معمار انسانیت کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی ہر بات و فیوض کو سرمایہ حیات سمجھتے ہیں۔

بہر حال مجھے اس سے بحث نہیں کہ اس وقت ہمارے ملک میں احترام استاد ہے کہ نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ احترام استاد، استاد کے اپنے اختیار میں ہے اگر وہ صحیح استاد ہے اور پر خلوص ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ استاد کی قدر و قیمت آج بھی وہی

نہ ہو جو پہلے ہوا کرتی تھی۔

حکیم الامت علامہ اقبال کا شمار دنیا کی عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے۔ آپ علامہ وقت اور مجسمہ علم و فضل تھے۔ آپ نے اپنے استاد مکرم سید میر حسن کو اپنے اشعار ذیل میں مثل حرم کہا ہے۔

وہ شمع بارگاہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

الغرض استاد ایک بڑی عظیم ہستی ہوتی ہے اور اسی طرح سے اس کے فرائض بھی اعلیٰ و ارفع ہوتے ہیں اور انہیں فرائض کی تکمیل کے لئے میں ایک معلم بننا چاہتا ہوں خدا مجھے اس کی توفیق دے۔

طلبہ اور سیاست

ملک کے داخلی و خارجی معاملات و مسائل کو سمجھنے، ان کا حل تلاش کرنے، ملک کا نظم و ضبط سنبھالنے اور اس کے لئے قوانین بنانے کو سیاست کہتے ہیں۔ جو لوگ ان امور کے ماہر ہیں سیاستدان کہلاتے ہیں۔ دوسروں علموں کی طرح سیاسیات بھی ایک مکمل علم ہے جس کا شعور رکھنا ہر شہری کے لئے ضروری ہے۔

ہمارے ہاں یہ مسئلہ موضوع بحث بنا ہوا ہے کہ طلبہ کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ طلبہ کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے اور کچھ یہ رائے رکھتے ہیں کہ ان کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ دونوں گروہوں کے لوگ حسب ذیل دلائل دیتے ہیں۔

جو لوگ طلبہ کے سیاست میں حصہ لینے کے حق میں ہیں کہتے ہیں کہ آج کے طلبہ کل کے سیاستدان ہیں۔ اگر آج انہیں سیاست سے الگ رکھا جائے گا تو ان میں وہ شعور ہی پیدا نہیں ہوگا جو ایک سیاستدان کے لئے ضروری ہے۔ سیاست کا ابتدائی تجربہ انہیں زمانہ طالب علمی میں کرنا چاہیے۔ جو طالب علم زمانہ طالب علمی میں سیاست میں حصہ لیتے ہیں ان میں سیاسی شعور پیدا ہوتا ہے اور جب وہ عملی زندگی میں پہنچتے ہیں تو ایک کامیاب سیاستدان بن سکتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی کی ابتدائی منازل انہیں ایک دن سیاست کے نقطہ عروج پر پہنچا دیتی ہیں۔ جتنے سیاست دان تاریخ نے پیدا کئے ہیں اگر ان کے زمانہ طاب علمی کے حالات پڑھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ زمانہ طالب علمی ہی میں انہوں نے سیاست سے دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ قائد

اعظمؒ جب اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے تو انہوں نے وہیں سیاست میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی اور سیاسیات کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ایک طالب علم جو ایک ڈاکٹر بننا چاہتا ہے، انجینئر بننا چاہتا ہے، سائنس دان بننا چاہتا ہے۔ وہ اپنے شعبہ کی مہارت زمانہ طالب علمی میں ہی حاصل کرتا ہے۔ قائداعظمؒ نے بھی تو طلبہ کو مسلم لیگ میں حصہ لینے کے لئے کہا تھا۔ چنانچہ اور حصول پاکستان میں طلبہ کا بہت حصہ تھا۔ رہی یہ بات کہ جوانی کی عمر میں ذہنی پختگی کے بجائے جوش و ہیجان زیادہ ہوتا ہے یہ صحیح ہے لیکن قیادت اگر پختہ کار اور تجربہ کار ہو اور طلبہ سے محض تائیدی کام لیا جائے تو غلطی کا احتمال نہیں ہوتا اور ساتھ ہی ساتھ ہوش و حواس کی حدود سے باہر نہ ہونے دیا جائے۔ ان کے لئے لائحہ عمل متعین کر دیا جائے تو تحریکیں ناکام نہیں ہوتیں۔

جن لوگوں کی رائے یہ ہے کہ طلبہ کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے وہ اپنے دلائل دیتے ہیں کہ سیاست میں عملی طور پر حصہ لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس میں ذہن و شعور کی پختگی اور تجربہ کاری نہایت ضروری ہے۔ طلبہ اپنی زندگی کے ایسے دور سے گزر رہے ہوتے ہیں جس میں عقل کی بجائے جوش زیادہ ہوتا ہے۔ سیاست میں حصہ لینے کے لئے متوازن دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے مگر نوجوان طبقے میں اس چیز کا فقدان ہوتا ہے۔ پختگی ناپید ہوتی ہے اور ناتجربہ کاری قوم کے لئے نقصان عظیم کا باعث بن سکتی ہے۔ نوجوانی میں جذبات کی شدت ہوتی ہے اور ہوش کی کمی کے سبب اکثر تحریکیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ جو عمل ہوش کے تابع نہ ہو اکثر اور بیشتر تباہی کا موجب بنتا ہے۔

ان کی رائے میں طالب علمی کا زمانہ ذہنی صلاحیتوں کو نکھارنے کا زمانہ ہوتا ہے اور طالب علم کا کام صرف اور صرف حصول تعلیم ہوتا ہے۔ اس سے ہٹ کر اگر اس کا ذہن دوسری طرف لگ جائے تو نہ تو وہ تعلیم ہی صحیح طور پر حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی سیاستدان بن سکتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنا ذاتی نقصان بھی کرتے ہیں اور قوم کے لئے بھی رسوائی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ جو طلبہ اپنے زمانہ طالب علمی میں، جو کہ ان کی ذہنی ناپختگی کا زمانہ ہوتا ہے، سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیتے ہیں وہ اپنے مقصد تعلیم میں ہمیشہ کے لئے ناکام ہو جاتے ہیں۔ تحریک آزادی کے دور میں جب انگریزوں سے عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی کانگریس نے کالجوں کا اسی لئے بائیکاٹ کر دیا تھا کہ کوئی طالب علم تحریک میں حصہ نہ لے۔ مگر پھر بھی ہزاروں طلبہ نے تعلیم کو خیرباد کہہ کر تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا یہ تحریک بھی کامیاب نہ ہوئی اور ان کا مستقبل بھی بری طرح سے تباہ ہو گیا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو قائداعظمؒ نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے اجلاس میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ''جن طالب علموں نے اپنی تعلیم ابھی مکمل نہیں کی انہیں خارزار سیاست سے دور رہنا چاہیے اور سستی شہرت کے بھوکے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہیں بننا چاہیے۔ آپ ملک کا سرمایہ ہیں۔ پڑھ لکھ کر اپنے ملک کی دولت میں اضافہ کریں۔ صرف تعلیم کی تکمیل سے ہی آپ اپنے ملک کے اقتصادی، معاشی اور سماجی مسائل حل کرنے میں مدد و معاون ہو سکیں گے۔ کھوکھلی نعرہ بازی کے ماحول سے دور رہ کر تعلیم حاصل کیجئے۔'' اس طبقے کا خیال یہی ہے کہ طلبہ کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔

پاکستان کی تعمیر و ترقی میں طلبہ کا حصہ

کون ہے جسے اپنے وطن سے محبت نہیں ہوتی۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنے وطن سے ہر شخص کو محبت ہوتی ہے۔ وطن کے نام پر ہر شہری مر مٹنے کو تیار رہتا ہے اور یہی جذبہ زندہ قوموں کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ وطن کی تعمیر و ترقی کا جذبہ قوموں کے خیالات و عمل کا ایک عظیم سرمایہ ہے۔ زندگی بحیثیت ایک قوم کے وطن کے دامن میں ابھرتی اور نکھرتی ہے۔ اصل میں وطن اور قوم لازم و ملزوم ہیں۔ قوم کی زندگی کے لئے وطن کا استحکام لازم ہے۔

پاکستان کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی ذمہ داری کسی ایک فرد پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ہر اس فرد پر عائد ہوتی ہے جو اس مادر وطن کا سپوت کہلاتا ہے اور جو یہاں رہتا جو اس مٹی میں پل کر جوان ہوتا ہے۔ جو اس کی خوبصورت وادیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، اس کے سبزہ زاروں سے اپنی آنکھوں کو تر اوٹ پہنچاتا ہے۔ اور یہاں رہ کر آزادی کا سانس لیتا ہے۔ پاکستان ہمارا وطن عزیز ہے۔ یہ ہماری امیدوں کا محور اور مرکز ہے۔ اس کے لئے کام کرنا، اس کی ترقی و تعمیر میں حصہ لینا ہر ذی ہوش پاکستان کا فرض ہے۔ اس فہرست میں طلبہ بھی شامل ہیں۔ طلبہ کا طبقہ ملک کا بہترین سرمایہ اور اس کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ ملک کی آئندہ ترقی کا انحصار انہی کی سوجھ بوجھ اور انہی کی محنت پر ہوتا ہے کیونکہ آج کے نوجوان کل کے نہایت ہی ذمہ دار افراد کہلائیں گے۔

طالب علمی کا زمانہ ان کے لئے ذہنی پختگی حاصل کرنے کا ہوتا ہے۔ اس دور

میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کرنا ہوتی ہے اور انہیں یکسوئی اور سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی ہنگامہ آرائی کا شکار ہو جائیں اور اپنے اصل فرائض کو پس پشت ڈال دیں تو حصول تعلیم کا مقدس فریضہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ ان کی توجہ صرف تعلیم کی طرف ہونا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ نظم وضبط کو پوری طرح سے برقرار رکھیں۔ انہیں ملکی سیاست سے تاوقتیکہ کوئی ہنگامی حالات پیدا ہوں، دور رہنا چاہیے۔ البتہ انہیں اپنے تعلیمی مطالبات منوانے کا حق ضرور حاصل ہے مگر وہ بھی اس شکل میں کہ کسی ہنگامہ آرائی کے بغیر وہ اپنے مطالبات وتجاویز صاحبان بست و کشاد کے آگے پیش کر سکتے ہیں اور چونکہ ان کو ان کی ضروریات اور اپنے وسائل کا زیادہ پتہ ہوتا ہے لہٰذا اس کا فیصلہ بھی ان ہی پر چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہوگا۔

طلباء کو چاہیے کہ ملک کی فلاحی تنظیموں میں حصہ لیں اور رفاہی کاموں میں حصہ لے کر وطن کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیں۔ انہیں چاہیے کہ ایسی تنظیمیں بنائیں جو ناخواندہ افراد کو تعلیم دیں۔ اپنے گردوپیش کے ماحول کے لوگوں میں جذبہ حب وطن کا احساس دلائیں تاکہ قوم میں وطن کے لئے ایثار وقربانی کا جوہر تازہ رہے۔ لوگوں کی توجہ صحت وصفائی کی طرف مبذول کرواتے رہیں۔ وہ ان میں ایک صحت مندانہ ذہن پیدا کر سکتے ہیں جس سے خودغرضی اور حق تلفی کے رجحانات ختم ہو سکتے ہیں۔ اس طرح وہ عوام میں زندہ قوموں کا سا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں۔

مقام افسوس ہے کہ طلبہ کی اکثریت اعلیٰ ملازمتوں اور حصول زر کے لئے تعلیم

حاصل کرتی ہے۔ ان کا نظریہ بہت بلند ہونا چاہیے۔ وہ اگر قوم کی خدمت کے جذبے سے تعلیم حاصل کریں تو ان ے اپنے مقاصد بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور وہ ملک کی خدمت کا مقدس فریضہ بھی انجام دے سکتے ہیں۔ طلباء کو اپنی ذہنی صلاحیتوں اور رجحانات کے مطابق مضامین کا انتخاب کرنا چاہیے اس سے وہ زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں اور قومی ترقی کے مختلف دائروں میں اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لا سکتے ہیں۔

ہمارے ملک کے طلباء نے جیسا کہ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں، منظم ہو کر آڑے وقت میں مل وقوم کی خدمت کی ہے۔ تحریک پاکستان میں طلبہ کا بہت حصہ ہے۔ اس کی کامیابی کے لئے طلباء نے بہت کام کیا۔ انہوں نے قریہ قریہ پہنچ کر مسلمانوں کو پاکستان کی اہمیت سے آگاہ کیا اور انہیں بھی مطالبہ پاکستان منوانے میں مستعد کیا اور خود بھی قربانیاں دیں۔ ۱۹۴۷ء میں مہاجرین کی آبادکاری میں طلبہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مہاجرین کا ایک بہت بڑا سیلاب تھا جسے سنبھالنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ ان میں بھوکے بھی تھے، بیمار بھی تھے، بچے بھی تھے، بوڑھے بھی تھے۔ ان سب کی آبادکاری میں طلبہ نے حکومت کا ہاتھ بٹایا۔ پھر سیلاب آیا تو اس وقت بھی طالب علموں نے سیلاب زدہ لوگوں کی چارہ گری میں معاونت کی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء اور دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھی سب سے زیادہ طلبہ نے ہی زخمی فوجیوں کو خون کے عطیات دیئے۔ اس طرح سے طلبہ ملک کی متاع بے بہا ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے جوش شباب سے کام لیا جائے۔ ان پر توجہ دی جائے اور ان کے حب وطن کے جذبے کو ابھار کر ان کے لئے لائحہ عمل متعین کیا جائے۔ اگر ایسا کر لیا جائے تو وہ اعلیٰ کردار کے مالک بن کر ملک وقوم کے لئے عظیم سرمایہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ ہماری رہنمائی پر منحصر ہے کہ ہم انہیں کس راہ پر چلاتے ہیں۔ اگر ہم انہیں سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں تو ان کا قیمتی وقت اور مستقبل ہمیشہ کے لئے ضائع ہو جائے گا اور قوم انمول موتیوں سے محروم ہو جائے گی اور اگر ہم ان کو اسی راہ پر چلائیں گے جس سے وہ اپنا تعلیمی مقدس فریضہ احسن طریقہ سے انجام دے سکیں تو وہ ملک کے لئے ذریعہ استحکام اور ذریعہ خدمت عوام ثابت ہوں گے۔

پاکستان میں لازمی فوجی تربیت

ہر دور کا طریقہ جنگ علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جنگ ایک مقررہ مقام تک لڑی جاتی تھی وہیں پر ہار جیت کا فیصلہ ہوتا تھا مگر آج ایسا نہیں ہے۔ جنگ شہروں کے گلی کوچوں میں بھی لڑی جاتی ہے اور مل کے ایک ایک انچ کے فاصلے پر اور ایک ایک انچ کے لئے لڑی جاتی ہے۔ اسی طرح سے ہر دور کی ضرورت الگ الگ ہوتی ہے۔ حالات میں فرق ہوتا ہے۔ آج کا دور افراتفری کا دور ہے۔ اقوام عالم کے مادی مفادات کی کشمکش اور مہلک ہتھیاروں کی نئی نئی ایجادات نے پوری دنیا کو جنگی خطرات کی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

روز ازل سے ہی طاقت کمزوری پر حاوی ہو جاتی ہے اور بڑا چھوٹے کو کھا جاتا ہے۔ بڑے ممالک چھوٹے ملکوں کے وسائل دولت کی وجہ سے انہیں حریصانہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ بڑی طاقتیں ایٹمی سامان حرب پر پابندیاں لگانے کی تجاویز پیش بھی کر رہی ہیں اور مہلک تر ہتھیار بھی تیار کئے جا رہے ہیں۔ یہ ملک گویا کہہ کچھ رہے ہیں اور کر کچھ رہے ہیں یعنی کھلی منافقت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ وہ خلوص دل سے نہیں چاہتے صرف ایک دوسرے کو دھوکے میں رکھنے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ ان کے اندر ہوس، ملک گیری اور توسیع پسندی ہے۔ اسی لئے ہر ملک کی حفاظت کرنے کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ اعلیٰ تربیت یافتہ فوج دفاع وطن کے لئے ہر وقت تیار رکھی جائے۔ طاقت ہی آج کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور کمزوری موت ہے۔ اس کی علامہ

اقبالؒ نے اس طرح وضاحت کی ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

پاکستان کے مخصوص جغرافیائی حالات اور تاریخی تقاضوں کے پیش نظر ہمارے لئے اور بھی ضروری ہوگیا ہے کہ یہاں پر ہر بالغ فرد کے لئے فوجی تربیت لازمی قرار دی جائے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ روس، فرانس، اٹلی اور چین نے تو اپنے اپنے ملکوں میں لازمی فوجی تربیت کا نظام رائج کر رکھا ہے۔ ہمارے لئے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ پاکستان میں لازمی فوجی تربیت دی جائے۔ ہندوستان نے آج تک دل سے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کسی نہ کسی بہانے پاکستان کو نقصان پہنچائے بلکہ وہ تو پاکستان کو ختم کرنے کے منصوبے تیار کرتا رہتا ہے جو اس کی کمینگی کی انتہا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں اس نے پاکستان پر حملہ کیا لیکن اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں اس نے روس کی ملی بھگت سے ہمارا مل دولخت کر کے ہم سے مشرقی پاکستان علیحدہ کروایا۔ یہ ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ اس کے بعد بھی وہ پاکستان کو ختم کرنے کے لئے سکیمیں بناتا رہتا ہے۔ ابھی مسئلہ کشمیر باقی ہے۔ اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں پیش کیا گیا۔ لیکن وہ بھی ان کے لئے کچھ کرتی ہے جو اس سے طاقت کے بل بوتے پر کروا لیتے ہیں۔ کمزور ممالک کے لئے وہ بھی کچھ مفید ثابت نہیں ہوئی۔ مسئلہ فلسطین اور دیگر مسائل بھی حل طلب پڑے ہیں۔ گویا

طاقت ہی ایک ایسی چیز ہے جو سارے مسائل حل کر دیتی ہے یا کروا لیتی ہے۔

فوجی تربیت ہر بالغ مرد اور عورت کو حاصل کرنا چاہیے۔ سکولوں اور کالجوں میں فوجی تربیت کا خاص انتظام ہونا چاہیے۔ سرکاری اور غیر سرکاری افراد کو باقاعدہ تربیت دی جانی چاہیے۔ ہوائی حملے کے دفاع میں بھی ہر بالغ مرد اور عورت کو تربیت یافتہ ہونا چاہیے تاکہ ہنگامی حالات میں شہروں میں افراتفری نہ پھیلے اور دشمن سے جنگ پوری مستعدی کے ساتھ جاری رکھی جا سکے۔ آج کل پہلے سے حالات بھی نہیں ہیں کہ جنگ کے دنوں میں فیصلہ ہو جایا کرتا تھا۔ آج کل تو جنگ سالوں تک چلتی ہے۔ لازمی فوجی تربیت کا نفسیاتی فائدہ بھی ہوتا ہے کہ جس آدمی نے اپنے آپ کو لڑائی کے لئے تیار کیا ہوا ہوتا ہے وہ جنگ سے گھبراتا نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر لڑنے کے لئے تیار کیا ہوا ہوتا ہے اور جس نے تربیت ہی حاصل نہیں کی اور ہتھیار پکڑ کر ہی نہیں دیکھا وہ تو لڑائی کا نام سن کر ہی حواس باختہ ہو جائے گا۔

لازمی فوجی تربیت نہ صرف زمانہ جنگ کے لئے ضروری ہے بلکہ زمانہ امن میں بھی اس کے فوائد ہیں۔ اس سے قوم متحد ہو جاتی ہے اس میں نظم و ضبط پیدا ہو جاتا ہے۔ ایثار کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ شہری صحت مند ہو جاتے ہیں۔ بیماریاں کم ہو جاتی ہیں کیونکہ لوگ مشقت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اطاعت امیر کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں پہلے ہی شہری دفاع کا محکمہ قائم ہے۔ باقاعدہ ٹریننگ سنٹر کھلے

ہوئے ہیں۔سکولوں کالجوں میں لیکچر دیئے جاتے ہیں۔دفاع سے متعلقہ مشقیں بھی کرائی جاتی ہیں بلیک آؤٹ کی مشقیں بھی کرائی جاتی ہیں اور شہروں میں ڈیفنس پوسٹیں قائم ہیں۔سول ڈیفنس اپنی جگہ پر ہے مگر لازمی فوجی تربیت کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے۔بین الاقوامی حالات کا تقاضا ہے کہ ہمارے ملک میں لازمی فوجی تربیت بھی رائج ہونی چاہیے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

اطاعت والدین

ماں باپ سی نعمت کوئی دنیا میں نہیں ہے
حاصل ہو یہ نعمت تو جہاں خلد بریں ہے

والدین دنیا کی سب سے بڑی نعمت بلکہ بے بدل نعمت ہیں۔ والدین کے اولاد پر اس قدر احسانات ہوتے ہیں کہ انسان شب و روز والدین کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے پھر بھی ان کے گراں قدر احسانات کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ والدین خود بھوکے رہ کر بھی کوشش کرتے ہیں کہ اولاد پیٹ بھر کر کھالے۔ وہ اپنے آرام کی پروا نہیں کرتے مگر انہیں تکلیف نہیں ہونے دیتے۔ وہ اولاد کے آرام و راحت کے لئے دن کا چین، رات کا آرام اور دن کا سکون قربان کر دیتے ہیں۔ اس لئے اولاد کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ والدین کی ہر ممکن خدمت کرے اور ان کا حد درجہ احترام کرے۔

دنیا کے ہر مذہب میں والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری اور ان کی خدمت کا حکم دیا گیا ہے۔ ہم جس مذہب کے ماننے والے ہیں اس کی تعلیم بھی یہی ہے کہ والدین کی خدمت کرو، ان کے قدموں میں جنت کی ہے۔ ہمارا مذہب اس اولاد کو بدقسمت، شقی القلب اور گمراہ کن قرار دیتا ہے جو اپنے والدین کی قدر و منزلت نہیں کرتی۔ اولاد کے لئے تو یہاں تک حکم ہے کہ ان کی آواز ان کے والدین کے برابر بھی نہ ہو بلکہ ان کی آواز سے نیچی ہو چہ جائے کہ والدین سے سرکشی اور نافرمانی کی جائے۔ والدین کی دعائیں اولاد کے لئے دین و دنیا میں توشہ خیر

ثابت ہوتی ہیں۔خوش قسمت ہیں وہ بچے جو اپنے ماں باپ کی خدمت کرتے ہیں اوران سے دعائیں لیتے ہیں۔یہ دعائیں آخرت تک ان کی راحت کا موجب بنتی ہیں۔یہ پتہ اس وقت لگتا ہے جب اولاد خود صاحب اولاد ہوتی ہے کہ بچے کس طرح پلتے ہیں اور کتنی محنت اور محبت سے انہیں پروان چڑھایا جاتا ہے۔ساری عمر کی کمائی ان پر لگ جاتی ہے۔محنت کر کے والدین کے بال سفید ہو جاتے ہیں۔ اعضاء کمزور ہو جاتے ہیں۔اس وقت اولاد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح بچہ چل نہ سکتا تھا تو اسے سہارے کی ضرورت تھی۔اسی طرح بڑھاپے میں ماں باپ کو اولاد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔والدین کی دعائیں اللہ کے حضور مستجاب ہوتی ہیں اوران کی ناراضگی غضب الٰہی بن جاتی ہے۔

آج کا زمانہ جسے ہم ترقی یافتہ کہتے ہیں اتنا آگے بڑھ گیا ہے کہ وہ پرانی اخلاقی قدروں کو طاق نسیاں پر رکھتا جا رہا ہے۔لوگ اس لئے ان قدروں پر عمل نہیں کرتے کہ وہ ان کے بقول دقیانوسی ہیں۔حالانکہ ان ہی قدروں میں ان کی دینی اور دنیوی بہتری کے سامان پوشیدہ ہیں اور آج کل کی اولاد کی یہ سوچ بالکل غلط اور عذاب الٰہی کو دعوت دیتی ہے کہ والدین کی اطاعت ایک پرانی بات ہے۔وہ ہمارے کام کے نہیں رہے۔ان کے اعضاء اور قواء کمزور ہو چکے ہیں۔ہم کماتے ہیں اور یہ ہمیں بات بات پر ٹوکتے ہیں۔بہتر ہے انہیں گھر سے نکال باہر کیا جائے۔اس زمانے میں ایسے بیٹے بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ اپنے سادہ لوح والد کو والد ماننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں اور لوگوں کو کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارا ہمسایہ یا نوکر تھا۔خدا

غارت کرے ایسے نا ہنجار بیٹوں کو۔ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک دن آئے گا جب ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوگا۔ یہ وہی باپ ہے جس نے اسے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا، جوان کیا، ملازمت دلوائی اور آج دفتر میں اپنی جھوٹی پوزیشن بنانے کو کہتا ہے کہ یہ میرا باپ نہیں ہے ہمسایہ یا نوکر ہے۔ تو ایسے لوگ اس ماں کو نوکرانی ہی کہیں گے جس نے محبت سے اپنی گود میں انہیں پالا راتوں کو ان کے لئے جاگتی رہی۔ اگر خدانخواستہ بچہ بیمار ہو جاتا تو اس کی جان پر بن جاتی تھی۔ وہ اسے حکیموں ڈاکٹروں کے پاس لئے لئے پھرتی تھی۔ وہ گیلی جگہ پر آپ سوتی تھی اور خشک جگہ پر اسے لٹاتی تھی۔ ہر وقت پیار سے اسے کھلاتی، پلاتی، نہلاتی، دھلاتی، سلاتی، جگاتی، گویا کہ وہ اسی کے لئے وقف تھی نہ اسے اپنے آرام کی پروا تھی نہ آسائش کی۔ یہی ماں وہ ماں ہے جس کے پیروں تلے جنت ہے۔

دنیا کا کوئی معاشرہ، کوئی دانشور، کوئی فلسفی کوئی سائنسدان والدین کے ادب و احترام سے منکر نہیں۔ خداوند عالم نے بھی قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور جب وہ بوڑھے ہو جائیں تو ان کے سامنے ''اف'' بھی نہ کرو اور انہیں نہ جھڑکو۔ سورۃ لقمان میں جہاں انسانوں کو خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کی تاکید ہے وہاں والدین کا شکرگزار رہنے کی تلقین بھی اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنے کی ہدایت ہے۔ رسولؐ خدا کی یہ حدیث ''کہ جنت ماں کے قدموں میں ہے۔'' نیز یہ کہ رب کی رضا باپ کی رضا میں ہے اور رب کی ناخوشی باپ کی ناخوشی میں ہے۔

جو شخص اپنے والدین کو خوش کرتا ہے خدا بھی اس سے خوش ہوتا ہے اور جو انہیں ناراض کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

روایت ہے کہ ایک صحابی نے یا رسولؐ خدا سے پوچھا کہ رسولؐ اللہ میں سب سے زیادہ کس کی خدمت کروں، آپؐ نے فرمایا اپنی ماں کی۔ صحابی نے دوبارہ دریافت کیا پھر کس کی آپؐ نے فرمایا اپنی ماں کی، تیسری بار بھی آپ نے یہی جواب دیا ''ماں کی'' صحابی نے پھر سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا اپنے باپ اور دوسرے رشتہ داروں کی۔

والدین آگے ہوں تو رہنمائی کرتے ہیں، پیچھے ہوں تو پشت پناہی کرتے ہیں۔ وہ حیات ہوں یا اس دنیا سے اٹھ گئے ہوں اولاد کے لئے سراپا دعا ہوتے ہیں۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے اپنے بیٹے جاوید اقبال سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اے بیٹے تجھے دینی بصیرت نصیب ہو جائے اور تو سعادت انسانیت سے بہرہ ور ہو جائے تو میں تیرے لئے قبر میں بھی دعا کروں گا۔

اے مرا تسکین جان ناشکیب
تو اگر از حفظ جاں گیری نصیب
سر دین مصطفیٰؐ گویم ترا
ہم بہ قبر اندر دعا گویم ترا

پس ہمارا یہ انسانی، اخلاقی اور دینی فرض ہے کہ اپنے والدین کی دل و جاں سے خدمت کریں اسی میں ہماری فلاح ہے۔

شہادت

شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

اسلام دین کامل ہے اور انسان کے لئے رہتی دنیا تک کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے۔ عالم حالات میں تو پر امن رہنے کی تلقین کرتا ہے مگر حق کی خاطر خدا کے دین کی خاطر، مادر وطن کی حرمت کی خاطر یا کسی مسلمان کی خاطر جو دشمن کے نرغے میں گھر گیا ہو یا کسی مظلوم کی مدد کی خاطر جہاد کا حکم بھی دیتا ہے۔ ایسے خاص حالات میں جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

جہاد کا فلسفہ ایسا فلسفہ ہے جو قوم کو زندگی بخشتا ہے، باعزت رہنے کے انداز سکھاتا ہے حق کی آبرو کو بچانا سکھاتا ہے۔ جب حالات انتہائی ناسازگار ہو جائیں تو جہاد ہی کے ذریعے باطل کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو ہر حالت میں جہاد میں حصہ لینے والا کامیابی ہی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ اگر وہ حق کی خاطر زندگی قربان کر دے تو شہید کہلاتا ہے اور اگر زندہ رہ جائے تو غازی بن جاتا ہے۔ جب کبھی دشمنوں سے مقابلہ ہو اور دشمن کثیر تعداد میں ہو اور طاقت میں بھی اپنے سے زیادہ ہو تو جذبہ جہاد ہی مسلمان کو دشمن سے ٹکرانے کی ہمت اور جرات بخشتا ہے۔ صرف جذبہ شہادت سے سرشار مجاہد ہی دشمن کے سامان حرب کی کثرت سے کبھی نہیں گھبراتا اور نہ ہی اس کی تعداد سے خوفزدہ ہوتا ہے اس لئے کہ اسے اپنے خدا پر بھروسہ ہوتا ہے۔ وہ صرف اور صرف یہی سمجھتا ہے کہ مجھے اپنا فرض پورا

کرنا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور فتح و نصرف اللہ ہی کی جانب سے ہے جو مدد کو ضرور پہنچے گا اور دشمنوں کے مقابلے میں مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔

تاریخ شاہد ہے کہ مجاہد کا مطلوب و مقصود صرف شہادت ہوتا ہے۔ وہ اپنے شہید ہونے والے ساتھیوں پر رشک کرتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے اور مجھے بھی ایک نہ ایک دن اس دنیا کو خیر باد کہنا ہی ہے۔ کیوں نہ آخرت کی دنیا کے لئے زادِ سفر ساتھ لے چلوں اور مرنے سے قبل زندگی میں کوئی ایسا کام کر جاؤں جس سے قربِ خداوندی بھی حاصل ہو جائے اور لوگوں کے لئے مثال بھی قائم ہو جائے۔ باعزت موت سے انسان کو ہمیشہ کی زندگی ملتی ہے۔ جسم فانی ہوتا ہے اور مٹی میں مل کر فنا ہو جاتا ہے مگر کردار کبھی نہیں مرتا، وہ زندہ رہتا ہے۔ اسی لئے جو لوگ راہِ خدا میں اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں زندہ جاوید ہو جاتے ہیں۔ ان کے نام تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔

منصبِ شہادت ایسا ہے کہ اس پر کوئی قسمت والا ہی فائز ہوتا ہے۔ جس قدر مجاہد کا مقصد بلند ہوتا ہے اسی قدر اس کا رتبہ شہادت بلند ہوتا ہے۔ جب ظلم و ستم حد سے بڑھ جائے، جب دشمن ساری اخلاقی قدروں کو پامال کر دے، جب عصمت و عفت خائن نگاہوں اور بے لگام ہاتھوں بے آبرو ہونے لگے، تو مسلمان اللہ کا نام لے کر اللہ کی خوشنودی کے لئے مظالم کے خلاف کفن بردوش میدان میں نکل آتا ہے۔ پھر زمانے کی کوئی طاقت اور وقت کی کوئی زیادتی اسے سرفروشی سے باز نہیں

رکھ سکتی ۔ جب تک ظلم کے بادل نہ چھٹ جائیں دین مبین محفوظ نہ ہو جائے اور عزت وعفت کو امان نہ مل جائے وہ اپنی تلوار میان میں نہیں رکھتا ۔

مسلمان باطل کے آگے جھکنا نہیں جانتا۔ وہ حق کے لئے سر کٹا لینا پسند کرتا ہے مگر باطل کے سامنے سر نہیں جھکاتا ۔ راہ حق راہ خدا ہوتی ہے ۔ اس راہ میں جہاد کرتے ہوئے جو زندہ رہا وہ غازی بنا اور جو کام آیا وہ شہید کہلایا ۔ رتبہ شہادت تمام مرتبوں سے اعلیٰ و ارفع ہے ۔ یہ وہ جذبہ ہے جس میں مسلمانوں کی حیات کا راز پنہاں ہے ۔ اسلام میں دوسرے مذاہب کی نسبت ایک خاص صفت یہ ہے کہ اس نے جذبہ جہاد کو ہر کٹھن وقت کے لئے عقدہ کشا قرار دیا ہے ۔ طلوع اسلام سے آج تک مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ موجود رہا ہے اور قیامت تک موجود رہے گا ۔ مسلمانوں کے اسی جذبہ سے بڑے بڑے شہنشاہوں کو شکست ہوئی اور بڑے بڑے جابروں کو زوال نصیب ہوا ۔ غیر مذاہب کے اکابرین بھی مسلمانوں کے اس جذبہ کا اعتراف کرتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے مذاہب میں اس جذبہ کو پیدا کرنے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکے ۔ یہ صرف مسلمانوں ہی کا مقدر ہے ۔ لافانی اور لاثانی اسی جذبے کا نتیجہ ہے کہ مسلمان موت سے نہیں گھبراتا اور اس رستے میں موت کو بھی حیات دائمی سمجھتا ہے ۔ کسی نے بالکل صحیح کہا ہے ۔

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

مسلمان کا منشاء و مقصود مال غنیمت اور کشور کشائی نہیں ہوتا ۔ وہ اس لئے اپنا خون بہاتا ہے کہ انسانیت کو سکون ملے ۔ اخلاق کی قدروں کو فروغ ملے ۔ تہذیب

وتمدن کے حوالے سے دنیا میں بہتری کے سامان پیدا ہوں۔عصمت وعفت محفوظ رہے۔حق و انصاف کا بول بالا ہو۔ظلمت کدوں میں ضیائے نور سے روشنی ہو جائے۔

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے فاتح آئے انہوں نے زور شمشیر سے اپنی کشور کشائی کی پیاس بجھائی۔اس کے برعکس مسلمان جب بھی اٹھا حق کے لئے اٹھا اور وہ جدھر بھی گیا ظلم وستم کے لئے نشتر بن کر اور صلح واخوت کا پیغام لے کر گیا۔وہ عورتوں کی عزت کا پاسبان بنا۔اس نے بچوں اور معذوروں کو شفقت بخشی۔مسلمانوں نے تو غیر مذاہب کے لوگوں کو بھی پوری آزادی دی بلکہ ان کے مال ومتاع اور ان کی املاک کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اپنے کندھوں پر اٹھائی۔ بیٹی چاہے اس کی اپنی ہو یا غیر مذہب کی ہو مسلمان دونوں کا یکساں احترام کرتا ہے وہ کرسی عدالت پر بیٹھ کر مسلم وغیر مسلم میں سب کے لئے یکساں عدل و انصاف کرتا ہے۔الغرض جذبہ شہادت مسلمان کی متاع حیات ہے۔

حسن اخلاق

کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ موسیقی جادو اثر ہوتی ہے مگر اس کا اثر محدود وقت کے لئے ہوتا ہے۔ حسن کا جادو بھی خوب چلتا ہے مگر خود حسن ہی پائیدار نہیں ہوتا، اس لئے اس کا اثر بھی پائیدار نہیں ہوتا۔ صرف اخلاق کا جادو ایسا ہے جو دیرپا بلکہ مستقل ہے جس کا اثر تاحیات رہتا ہے۔ اخلاق کا جادو اس قدر گہرا اثر رکھتا ہے کہ انسان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہر پیغمبر نے دنیا کو اخلاق سکھایا مگر پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو اخلاق انسانوں کو سکھایا اور جس کا عملہ نمونہ خود دیا اس کی مثال روئے زمین پر نہیں مل سکتی۔ حضورؐ مقبول کا اخلاق سب نبیوں سے اعلیٰ اور ارفع تھا۔ ان کا اخلاق اتنا بلند تھا کہ جس پر بھی نظر کرم ڈالتے تھے وہ آپؐ کا گرویدہ ہو جاتا تھا اور ساری عمر کے لئے آپؐ کا غلام ہو کر رہ جاتا تھا چاہے اس راہ میں اسے کتنی ہی سخت سے سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔

ایک بوھی عورت کا قصہ مشہور ہے۔ وہ ہر روز آپؐ پر کوڑا کرکٹ پھینکا کرتی تھی۔ ایک حضورؐ اس کے مکان کے نیچے سے حسب معمول گزرے تو آپؐ پر کسی نے کوڑا نہ پھینکا تو آپؐ نے محلّہ والوں سے دریافت کیا کہ فلاں مائی خیریت سے تو ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ تو بیمار ہے۔ آپؐ یہ سنتے ہی اس کی تیمارداری کے لئے اس کے گھر چلے گئے۔ مائی نے دیکھا کہ یہ وہی شخص ہے جس پر میں روزانہ کوڑا پھینکا کرتی تھی مگر برا ماننے یا کچھ کہنے کی بجائے خاموشی اور شرافت سے

برداشت کر کے چلا جاتا تھا اور آج وہی میری تیمارداری کے لئے آ گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئی اور یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ یہ عام انسان نہیں واقعی خدا کا پیغمبر ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اس نے حضورؐ سے معافی مانگی اور آپؐ پر ایمان لے آئی۔ گویا یہ آپؐ کے اخلاق کا اثر تھا۔ اسی طرح کے بے شمار واقعات ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اخلاق انسان کی وہ صلاحیت ہے جس سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے اور اگر انسانیت میں سے اخلاق کی صفت نکال لی جائے تو باقی صرف حیوانیت رہ جاتی ہے۔

لفظ اخلاق خلق کی جمع ہے۔ خلق اس فضیلت انسانی کا نام ہے جس کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ البتہ حسن خلق اس نفسیاتی کیفیت کو کہتے ہیں جو امور باطنہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس فضیلت کا وجود کسی انسان میں اس کے آثار و ثمرات ہی سے ظاہر ہوسکتا ہے۔ باطن کی اس روشنی کا عکس انسان کے ظاہری برتاؤ اور سلوک ہی سے معلوم ہوسکتا ہے۔ حسن اخلاق میں بہت سی صفات شامل ہیں مثلاً صدق، صبر، حیاء، تواضع، حلم، ایفائے عہد، عیب پوشی، غیرت، نکوکاری، شجاعت، عفت، حکمت، عدل اخوت، رحم، شفقت وغیرہ وغیرہ۔ اخلاق کی فضیلتوں کا ذکر کرنے کے لئے نہ صرف ایک کتاب بھی ناکافی ہے بلکہ اس کا ذکر کرنے کے لئے حوالوں کی خاطر بھی ایک نہیں بے شمار کتابیں درکار ہوں گی۔ چند اقوال ملاحظہ ہوں۔

''مخلوق خدا کو خوشی اور مصیبت دونوں حالتوں میں راضی اور پسندیدہ خاطر

رکھنا حسن خلق ہے۔''

''ہر حالت میں اللہ عزوجل کی رضا جوئی حسن خلق ہے۔''

''حسن خلق کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان میں قوت برداشت ہو اور وہ انتقام کے کبھی درپے نہ ہو، دشمن پر بھی رحمت وشفقت کی نظر ہو، اور اس کے ظلم پر خدا سے اس کی مغفرت کا طالب ہو۔''

''چار چیزیں حسن خلق ہیں سخاوت، الفت، خیر خواہی اور شفقت۔''

''خلق عظیم، جود وکرم، درگذر، عفو اور احسان کے مجموعہ کا نام ہے۔''

''فرائض کی انجام دہی کا دوسرا نام اخلاق ہے۔''

حسن اخلاق کے متعلق جگہ جگہ پر قرآن عزیز میں اللہ تعالیٰ کے احکام موجود ہیں۔ اسی طرح سے مجسمہ اخلاق، سرور کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی بار بار حسن اخلاق کی تلقین فرمائی ہے اور خود اپنی مثال سے رہتی دنیا کے لئے حسن اخلاق کا بے مثال نمونہ چھوڑا۔ ہمیں چاہیے کہ آپؐ کی سیرت کا مطالعہ کریں اور اپنے اخلاق کو سنوارنے کی کوشش کریں۔

صدق کے متعلق آپؐ فرماتے ہیں ''بلا شبہ سچائی بھلائی کی جانب راہنمائی کرتی ہے اور بھلائی جنت کی راہ دکھاتی ہے۔'' حضرت علیؓ کا قول ہے ''صبر ایسی سواری ہے جس سے گرنے کا کبھی اندیشہ نہیں ہوتا۔'' حدیث شریف میں آتا ہے کہ حیاء ایمان کی شاخ ہے۔ حیاء خیر کے علاوہ دوسری کوئی چیز نہیں دیتی۔

ایک جگہ حضورؐ کا ارشاد مبارکہ ہے۔ ''جب تو اپنے دشمن پر انتقام کی قدرت

رکھتا ہو تو اس قدرت کے شکریہ میں تو انتقام سے درگذر کر اور اس کو معاف کر دے۔'' یہ کیفیت انسان میں وسعت ظرف پیدا کر دیتی ہے۔ احنف بن قیس کہا کرتے تھے کہ جو شخص میرے ساتھ عداوت رکھتا ہے میں اس کے بارے میں تین باتوں میں سے ایک بات اختیار کر لیتا ہوں۔ وہ اگر مجھ سے بلند رتبہ ہے تو میں اس کی برتری کا اعتراف کرتا ہوں اور اس کی قدر کا اظہار کرتا ہوں اس لئے کہ یہی حق ہے اور حق سے گریز بداخلاقی ہے اور اگر وہ مجھ سے کمتر ہے تو میں اس کے مقابلے میں حلم اختیار کرتا ہوں اور اگر وہ میرے برابر ہے تو میں اس کے اس طرز عمل کے مقابلہ میں خود کو بالاتر بنالیتا ہوں اور برائی کو جواب برائی سے نہیں دیتا۔ گویا برائی کا جواب برائی سے دینا بھی بداخلاقی ہے۔ یاد رہے کہ علم الاخلاق میں حسد، تعصب، کبر، عیب جوئی، سود وغیرہ امراض اخلاق ہیں۔ ان سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

قناعت

انسان اچھی بری مختلف قسم کی صفات رکھتے ہیں ۔ عام طور پر اچھائیاں اور برائیاں ہر آدمی میں موجود ہوتی ہیں ۔کوئی شخص اچھے اخلاق کا مالک ہوتا ہے اور کوئی برے اخلاق کا ۔ آدمی میں جو صفات دوسری صفات پر غالب آ جائیں وہ اسی قسم کا آدمی کہلاتا ہے ۔ مثلاً ایک آدمی میں برائیوں کی نسبت اچھائیاں بہت زیادہ ہیں تو اس کی برائیاں اچھائیوں سے مغلوب ہو جاتی ہیں ۔ اسے ہم اچھا انسان کہیں گے اور اگر اس کی برائیاں اچھائیوں پر غالب آ جائیں تو ہم اسے برا انسان کہیں گے ۔ اچھی صفات کے مالک انسان کو خوش اخلاق کے نام سے پکاریں گے اور جس میں برائیاں زیادہ ہوں گی اسے ہم بد اخلاق کہیں گے ۔ علم الاخلاق میں قناعت صبر کے تحت آتی ہے ۔ گویا قناعت صبر کی ایک قسم ہے ۔ اگر کوئی شخص نفسانی خواہشات کے مقابلے میں صبر کرتا ہے ۔ تو اسے عفت کہتے ہیں ۔ اگر مصائب کے مقابلے میں صبر کرتا ہے تو اسے قوت برداشت کہتے ہیں ۔ طاقت اور امارت کے باوجود تحمل ، بردباری کا نام ضبط نفس ہے ۔ میدان جنگ میں تحمل بردباری اور برداشت کو سخاوت کہتے ہیں ۔ غصے پر قابو پانے کا نام حلم ہے ۔ مصائب کا مقابلہ کرنے کو حوصلہ کہتے ہیں ۔ فضول عیش پسندی سے اجتناب کرنے کو زہد کہتے ہیں اور کم از کم لذائذ پر راضی رہنا اور شکوہ نہ کرنا قناعت کہلاتا ہے ۔ اس کی ضد طمع ہے ۔

کئی لوگ قناعت کو ترقی کی نشوونما کے لئے ایک رکاوٹ سمجھنے لگ جاتے

ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ انسان قناعت کر کے بیٹھ جائے تو وہ ترقی نہیں کر سکے گا۔یہ ان کی غلط فہمی ہے۔انہوں نے قناعت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔اصل میں فلسفہ قناعت یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جب اس دنیا میں بھیجا تو اس کے اطمینان و سکون کے لئے کچھ ایسے اصول وضع کر دیئے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے اگر وہ مصائب اور مشکلات میں مبتلا ہو جائے تو ان اصولوں پر عمل کر کے ان سے چھٹکارا پا سکے اور سکون سے زندگی گزار سکے۔قناعت کی تعریف یہ ہے کہ کم از کم نعمتوں پر بھی اللہ کی رضا پر راضی رہنا اور نعمتوں کی کمی کے باوجود شکوہ نہ کرنا قناعت ہے۔ کون کہتا ہے کہ انسان اپنی ترقی کے لئے کوشاں نہ ہو۔اپنی ترقی کے لئے تجارت کو نہ بڑھائے۔اپنی ترقی کے لئے تجسس نہ کرے۔قناعت یہ ہے کہ جیسے بھی حالات ہوں انسان ان حالات سے سمجھوتہ کرے اور اپنے دل و دماغ پر بوجھ نہ ڈالے اور نہ ہی دوسروں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہے۔مثلاً وہ یہ نہ سوچے کہ فلاں آدمی کے پاس کوٹھیاں ہیں، کاریں ہیں، میرے پاس نہیں ہیں۔وہ یہ سوچتے سوچتے پاگل نہ ہو جائے اور اپنا سکون نہ کھو بیٹھے اور ایسے غلط کام نہ کر بیٹھے جن میں اسے تکلیف ہو بلکہ وہ اپنی موجودہ حالت کو اللہ تعالیٰ کی رضا جان کر بخوشی قبول کرے اور سمجھ لے کہ مجھے انہی حالات میں رہ کر فی الحال گزارہ کرنا ہے۔وہ جان لے مجھے کہ کوشش کو جو میرا فرض ہے جاری رکھنا ہے کیونکہ جس خدا نے مجھے یہ کچھ دیا ہے اگر میں کوشش کروں گا تو وہ انشاء اللہ زیادہ بھی دے دیا کرے گا۔قناعت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لائے یا ترقی کے لئے مزید

کوشش نہ کرے۔ ترقی کرنے کے لئے کوشش کا اسے حکم بھی ہے اور یہ اس کا حق بھی ہے۔

بات تو صرف اتنی سی ہے کہ اگر ایک شخص اپنے موجودہ حالات پر مطمئن نہیں تو ایک تو اس کے دل و دماغ کو سکون میسر نہیں ہوگا۔ دوسرے وہ مایوسی اور پریشانی کے سبب ایسے ذرائع اختیار کرے گا جو غلط ہوں گے۔ ان کے اختیار کرنے میں اسے خود بھی تکلیف ہوگی اور ممکن ہے کہ اس میں دوسروں کی حق تلفی بھی ہو جائے۔ لہٰذا تاکید قناعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے موجودہ حالات پر مطمئن رہے اور خدا سے شکوہ نہ کرے اور مزید ترقی کے لئے کوشش کرتا رہے۔ جب وہ اپنے موجودہ حالات پر مطمئن اور اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوگا تو یہ عین رضائے خداوندی کے مطابق ہوگا۔ جب وہ قانون خداوندی کے تحت آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہوگا تو اپنی ترقی کے لئے ایسے ذرائع کبھی اختیار نہیں کرے گا جن کے اختیار کرنے میں دوسروں کی حق تلفی ہو یا اسے ذہنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔

قانع کبھی پریشان، مایوس اور ناامید نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ مطمئن رہتا ہے۔ قناعت خوشی، تسلی، اطمینان اور راحت کا سرچشمہ ہے۔ قانع خود بھی خوش رہتا ہے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتا ہے۔ اس کے لئے مسرت و خوشی کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ قانع کا دل حسد، کینہ اور تکبر سے پاک ہوتا ہے۔ وہ مطمئن اور خوش رہتا ہے۔ اس کا حوصلہ بلند اور ارادہ مصمم ہوتا ہے۔ وہ زندگی میں اچھے برے حالات کا مقابلہ ہنسی خوشی کرتا ہے اور اچھے دنوں کی امید پر بغیر کسی شکوے کے اور

بغیر کسی کو نقصان پہنچائے بر اوقت گزار لیتا ہے۔ اس کے ایسے طرز عمل پر اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور انعام کے طور پر اس پر اپنا خاص فضل کرتا ہے اور اس کے برے دنوں کو اچھے دنوں میں بدل دیتا ہے۔

قانع ہر دل عزیز بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ دوستوں کا ہمدرد اور غمخوار ہوتا ہے۔ عجز و انکسار و غمگساری اس کا شیوہ ہوتا ہے۔ شکر گزاری اس کی عادت بن جاتی ہے۔ وہ دوسروں کے مال و دولت کو دیکھ کر حسد نہیں کرتا۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے دیا ہوا ہوتا ہے وہ اس پر مطمئن ہوتا ہے۔ اس کے لب پر کبھی شکوہ نہیں آتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر خدا مجھے یہ بھی نہ دیتا تو میں کیا کر سکتا تھا۔ بجائے اس کے کہ میں خدا کا شکوہ کروں یا دوسروں سے حسد کروں مجھے کوشش کرنا چاہیے کہ ہمت اور کوشش سے خود ترقی کروں۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے اور انہیں صبر کا انعام ضرور عطا فرماتا ہے۔

اتحاد و اتفاق

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اتحاد کے معنی آپس میں متحد اور اکٹھے ہو کر زندگی بسر کرنے کے ہیں۔ یوں اتحاد ایک چھوٹا سا لفظ ہے مگر یہ لفظ اتنا جامع ہے کہ اس کے اندر معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ انفرادی قوت، فکری قوت، معاشرتی قوت، اقتصادی قوت، ایمانی قوت اور سائنسی قوت اسی طرح کی تمام قوتوں میں یکجہتی ہو تو پھر اتحاد مکمل ہوتا ہے اگر تمام انسانی قوتوں اور صلاحیتوں میں مطابقت اور افکار و کردار اور قول و فعل میں کسی قسم کا تضاد نہ رہے تو اتحاد کی بدولت بہتر فضا پیدا ہو سکتی ہے البتہ اگر اختلاف رائے اصلاح کی غرض سے ہو تو اسے نفاق نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ اس میں بد نیتی نہیں بلکہ غلط کو درست کرنے کی نیت ہوتی ہے۔

قومی اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ پوری قوم کے افراد ایک ہو جائیں اور زندگی کے کسی شعبے میں ان میں تفریق نہ پائی جائے۔ یہاں تک کہ ایک قوم کے تمام افراد کے بنیادی عقائد و نظریات بھی میں بھی یکجہتی ہو اور وہ دوسرے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو جنہیں فروعی اختلافات کہا جا سکتا ہے نظر انداز کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔ اگر کسی ایک شعبے میں اتحاد اور دوسرے میں اختلاف ہے تو اس اتحاد کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اسے نفاق ہی کہا جائے گا۔ قوم باہمی ربط سے بنتی ہے۔ اگر اس کے افراد میں اتحاد نہیں تو دوسرے لفظوں میں ان میں ابھی ربط ہی نہیں۔

قوم ایک سمندر ہوتا ہے اور افراد اس کے قطرے ہوتے ہیں۔ اگر ان میں نفاق ہو تو وہ قطرے کہلائیں گے اور اکٹھے ہو جائیں گے تو سمندر کہلائیں گے۔ اتفاق اور نفاق کی طاقت کا موازنہ قطرے اور سمندر کی طاقت سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ آج تک جس قوم یا ملک نے ترقی کی ہے اس کی بنیاد اتحاد اور اتفاق ہی رہی ہے۔ اگر کسی ملک میں بڑے بڑے ذہین اور کامیاب سائنسدان ہوں اس کے پاس سامان حرب بھی بافراط ہو، اس کے جرنیل بھی تجربہ کار اور جنگجو ہوں اس میں بڑے بڑے علماء و فضلاء بھی موجود ہوں اور اس کے پاس بری، بحری اور ہوائی قوتیں بھی ہوں مگر قوم میں اتفاق یا اتحاد نہ ہو تو یہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں بیکار بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ قوم کا نفاق اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود اپنے ملک کو ترقی دینے کی بجائے اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا کیونکہ اتحاد تعمیری نشوونما کا باعث بنتا ہے اور نفاق تخریب کا سبب بنتا ہے۔

نا اتفاقی اور باہمی عداوت جو اتحاد کی ضد ہیں قوم کو اور اس کے افراد کو زیاں اور بدبختی کی طرف لے جاتی ہیں۔ مشکل سے مشکل کام کو انسان اکٹھے ہو کر کریں تو وہ نفسیاتی طور پر ان کے لئے مشکل نہیں رہتا اور نہ انہیں اس میں ناکامی ہوتی ہے۔ اتحاد کی حرارت سخت سے سخت چیز کو بھی موم کی طرح پگھلا دیتی ہے۔ اتحاد سے انسان کے اندر ایک خاص قسم کا تعمیری جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو دلوں میں حوصلہ اور ہمت کو بڑھاتا ہے۔ آدمی جب دیکھتا ہے کہ میرے دائیں بائیں، آگے اور پیچھے سب لوگ یک زبان ہیں اور متحد ہو کر پہاڑ کے سینے پر تیشہ چلا رہے ہیں تو جو

ولولہ اس منظر سے پیدا ہوتا ہے وہ دلوں کو مزید گرماتا ہے اور ہمت کو کئی گنا بڑھاتا چلا جاتا ہے جس سے کمزور آدمی کے اندر بھی طاقت آ جاتی ہے۔ اتحاد طاقتور اور کمزور سب کی طاقت مل کر ایک بن جاتی ہے اور پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو کر ان باہمت اور متحدہ لوگوں کے پیروں تلے ہوتا ہے۔

ملک میں کاشتکار بھی ہوتے ہیں تاجر بھی ہوتے ہیں صنعت کار بھی ہوتے ہیں۔ مزدور بھی ہوتے ہیں، دانشور بھی ہوتے ہیں، قانون دان بھی ہوتے ہیں اور سائنسدان بھی ہوتے ہیں۔ گویا مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر ان میں قومی حوالے سے اتحاد آ جائے تو وہ انفرادی اور اجتماعی ہر اعتبار سے ملکی مفاد میں کام کر سکتے ہیں اور ملک کی خدمت کر سکتے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ تمام اپنے اپنے محاذ پر ملک کے لئے لڑ رہے ہیں۔ وہ جہاں جہاں پر بھی ہیں دوری کے باوجود متحد ہیں اور اتحاد کے صحیح معنوں میں داعی ہیں۔ اگر ان کا نظریہ ذاتی منفعت پر مبنی ہے تو وہ سب کے سب مرض نفاق میں مبتلا ہیں اور وہ ملک و قوم کے لئے ہرگز مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ قومیں افراد سے بنتی ہیں اور افراد کا کردار ہی مجموعی طور پر قوم کا کردار کہلاتا ہے۔

اگر کوئی شخص کوئی غلط کام کرتا ہے تو اس میں اس کی ذاتی منفعت ہوتی ہے۔ کوئی رشوت لیتا ہے یا دیتا ہے تو اس میں بھی اس کی اپنی خودغرضی ہی ہوتی ہے۔ دوسرے کو اس منفعت میں شامل کرنا تو درکنار وہ ان کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ بھی نفاق ہی کی ایک شکل ہے۔ اتحاد میں جذبہ ہمدردی بھی پایا جاتا ہے لیکن خودغرضی

مقصود ہو تو اتفاق و اتحاد ممکن نہیں۔ اصل میں ہمدردی، محبت، پیار، اتفاق اور اتحاد یہ سب ایک ہی پھول کی پتیاں ہیں۔ ان سب کا ملاپ پھول کو خوشنمائی بخشتا ہے جبکہ نفاق ان پتیوں کو منتشر کر کے پھول کو برباد کر دیتا ہے۔

اسلام اخوت کا درس دیتا ہے۔ ''اخوت'' کیا ہے؟ اخوت سے اتحاد و مساوات کا سبق ملتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں کو انسانیت کی شیرازہ بندی کے لئے بھیجا تھا تا کہ مسلمان ہندی ہوں یا پاکستانی، عربی ہوں یا عجمی، ایرانی ہوں یا عراقی، رومی ہوں یا افغانی، سب ایک ہی لڑی میں منسلک ہو جائیں۔ ان کی تمدنی، اخلاقی اور مذہبی زندگی میں ہم آہنگی و یک جہتی ہو۔ پانچوں وقت کی نماز مسجد میں پڑھنے کی فضیلت بھی اسی لئے ہے کہ لوگ مل کر عبادت بھی کریں اور مسائل کو اتحاد و اتفاق سے حل بھی کر سکیں۔ اگر قوم کے افراد میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور اخوت پیدا ہو جائے تو قوم خوشحال ہو گی اور ملک ترقی کرے گا کیونکہ خوشحالی، ترقی اور اقبال مندی کا دارومدار اتحاد و اتفاق پر ہی ہے۔

اتحاد و مساوات

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اقبالؒ

ترقی یافتہ قوموں میں اتحاد تو ہوتا ہی ہے کیونکہ بغیر اتحاد کے وہ ترقی کے زینہ پر کبھی چڑھ ہی نہیں سکتیں۔ لیکن یہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ سوائے مسلمانوں کے کسی قوم میں اتحاد اور مساوات یکجا ہوں۔ جب تک بندہ و آقا میں تمیز باقی ہے مساوات کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ بندہ و آقا میں تمیز ختم کرنے اور سب انسانوں کے برابر ہونے کا درس صرف اسلام ہی دیتا ہے۔

اسلام کے بہترین ضابطہ حیات ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں مساوات ہے جس کی تعلیم ہمیں ہمارے رسولؐ مقبول نے دی۔ ''کل مومن اخوۃ'' یعنی تمام مسلمان بھائی ہیں۔ ایک مسلمان امریکہ میں رہ رہا ہو یا پاکستان کا باشندہ ہو بلا امتیاز رنگ و نسل وہ دونوں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ گورے کو کالے یا عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ صرف تقویٰ ہی ایک ایسا معیار ہے جس سے کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔ ورنہ ایک انسان کی حیثیت سے محمود و ایاز ایک دوسرے کے برابر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اگر غلام پہلے آ کر اگلی صف میں کھڑا ہو گیا ہے اور بادشاہ بعد میں آتا ہے تو وہ غلام کو پیچھے نہیں بھیج سکتا۔ دونوں کی عبادت کا طریقہ ایک ہے جو پہلے دن سے حضورؐ نے مسلمانوں کے لئے

مقرر کیا ہے۔کوئی بھی شخص اپنے زہد وتقویٰ سے قرب الٰہی حاصل کرسکتا ہے۔یہ اس کی اپنی محنت اور ریاضت پر منحصر ہے۔امیر کے لئے بھی دن میں پانچ وقت کی نماز فرض ہے اور غریب پر بھی پانچ وقت کی۔امیر کو کوئی رعایت نہیں اور غریب سے کوئی ناانصافی نہیں۔

امیر کے لئے بھی سال بھر میں ایک ماہ کے روزے فرض ہیں اور غریب کے لئے بھی وہی ایک ماہ کے روزے ہیں۔دونوں کے لئے روزہ رکھنے کا وقت بھی ایک ہے اور کھولنے کا وقت بھی ایک ہے۔زکوٰۃ بھی ہر صاحب حیثیت کے لئے فرض کی گئی ہے سب کو ڈھائی فی صد ادا کرنا پڑتی ہے۔یہ نہیں کہ امریکہ میں رہنے والا کسی اور شرح سے زکوٰۃ دے اور پاکستان میں رہنے والے کے لئے شرح کوئی اور ہو اور یہی اصول فریضہ حج کے لئے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ادائیگی حج کا سب کے لئے ایک ہی طریقہ ہے مناسک حج میں پوری طرح سے یکسانیت ہے۔احرام باندھنے کا طریقہ بھی ایک ہے۔یہ نہیں کہ امیر کا لباس کچھ اور ہو اور غریب کا لباس کچھ اور ہو۔

اسلام کے بہت قلیل عرصے میں دور دراز تک پھیل جانے کی وجہ اسلامی جذبہ اخوت ہی تھا جس نے سب مسلمانوں کو بلا امتیاز رنگ ونسل ایک لڑی میں پرو دیا۔ایک بدو ایک سردار کے مقابلے میں بحیثیت مسلمان کے ایک ہی جیسے سلوک کا حقدار ٹھہرایا گیا۔آقا غلام میں کوئی فرق نہ رکھا گیا۔یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی ہیبت سے قیصر وکسریٰ کے محلات کانپتے تھے۔حالانکہ دشمنوں کے مقابلے میں ان

کے پاس سامان حرب بھی کم ہوتا تھا ان کے پاس اتحاد و مساوات اور ایمان کی دولت تھی جس سے وہ بڑے بڑے معرکے سر کرلیا کرتے تھے۔

مساوات کی مثالوں سے ہماری تاریخ بھری ہوئی ہے۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ ایک دفعہ عازم سفر ہوئے۔ کیا عالم تھا کہ امیر المومنین ہیں مگر کرتے پر پیوند لگے ہوئے ہیں۔ اونٹ پر سوار ہو کر جاتے ہیں۔ ایک منزل پر اونٹ کی رسی غلام کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور دوسری منزل پر غلام کو سوار کر کے رسی خود پکڑ کر اونٹ کے آگے آگے چل دیتے ہیں۔ اسی طرح باری باری تمام سفر طے ہوتا ہے۔ اتفاق سے جب وہ بیت المقدس کے نزدیک پہنچے تو سوار ہونے کی باری غلام کی تھی۔ چنانچہ جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو غلام اونٹ پر سوار تھا اور نکیل کی رسی عمر فاروقؓ نے پکڑی ہوئی تھی۔ غلام نے التجا بھی کی کہ آپ خلیفہ وقت ہیں شہر میں داخل ہونے کے وقت آپ سوار ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا نہیں تمہاری باری ہے۔ یہ اس خلیفہ کا ذکر ہے جس کے دبدبے سے سارا عرب کانپا کرتا تھا۔

اسی طرح سے حضرت علیؓ کا واقعہ ہے کہ آپ کو ایک شخص نے دیکھا کہ آپ سوکھی روٹی پانی میں بھگو بھگو کر کھا رہے ہیں۔ دیکھنے والا حیران تھا کہ یہ مسلمانوں کے جلیل القدر خلیفہ ہیں اور سوکھی روٹی کھا رہے ہیں وہ بھی پانی میں بھگو کر تو عرض کیا یا حضرت آپ اور سوکھی روٹی، تو فرمانے لگے کہ جب تک ایک شخص بھی ایسا ہے جس اس قسم کا کھانا کھاتا اور لباس پہنتا ہے تو نہ علیؓ اس سے بہتر کھا سکتا ہے اور نہ اس سے بہتر لباس پہن سکتا ہے۔

اسلام نے اخوت پر جس قدر زور دیا ہے دنیا کے کسی مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مسلمانوں کے علاوہ اخوت کی اتنی عملی مثالیں کہیں نہیں ملتیں۔ نسلی امتیازات کو اسلام میں کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ اس میں فلسفہ یہ ہے کہ جب تک امتیاز باقی رہے گا اتحاد قائم نہیں ہوسکتا۔ جب یہ امتیاز ختم ہو جاتا ہے تو اتحاد کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں جب اتحاد اور مساوات کی صفات پیدا ہو گئیں تو مسلمان بے تیغ بھی کامیاب و کامران ہوئے۔ ان کا جذبہ اخوت اور قوت ایمانی ان کی کامیابی کا سبب بن جاتا تھا۔

ہم بھی مسلمان ہیں مگر ہم میں اصول اخوت پر عمل کا فقدان ہے۔ لوگ محض حصول دولت کے لئے دوڑ لگا رہے ہیں اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لئے خود غرضی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ نفاق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب حق تلفی ہونا شروع ہو جائے۔ اگر ہم ایک دوسرے کے حقوق کی پاسبانی کریں گے اور کسی کی حق تلفی نہیں کریں گے تو اتحاد و مساوات کی قدریں خود بخود پروان چڑھتی چلی جائیں گی۔

ہمدردی

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

خواجہ میر درد

جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیج رہا ہوں تو اعتراض ہوا کہ باری تعالیٰ یہ فساد کرے گا تو خالق کائنات نے یہ نہیں کہا کہ یہ بہت عبادت گزار ہوگا، یہ بہت بڑا غازی ہوگا، یہ بہت بڑا نیک ہوگا، یہ بہت بڑا عابد ہوگا، یہ بڑا سخی ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ ''جو میرا بندہ ہوگا فساد نہیں کرے گا'' تو یہ تعریف کون کر رہا ہے؟ وہ صناع اعظم جو عالمین کو بنانے والا اور ان کا مالک ہے، جو عقل کل ہے، جو اتنا بڑا انجینئر ہے کہ اس کے مقابلے میں کسی انجینئر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور جو یہ بھی جانتا ہے کہ میں انسان کو زمین پر کس مقصد کے لئے بھیج رہا ہوں۔ وہ فرما رہا ہے کہ ''جو میرا بندہ ہوگا وہ فساد نہیں کرے گا۔'' گویا جو خدا کا بندہ ہے اس کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ پر امن ہوگا اور امن و سلامی کا ضامن ہوگا۔ اس کا تو مقصد تخلیق ہی فساد کی ضد ہے۔ امن اور سکون کا منبع ہمدردی ہے جس کے بغیر امن ممکن نہیں۔

کسی ملک، کسی خطہ یا کسی دور کا جب ذکر اس طرح آئے کہ وہاں پر امن و سکون ہے تو لازماً اس دور یا خطہ یا ملک سے تعلق رکھنے والوں سے ہمدردی ہوگی۔ اگر ہمدردی کی بجائے ان میں فساد، دشمنی، ظلم اور ناانصافی ہوں تو وہاں پر امن

وسکون کبھی نہیں رہ سکتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ فساد کو ہمدردی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ فساد کیا ہے چوری، لڑائی جھگڑا، دشمنی، غیبت، زنا، اغواء، قتل و غارت اور جب دلوں میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی پیدا ہو جائے تو نہ کوئی چوری کر سکتا ہے۔ نہ کوئی قتل ہو سکتا ہے اور نہ کسی سے دشمنی رہ سکتی ہے۔ کیونکہ ہمدردی ایک ایسی چیز ہے جو دلوں میں پیار اور محبت پیدا کر دیتی ہے، انسانوں میں جذبہ اخوت کو جگا دیتی ہے اور انہیں نیکوکاری کا احساس دلاتی ہے۔

آج تک کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ جس شخص کو کسی سے ہمدردی ہوا سے اس نے نقصان بھی پہنچایا ہو۔ یہ ناممکن ہے۔ ہمدردی اور پیار ہمیشہ خیر کے متقاضی ہوتے ہیں شر کے نہیں۔ جب دل میں خیر کا جذبہ ہو گا تو نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خلاق عالم کا منشاء تخلیق ہی یہی تھا کہ دنیا میں ہمدردی کے عمل کو بروئے کار لایا جائے۔

ذرا اور آگے چلئے۔ تخلیق آدم ہو چکی۔ اس کو خدا تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بھی بنا کر بھیج دیا اور اشرف المخلوقات کے اعلیٰ منصب پر بھی فائز کر دیا اور وہیں سے سلسلہ نسل شروع ہوا تو کیا یہ سب انسان اسی آدم کی اولاد نہیں؟ کیا ہم آپس میں بھائی بھائی نہیں؟ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم واقعی ایک ہی باپ آدم کی اولاد ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ یا نائب بنا کے بھیجا ہے تو اسے کچھ اختیارات اور کچھ صلاحیتیں بھی اپنے میں سے دی ہیں۔ جو صلاحیتیں معبودیت

سے تعلق رکھتی ہیں اور صرف اسی کو زیب دیتی ہیں مثلاً واحد ہونا، معبود ہونا، باقی، متکبر، حی القیام ہونا وغیرہ اس نے اپنے پاس رکھ لیں اور اس کے علاوہ دوسری صفات جن پر عمل کر کے بطور نائب فرائض انجام دینے تھے وہ انسان کو بھی دے دیں مثلاً فکر، عقل، عمل، حب، انس، عرفان، وغیرہ جس شخص میں تفکر ہو اور حب بھی ہو اور عرفان بھی ہو۔ تو وہ اپنے بھائی کے لئے کیا فیصلہ کرے گا۔ اسے اپنے بھائی کے لئے آمادۂ فساد ہونا چاہیے یا اس سے ہمدردی کرنی چاہیے۔ انسان تو انسان ایک جانور یعنی بیل کے آگے گھاس ڈال دیں تو وہ پہچان لیتا ہے کہ یہ گھاس ہے۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ ضائع کرنے کی چیز نہیں یہ کھانے کی چیز ہے۔ وہ اس کے ساتھ وہ سلوک کرتا ہے جس کے وہ قابل ہوتی ہے تو کیا انسان جس کو خداوند تعالیٰ نے تفکر دیا، عقل دی، حب دی وہ اپنے بھائی سے ہمدردی کرنے کا پابند نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ اپنے تفکر کو اپنی عقل اور اپنی حب کے تقاضوں کو دھوکا دیتا ہے۔ ان تمام صلاحیتوں سے اس کے ضمیر میں جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ قدرت و فطرت کے خلاف عمل کرتا ہے۔

یہ جذبہ حب و ہمدردی جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بخشا ہے اس سے اس ذات باری تعالیٰ کو خود کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ ہی وہ کسی فائدے کا محتاج ہے۔ اس نے تو یہ جذبہ صرف اور صرف اس لئے انسان کے دل میں پیدا کیا کہ اسے دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیج رہا تھا اور وہ ہے بھی یہ اشرف المخلوقات۔ اس لیے یہ اپنی زندگی کے دن امن و آرام سے گزارے۔ کسی مصیبت میں مبتلا نہ رہے۔ آپس میں پیار محبت

سے رہ کر دنیا کو جنت نظیر بنا سکے اور اپنے آپ کو عمل سے بھی دوسرے حیوانات سے بہتر ثابت کر کے دکھائے۔

ذرا سوچئے اگر اس دنیا میں نہ ظلم ہو، نہ چوری ہو، نہ قتل ہو، نہ گالی گلوچ ہو، نہ کوئی کسی سے لڑائی کرے، نہ کوئی کسی کا حق کھائے، نہ جھوٹ بولے، نہ کوئی برائی ہو، بلکہ لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد ہوں، تکلیف میں ایک دوسرے کے کام آئیں، ایک دوسرے کو دیکھتے ہی خوش ہوں تو کیا یہ دنیا جنت کا نمونہ نہیں بن جائے گی؟ دنیا میں مصیبتوں، چوری، قتل و غارت اور دوسرے مظالم کی ابتداء ہمیشہ خودغرضی سے ہوتی ہے۔ جب تک دلوں پر ہمدردی کی حکومت ہو یہ برائیاں کبھی پیدا نہیں ہوسکتیں۔

جو خوشی کسی کے ساتھ ہمدردی اور پیار کرنے سے محسوس ہوتی ہے وہ اس سے برائی کرنے سے کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ مخیّر حضرات بیواؤں، یتیم بچوں اور محتاجوں میں اپنی دولت تقسیم کر کے جس قدر خوشی محسوس کرتے ہیں اور انہیں جس قدر سکون قلب محسوس ہوتا ہے وہ کسی برائی سے نہیں ہوسکتا۔ مجاہد کو جو درجہ قربانی اور شہادت میں ملتا ہے اسے سو سال کی زندگی میں بھی میسر نہیں ہوسکتا۔

علامہ اقبالؒ نے بھی یہی کہا ہے ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

گویا جب تک انسان خدا کی مخلوق سے محبت نہیں کرے گا خدا کا محبوب نہیں

بن سکتا۔

ایک اور حقیقت بھی نظر میں رہے کہ ہمدردی کے جو فوائد ہیں ان سے بھی انکار نہیں، اللہ تعالیٰ جو انعام دنیا و آخرت میں عطا فرمائے گا اس سے بھی انکار نہیں مگر جو عزت و تکریم ہمدردی کا مظاہرہ کرنے والے کو قوم عطا کرتی ہے اس کا بھی جواب نہیں۔ عبدالستار ایدھی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اگر کہا جائے کہ اس وقت پاکستان میں لوگ ایدھی صاحب کی عزت ہر حکمران اور ہر صاحب ثروت شخص سے زیادہ کر رہے ہیں تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔

www.Iqbalcyberlibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

دنیا کا ہر مذہب اتحاد و اتفاق پیار محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ ہر مذہب نے مقصد حیات خدمت خلق اور ایک دوسرے سے ہمدردی قرار دیا ہے۔ خدا کی جتنی عبادات ہیں ان سب میں سے اس کے بندوں سے پیار کرنا سب سے بڑی عبادت قرار دیا ہے۔ خدا کی عبادت بھی اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوتی جب تک اس کی مخلوق کے ساتھ پیار ہمدردی کا سلوک نہیں کیا جاتا۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے ایک جگہ فرمایا ہے۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

یعنی علامہ کے نزدیک خدا کے عاشقوں کی بھی کوئی وقعت نہیں جب تک وہ خدا کے بندوں سے پیار نہیں کرتے۔ ہماری کوئی عبادت قابل قبول نہیں جب تک ہم اس کے بندوں کے حقوق کا خیال نہیں رکھتے۔ خدا تعالیٰ کو اپنی مخلوق بہت ہی پیاری ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز کسی کو محبوب ہو، اسے اگر کوئی پیار کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تو اس کی عزت اس کے دل میں کیا ہوگی؟ ایک انسان کی آپ بہت زیادہ عزت کرتے ہیں، اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور اس سے آپ کو بہت پیار ہے مگر جو چیز اسے بہت عزیز ہے یعنی اس کی اولاد، اس سے آپ پیار نہیں کرتے، بلکہ اس سے بیر رکھتے ہیں تو سوچئے کہ کیا وہ شخص آپ کو اچھا سمجھے گا؟ ہرگز نہیں۔ انسان کا مقصد حیات ہی یہی ہے کہ سب سے پہلے خدا کے بندوں سے ہمدردی

رکھے۔ان کی غمگساری کرے۔ان سے صلح و آشتی سے پیش آئے۔ان کے دلوں کو تکلیف نہ پہنچائے۔کسی کی دل آزاری کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور کسی کے دل کو خوش کرنا بہت بڑی عبادت ہے۔اسی لئے کہا گیا ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنیاد خلیل آذر است
دل گذرگاہ جلیل اکبر است

کسی کے دل کو خوش کرنا ایسے ہے جیسے کسی نے حج اکبر کرلیا ہو۔کیونکہ دل میں خدا رہتا ہے۔اگر اسے کوئی نقصان پہنچے گا تو خدا ناراض ہوگا۔

کسی کے ساتھ دشمنی رکھنا،کسی پر حسد کرنا،کسی سے کینہ،بغض یا کسی مذہب میں بھی جائز نہیں۔بعض مذاہب میں تو ہمدردی اور پیار ہی کو بنیاد قرار دیا جاتا ہے اور اس کی تاکید اس قدر ہے کہ اگر کوئی اس میں ذرا بھی کوتاہی کرتا ہے تو خارج از مذہب سمجھا جاتا ہے اور اس کی تمام عبادتیں اکارت ہوجاتی ہیں۔محبت اور اخوت کا رشتہ سب رشتوں سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو انسان کا انسان کے ساتھ اور کون سا رشتہ رہ جاتا ہے؟ یہ رشتہ سب سے مضبوط اور پیارا رشتہ ہے اور اگر یہ رشتہ قائم ہے تو کسی اور رشتے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔

قدرتی اور پیدائشی طور پر ہم اخوت اور پیار کے رشتے میں منسلک ہیں۔ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہم ایک آدم کی اولاد ہیں۔اگر ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ہم

ایک آدم کی اولاد ہیں تو یقیناً ہم رشتے میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور بھائی سے بیر رکھنا کہاں تک جائز ہے؟ اور اس سے مل جل کر ایک جان بن کر ایک دوسرے کا سہارا نہ بن کر رہنے میں کیا مصلحت ہے؟ یہ صرف اور صرف سوچ کا فرق ہوتا ہے۔ رزق حلال وحرام میں بھی صرف سوچ کا فرق ہے۔ جو لوگ رزق حلال کماتے ہیں محنت تو انہیں کرنا پڑتی ہے لیکن کیا رزق حرام حاصل کرنے میں محنت کم کرنا پڑتی ہے۔ کتنے خطرات مول لینے پڑتے ہیں۔ کئی مصیبتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک شخص سارا دن محنت کر کے روزی کماتا ہے۔ ایک شخص رات کو چوری کرتا ہے۔ چوری کرنے کے لئے اسے صحیح روزی کمانے سے کم تکالیف نہیں جھیلنا پڑتیں۔ یہی حال اس شخص کا ہے جو کسی کے ساتھ پیار کا سلوک نہیں کرتا اور سمجھتا ہے کہ کسی کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنے میں نقصان میں رہوں گا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جو کسی سے اچھا سلوک کرتا ہے یقیناً اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک روا رکھا جائے گا اور اگر وہ خواہ مخواہ لوگوں سے بیر رکھے گا تو اس کی زندگی بھی سکون سے نہیں گزرے گی۔ کوئی شخص بھی اسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔ وہ لوگوں کی ہمدردیوں سے محروم ہو جائے گا اور اس طرح سارے کا سارا معاشرہ بگڑ جائے گا اور یہ دنیا دوزخ کا نمونہ بن کر رہ جائے گی۔

تمام مذاہب نے لوگوں کو اسی لئے پیار محبت سے زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے تا کہ معاشرہ درست رہے اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت کا رشتہ قائم رکھیں اور ان کی دنیوی زندگی آرام وسکون سے گزر جائے۔ اسلام پوری

انسانیت کو ایک برادری قرار دیتا ہے اور پوری سختی سے اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں اور ایک دوسرے کا دکھ اپنا دکھ سمجھیں لیکن افسوس کہ ہم اس اصول کو فراموش کر کے اپنی عارضی اور ناجائز منفعت کے لئے فرقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ مذہب کے نام پر ہم نے الگ الگ دوکانیں کھول رکھی ہیں ایک دوسرے کے درپے آزار ہو گئے ہیں۔ فرقہ بندی سے آپس کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے۔ دشمن ہم پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ذلت و رسوائی انتقام دشمنی حسد و بغض کا شیوہ نہایت گھٹیا طرز عمل ہے۔ کسی کی زیادتی کو معاف کر دینا اس سے بدلہ لینے سے بہت بہتر ہے۔ اس سے پیار بڑھتا ہے اور بیر ختم ہو جاتا ہے۔ بیر اور دشمنی رکھنا کسی مذہب میں بھی جائز نہیں۔

امید

مثل مشہور ہے کہ دنیا امید پر قائم ہے۔ دنیا میں جو کچھ بھی ہم کر رہے ہیں یا جو کچھ بھی ہو رہا ہے امید کے سہارے ہو رہا ہے۔ دنیا کے سفینے کا امید کا ناخدا ہی چلا رہا ہے۔ امید کا سہارا بڑے بڑے نازک وقتوں میں کام آتا ہے۔ یہ امید ہی ہے جو ہمیں مصروف عمل رکھے ہوئے ہے ورنہ نا امیدی چھا جائے تو انسان بالکل بے عمل ہو کر رہ جاتا ہے۔ امید کی روشنی ہی ہمیں مصیبتوں اور تکلیفوں میں چلنے کا راستہ دکھاتی ہے۔ امید کی کرن ہی بجھے ہوئے دلوں کو دوبارہ سہارا دے کر کھڑا کر دیتی ہے۔ امید بڑی بڑی مایوسیوں کو دور کر کے عزم صمیم بخشتی ہے۔ امید ہی کے سہارے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سر ہوئی، کے ٹو کے پہاڑوں کو امید کے قدموں نے ہی روندا، یہ امید ہی تھی جس کے سہارے انسان چاند پر جا پہنچا اور اب اور آگے بڑھ رہا ہے۔ وہاں پر بھی اسے امید ہی لے جائے گی۔ امید فاتح کی تلوار ہوتی ہے اور مہم جو کی مہت ہوتی ہے۔ جن کوہستانی سلسلوں میں ہمارا خیال بھی ادھر ادھر بھٹکنے لگتا ہے وہاں امید ہماری رہبری کرتی ہے۔ جب ہم کوہستانوں، صحراؤں اور ہواؤں کے بگولوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں تو امید ہی کا دامن پکڑ کا کامیابی سے گزرتے ہیں۔

ریگزار اور دشت و بیاباں اور سراب کی جھوٹی جھلکیوں میں جب ہم راہ نہیں پاتے تو اس وقت امید ہی ہمیں پائے استقامت بخشتی ہے جو وہاں سے صحیح سلامت نکال لے آتی ہے، مصائب و آلام میں ہمیں حوصلہ دیتی ہے۔ تنگدستی و

افلاس میں امید کی کرن ہی اچھے وقتوں کے لئے ہمیں زندہ رکھتی ہے۔ آج جو لوگ فارغ البال اور مختلف میدانوں میں کامیاب و کامران نظر آتے ہیں وہ بھی امید کے سہارے چلتے رہے ہیں اور آج اس مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ امید ہی آڑے وقتوں میں ہمارے کام آتی ہے اور ہر مصیبت میں ہماری مدد کرتی ہے۔

ہمایوں نے شکست کھائی۔ امید نے اسے پھر سہارا دیا۔ پھر کوشش کی، ناکام رہا مگر پھر بھی مایوس نہ ہوا۔ پھر میدان میں نکلا پھر شکست کھائی۔ مگر امید کی ڈھال نے اسے سہارا دیا اور پھر مقابلے کے لئے لا کھڑا کیا۔ اس طرح سے جب وہ چھ دفعہ شکست کھا چکا تو پھر بھی امید ہی تھی جس نے اسے ساتویں دفعہ لڑنے کے لئے تلوار ہاتھ میں پکڑائی۔ وہ دل میں فتح کی امید لے کر میدان میں نکلا اور پرامید ہو کر لڑا اور فتح پائی۔ اگر ہمایوں کو امید سہارا نہ دیتی تو وہ شہنشاہ ہندوستان نہ کہلواتا اور سلطنت مغلیہ اسی وقت ختم ہوگئی ہوتی۔

کولمبس نے امید کا سہارا لیا اور سمندر میں قسمت آزمائی کے لئے چل دیا۔ اس کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ پانی کے تھپیڑوں سے جب جہاز ڈولنے لگا تو امید ہی اس کے دل کو قائم رکھتی تھی۔ اس کے ساتھی مایوس ہو جاتے تھے اور پست ہمت ہو کر اسے لوٹنے کا مشورہ دیتے تھے مگر وہ امید سے ان کی ڈھارس بندھاتا تھا۔ جب وہ طوفان میں گھر جاتا تو امید اسے ہمت مقابلہ بخشتی تھی۔ کئی بار اسے موت بالکل سامنے نظر آنے لگی۔ اس وقت بھی امید نے ہی اسے حوصلہ دیا۔ وہ ہر مایوسی کا مقابلہ امید سے کرتا رہا۔ آخر کار کامیاب ہوگیا۔

انسان جیتا ہی امید کے سہارے ہے۔ ناامیدی اور پست ہمتی سے انسان مردہ دل ہوکر بیکار بیٹھ جاتا ہے۔ امید کا سہارا بڑے بڑے نازک وقتوں میں کام آتا ہے۔ امید سے ہی زندگی کی شمع جل رہی ہے۔ یہ کارخانہ دنیا بھی امید کی حرارت سے چل رہا ہے۔ امید ہی مردہ دلوں میں جان ڈالتی ہے۔ بڑے بڑے سائنسدان امید کے سہارے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ ناکامی کی شکل میں بھی امید انہیں مزید تحقیق کی دعوت دیتی ہے۔ نتیجتاً وہ کامیاب ہو جاتے ہیں اگر وہ مایوس ہوکر بیٹھ جاتے تو کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ امید ہی انہیں مصروف عمل رکھتی ہے اور عجیب وغریب ایجادات کی بنیاد بنتی ہے۔

کسان بھی کھیت میں بیج اسی امید پر ڈالتا ہے کہ کل کو سبز لہلہاتی فصل دیکھے گا اور پھر اسے کاٹے گا۔ مزدور سارا دن اس امید پر محنت کرتا ہے کہ شام کو اسے اس کا محنتانہ ملے گا۔ طالب علم امتحان میں کامیابی کی امید پر ہی مطالعہ کرتا ہے۔ صبح کو لوگ اٹھتے ہیں اور اپنے اپنے کاموں پر حصول معاش کی امید لے کر چلتے ہیں۔ بڑے بڑے صنعتکار منفعت کی امید پر ہی ملیں لگاتے ہیں۔ بازار میں دوکان دار جو اپنی اپنی دوکانیں قرینے سے سجائے بیٹھے ہیں اسی امید پر بیٹھے ہیں کہ شام کو اپنی روزی لے کر گھر جائیں گے۔ ہر مسافر امید کے سہارے اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے۔ وہ پر امید ہوتا ہے کہ فلاں وقت پر اپنی منزل پر پہنچوں گا اور فلاں فلاں کام کروں گا۔ فلاں فلاں مال خریدوں گا اور اس سے مجھے اس قدر منافع ہوگا۔ یہ امید ہی ہے جو اسے حرکت پر آمادہ رکھتی ہے۔

اسی لئے حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہیں ہونا چاہیے۔ نا امیدی گناہ ہے۔ اس سے پست ہمتی پیدا ہوتی ہے اور پست ہمت انسان کبھی ترقی کی منزلیں طے نہیں کر سکتا۔ کوئی شخص کچھ بھی کر رہا ہو، کہیں بھی کر رہا ہو، امیر ہو یا غریب، کاشت کار ہو یا صنعت کار، تاجر ہو یا مزدور اسے ہر وقت پر امید ہو کر اور خدا کی ذات کا سہارا لے کر مصروف عمل رہنا چاہیے اور نا امیدی کو پاس بھی پھٹکنے نہیں دینا چاہیے۔ امید کے پھول ہمیشہ خوش رنگ و خوشنما ہوا کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ ہمیشہ کامیابی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اسلامی اخوت

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

(اقبال)

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی سمجھے اور اس سے حقیقی بھائی جیسا سلوک کرے۔ چاہے ان میں سے ایک پاکستان میں رہتا ہو اور دوسرا جرمنی میں۔ ایک کالا ہو اور دوسرا گورا۔ ایک دوسرے کے لئے ہر طرح کی جانی و مالی قربانی کرے اور مصیبت کے وقت اس کی مدد کرے۔ ایک کا درد دوسرے کی ٹیس بن جائے۔ یہ ہے اسلامی اخوت۔

خاندان، قبیلے اور قوم کی تخصیص نے اولاد آدم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا اور اختلافات کی بنیاد اسی روز رکھی گئی اور انہیں اختلافات کی وجہ سے ایک خاندان دوسرے خاندان کا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا، ایک قوم دوسری قوم کی دشمن بن گئی۔ کالا گورے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگا اور گورا کالے کو۔ حصول اقتدار کی دوڑ شروع ہو گئی۔ ایک خاندان نے دوسرے خاندان، ایک قبیلے نے دوسرے قبیلے اور ایک قوم نے دوسری قوم کو زیر کرنا شروع کر دیا۔ آپس میں جنگیں شروع ہو گئیں اور لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے اور یہ بھول گئے کہ ہم ایک آدم کی اولاد ہیں۔ اپنی اپنی برتری جگانے کے لئے انسان کے ہاتھوں انسان کا خون بہنے لگا۔

جب جہالت عروج کو پہنچ گئی تو سرور کونینؐ اس دنیا میں تشریف لائے۔ آپؐ نے انسانوں پر واضح کیا کہ خدا ایک ہے۔ وہی انسانوں کا معبود ہے۔ دنیا پر اسی کی حاکمیت ہے۔ آپؐ نے دنیا کو انسان کے لئے سکون اور انصاف کی جگہ بنانا اور آخرت پر یقین رکھنا سکھایا۔ یہ نظریہ تھا جس میں کالے گورے، عربی عجمی، سید غیر سید، ہندی افریقی میں کوئی فرق نہیں۔ سب کے سب برابر ہیں۔ یہ نظریہ مساوات تھا۔ سب کے لئے امن وسکون کا پیغام تھا۔ جن لوگوں نے اس نظریہ کو قبول کیا وہ حلقہ اسلامی میں داخل ہو چکے تھے۔ اس نظریہ اسلامی اخوت نے سب کے اختلافات دور کر دیئے اور سب ایک ہی تسبیح کے دانے بن گئے۔

مسلمانوں نے اس جذبہ کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا ثبوت مسلمانوں کی مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کے موقع پر دیا۔ جب مسلمانان مکہ مدینے ہجرت کر کے گئے تو وہ بالکل بے سروسامانی کی حالت میں تھے۔ نہ ان کے گھر بار تھے اور نہ دوسری ضروریات زندگی کا کوئی انتظام تھا۔ انصار مدینہ نے انہیں اس طرح خوش آمدید کہا کہ ان کو اپنی ہر چیز میں حصہ دار بنالیا۔ جس کے پاس دو مکان تھے اس نے ایک مکان دوسرے مہاجر کو دے دیا۔ جس کے پاس دس بکریاں تھیں اس نے پانچ بکریاں اپنے اسلامی مہاجر بھائی کو دے دیں۔ اسی طرح دوسری املاک کو تقسیم کر دیا اور اس طرح اسلامی اخوت کا مظاہرہ کیا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی اور اسی جذبہ اخوت نے انہیں کامیاب وکامران کیا اور قیصر و کسریٰ کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ یہ جذبہ اخوت کا ہی کمال تھا کہ جنگ میں

زخمیوں میں سے ایک آواز آئی کہ پیاس، جب اس کو پانی دیا گیا اور وہ پینے لگا تو دوسرے زخمی کی آواز آئی پیاس۔ پہلے زخمی نے پانی بغیر پیئے چھوڑ دیا اور کہا کہ پہلے اسے دو۔ جب دوسرے کو دیا گیا اور وہ ہونٹوں سے لگانے لگا تو تیسرے کی آواز آئی پیاس۔ گویا پانی کا پیالہ اسی طرح سے چالیس آدمیوں کے درمیان گھوما اور جب پہلے کے پاس آیا تو شدت پیاس سے دم توڑ چکا تھا۔ دوسرے کے پاس پیالہ لایا گیا تو وہ بھی شہید ہو چکا تھا۔ سب کے سب نے اسی طرح سے شہادت پائی۔ موت ان کے سامنے تھی مگر ہر ایک نے اپنے دوسرے بھائی کے لئے پانی خود نہیں پیا۔

جب انسانوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ ایک دوسرے کے اتنے ہمدرد بن جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کی تکلیف بٹ جاتی ہے۔ یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ ایک آواز پر دنیا کے مسلمان ایک دوسرے کی ہمدردی کے لئے آجاتے ہیں۔ محمد بن قاسم کا واقعہ ہمارے سامنے ہے کہ وہ ہزاروں میں سے ایک مسلمان عورت کی آواز سن کر اس کی مدد کو پہنچا اور اس نے ایک بہن کو ظلم سے نجات دلانے کے لئے راجہ داہر سے جنگ لڑی۔

متحدہ ہندوستان میں تحریک اخوت چلی۔ اس طرح ہندوستان مسلمان ترکوں کے دکھ درد میں برابر کا شریک بن گیا تھا۔ پاک بھارت جنگوں میں دنیا کے مسلمانوں نے بھارت کی مذمت کی اور اخوت کا ثبوت دیا۔ عرب اسرائیل جنگ میں اور تحریک فلسطین کی جنگوں میں دنیا کا ہر مسلمان درد کی ٹیس کو محسوس کر رہا ہے۔

جب مسلمانوں میں جذبہ اخوت پورے جوش پر تھا تو مسلمان کو کوئی طاقت زیر نہیں کر سکتی تھی۔ اب جب کہ یہ جذبہ کمزور پڑ گیا ہے ہمارے دشمنوں کو ہمیں نقصان پہنچانے کا موقع مل گیا ہے۔ جہاں جہاں بھی مسلمان کو نقصان پہنچا ہے اس جذبہ اخوت کے فقدان کی وجہ سے پہنچا ہے ورنہ مسلمان ایک بہت بڑی قوت ہے۔ مسلمانوں کی خودغرضی ہی نے برطانیہ کو مسلمانوں سے حکومت چھیننے میں کامیاب بنایا تھا۔ اگر آج بھی ہم میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو اب بھی وہی کامیابیاں ہمارے قدم چومنے کے لئے مضطرب ہوں گی جو ماضی میں مسلمانوں کا مقدر ہوتی تھیں۔

سفر وسیلہ ظفر

عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

دنیا ایک کتاب ہے۔ تحصیل علم کے لئے اس کا مطالعہ بھی ضروری ہے زمانے کی کتاب کا مطالعہ سفر و سیاحت سے ممکن ہے۔ بے شک سفر بہت ہی تکلیف دہ عمل ہوتا ہے مگر اس کے فوائد بھی بہت ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب انسان نے اپنے لئے سفر کی سہولتیں پیدا نہیں کی تھیں۔ راستے میں قزاقوں کا ڈر تھا۔ سمندر میں جہاز کے ڈوب جانے کا خطرہ تھا۔ موسموں کے تغیر و تبدل سے حالات ناسازگار ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ریگستانوں، پہاڑوں اور لق و دق جنگلوں میں سے پیدل گزرنا پڑتا تھا۔ راستے میں موذی جانوروں سے واسطہ پڑتا تھا۔ گویا پہلے زمانے کا سفر بہت مشکل کام تھا۔ کسی کام میں جس قدر خطرات مول لینے پڑتے ہیں اس میں اسی قدر منفعت بھی ہوتی ہے۔ منفعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ واسکوڈے گاما نے مہینوں کا سفر کیا۔ اس دوران وہ مہینوں پانی میں رہا کئی بار طوفانوں میں گھرا اسے کئی بار موت بالکل سامنے نظر آئی۔ کئی بار خوراک بالکل ختم ہو گئی۔ اس کے ساتھیوں کے حوصلے پست ہو گئے مگر واسکوڈے گاما نے حوصلہ اور ہمت کا دامن تھامے رکھا اور خطرات کا سامنا کرتا اور موت سے کھیلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ آخر کچھ زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ امید نے اسے سہارا دیا اور وہ وقت بھی آ گیا کہ واسکوڈے گاما ہندوستان کا نیا بحری

راستہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ اس کی محنت کا ثمر تھا اس نے جو خطرات مول لئے تھے ان کی قیمت اسے مل گئی کہ اس کی قوم کو ہندوستان کا پتہ چل گیا۔ اسی دن سے اس قوم کی توجہ ہندوستان کی طرف ہو گئی۔ آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ پورے ہندوستان پر تاج برطانیہ کی حکمرانی ہو گئی۔ سونے کی چڑیا ان کے ہاتھ آ گئی۔ انگریزوں نے ہندوستان سے تجارت کے ذریعے اور حکومتی ذرائع سے جس قدر سیم وزر کمایا اس قدر اور کہیں سے نہیں کمایا۔ ہندوستان پر قبضہ کے بعد ان کی رفتار بہت ہی تیز ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دنیا کے ایک چوتھائی حصے پر حکومت کرنے لگ گئے اور کہا جانے لگا کہ برطانیہ کی سلطنت میں سورج غروب ہی نہیں ہوتا یعنی ان کی سلطنت اس قدر وسیع ہو گئی کہ اس میں ہر وقت کسی نہ کسی جگہ سورج چمک رہا ہوتا تھا۔

اسی طرح کولمبس نے مشکلات کا سامنا کیا اور امریکہ دریافت کر لیا امریکہ آج جو کچھ ہے سب کے سامنے ہے۔ اب یہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور سب سے بڑی حکومت ہے اور تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ اس کے پاس عزت، دولت، شان وشوکت سب کچھ ہے۔ یہ صرف سفر کی بدولت ہوا۔ اگر کولمبس سفر کر کے امریکہ دریافت نہ کرتا تو امریکہ کون پہنچتا اور لوگ کیسے ترقی پذیر ہوتے۔

آج سفر سفر نہیں رہا ہے بلکہ اتنا آسان ہو گیا ہے کہ سیر وتفریح معلوم ہونے لگا ہے۔ ذرائع آمد ورفت اس قدر سہل ہو گئے ہیں کہ انسان گھنٹوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جاتا ہے۔ بس صبح کا کھانا کھا کر جہاز میں سوار ہوں اور

دوپہر کا کھانا یورپ کے کسی شہر میں کھائیں اور پھر کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی۔

سفر سے ہماری معلومات و تجربات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ہمیں دوسرے ملکوں کی عادات و اطوار اور تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے اور وہاں کے علوم سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ قدرت کے عجائبات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہمارا عزم بڑھتا ہے۔ ہماری طبیعت میں مستعدی و ہمت پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں دوسرے ممالک کے لوگوں سے ثقافتی تعلقات بڑھانے کا موقع ملتا ہے اور وہاں کی طرز معاشرت کا پتہ چلتا ہے۔ غیر ممالک کے مذاہب کے لوگوں سے تبادلہ خیالات کر کے ہمیں تبلیغ و اشاعت کے مواقع بھی میسر آتے ہیں۔ وہاں کی درسگاہوں میں ریسرچ کر کے ہم جدید علوم سے واقف ہوتے ہیں۔

سفر سے فی زمانہ سب سے بڑا فائدہ تجارت کو پہنچتا ہے۔ سب سے زیادہ منفعت آج بین الاقوامی تجارت میں ہے۔ برآمدات و درآمدات کے لئے سفر اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس سے ذاتی طور پر جو تجربات و معلومات حاصل ہوتی ہیں گھر بیٹھے خط و کتابت یا اخبارات و رسائل سے نہیں ہو سکتیں۔ بعض چیزیں یا مشینری ایسی ہوتی ہے جس کو دیکھ کر اس کی کارکردگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے یا مال کی نوعیت کا صحیح پتہ اس وقت لگتا ہے جب انسان اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اس طرح نقصان کا احتمال کم ہو جاتا ہے یہ سب سفر کئے بغیر ممکن نہیں۔

سیاحت و سفر سے ایک دوسرے ملک کے آپس میں تعلقات بڑھتے ہیں اور باہمی امداد و تعاون کے راستے کھلتے ہیں۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے

معلومات و تجربات حاصل کئے جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں کی معاشرتی بہبود کی سکیموں کا پتہ چلتا ہے تو ہم بھی انہی خطوط پر اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر چلا سکتے ہیں۔

جس فرد یا قوم نے سفر کی مصیبتیں جھیلیں اس نے عزت و دولت دونوں حاصل کئے۔ انہی قوموں نے دوسری قوموں پر فوقیت حاصل کی اور حکومت کی جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر سفر اختیار کیا۔ پہلے زمانے کے مؤرخ کے لئے ضروری تھا کہ وہ سیاح بھی ہو۔ گھر بیٹھے مؤرخ نہیں بن سکتا تھا۔ وہ خود وہاں جا کر معلومات حاصل کرتا تھا اس طرح وہ اپنی قوم کے لئے ترقی کے راستے بھی کھولتا تھا۔ یہ لوگ سفر کی صعوبتیں جھیلتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے۔

پابندی وقت

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ گھڑی کی سوئیاں کبھی نہیں رکتیں۔ جو وقت سے فائدہ اٹھالیتا ہے وقت اس کے کام آ جاتا ہے اور جو وقت کی قدر نہیں کرتا وقت اسے کوسوں پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ وقت ایک عظیم دولت ہے وہی شخص دنیا میں عزت وثروت حاصل کرسکتا ہے جو وقت سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس کی قدر کرتا ہے اور اسے ضائع نہیں کرتا۔ ہمیں چاہیے کہ وقت ضائع نہ کریں، ہر کام مقررہ وقت پر کرنے کی عادت اختیار کریں اور کبھی آج کا کام کل پر نہ ڈالیں۔ ہر کام اپنے مقررہ وقت پر کرنا چاہیے آج کا کام کل پر نہ ڈالنا چاہیے۔ یہی پابندی وقت ہے۔

جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے وہ درحقیقت ایک قیمتی خزانہ ضائع کر دیتے ہیں۔ گذرا ہوا وقت کبھی کسی قیمت پر بھی واپس نہیں آتا۔ پابندی وقت کے ساتھ اگر ہم محنت کریں تو ہم اپنی اقتصادی حالت درست کرسکتے ہیں۔ عزت کی زندگی بسر کرسکتے ہیں یوں ہم کسی کے محتاج نہیں ہوں گے۔

نظام کائنات بھی ہمیں پابندی وقت کا درس دیتا ہے۔ ہر موسم اپنے مقررہ وقت پر بدلتا ہے۔ دن رات مقررہ وقت کے پابند ہوتے ہیں۔ چاند سورج ایک مقررہ وقت اور مقررہ نظام کے تحت طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ یہ اپنے پروگرام میں کبھی بے قاعدگی نہیں آنے دیتے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ اگر پابندی وقت کا عادی نہیں ہوتا تو یہ اس کی ناسمجھی یا نااہلی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

طالب علم اگر وقت پر سکول نہ جائے تو تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔ کسان اگر فصل وقت پر نہ بوئے، وقت پر پانی نہ دے اور وقت پر نہ کاٹے تو کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کارخانہ دار وقت پر کام نہ کروائے اور مزدور اگر وقت پر کام نہ کرے تو اسے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا۔ دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وقت کی پابندی کی جائے اور ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا جائے۔ کہتے ہیں کہ ایک منٹ کا بھولا ہوا لاکھوں کوس دور رہ جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے دولت ان سے روٹھ جاتی ہے۔ عزت ان سے منہ موڑ لیتی ہے اور وہ ساری عمر ناکام زندگی گزارتے ہیں۔ ایک سیکنڈ بھی ضائع کرنا خیانت مجرمانہ ہے۔ اس لئے وقت کو رائیگاں نہ گنوانا چاہیے۔ جو کام وقت پر کر لیا جائے وہی بہتر ہے۔ اگر اسے دوسرے وقت کے لئے التواء میں ڈال دیا جائے تو اکثر اوقات نامکمل ہی رہتا ہے۔ چنانچہ وقت کی قدر کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر کام وقت پر کر لینا چاہیے۔

بعض اوقات کسی کام کو بروقت سرانجام نہ دینے سے بڑے بڑے نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تاریخی شواہد بھی یہ ثابت کرتے ہیں کہ وقت کی پابندی نہ کرنے سے ایسے ایسے نقصانات ہو جاتے ہیں۔ جن کی تلافی زندگی بھر نہیں ہو سکتی۔ ایک بے گناہ شخص صرف اس لئے پھانسی دے دیا گیا کہ قاصد جو اس کی رہائی کا حکم نامہ لے کر جا رہا تھا صرف پانچ منٹ دیر سے پہنچا۔ اس طرح نپولین کا ایک جرنیل میدان جنگ میں دیر سے پہنچا اور شکست کھا گیا۔ جو لوگ پابندی وقت

کا خیال نہیں رکھتے بہت خسارے میں رہتے ہیں۔ پابندی وقت سے انسان خوشگوار زندگی گزار سکتا ہے اور اس کی بہت سی تکالیف خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔

وقت کی پابندی ہر شعبے میں ضروری ہے۔ دنیا کا کوئی شخص خواہ وہ کسی پیشے سے تعلق رکھتا ہو۔ جب تک وقت کا پابند نہیں ہوگا کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکے گا۔ ہمارے خیال میں وقت کی پابندی جتنی ایک طالب علم کے لئے ضروری ہے شاید کسی اور کے لئے اتنی ضروری نہیں کیونکہ یہ زمانہ انسان کی زندگی کی تعمیر کا بہترین دور ہوتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں اگر وہ پابندی وقت کو ملحوظ رکھتا ہے تو دولت علم سے مالا مال ہو سکتا ہے۔ اس کی یہ عادت بھی بعد میں عملی زندگی میں اس کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ لوگ وقت کے پابند ہوتے ہیں ان میں سستی اور کاہلی نام کو نہیں ہوتی۔ وہ ہر کام وقت پر کرنے کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ ان سے ان کا کام بھی وقت پر سرانجام پا جاتا ہے اور ان کی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔ ان کی طبیعت میں مستعدی اور چستی رہتی ہے۔ ان کی زندگی کامیاب و خوشگوار گزرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ہمیں وقت کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ نماز ہمیں پابندی وقت کا درس دیتی ہے۔ روزہ بھی وقت کا پابند بناتا ہے۔ وقت پر سحری کھانا پڑتی ہے۔ وقت پر افطاری کرنا پڑتی ہے۔ اگر سحری دیر سے کھائی جائے اور افطاری وقت سے پہلے یا بعد میں کی جائے تو روزے کا ثواب جاتا رہتا ہے اور سارے دن کی محنت رائیگاں جاتی ہے۔

اصل میں روپیہ پیسہ دولت نہیں بلکہ وقت ہی دولت ہے کیونکہ دولت وقت کی محتاج ہے۔ وقت سے ذرا سی غفلت برتیں تو دولت بھی انسان سے دور ہو جاتی ہے اور انسان قلاش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ وقت کی قدر کی جائے اور لاپرواہ ہو کر وقت ضائع نہ کیا جائے ایسا کرنے سے نہ عزت رہتی ہے نہ دولت نہ صحت۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

محنت کی عظمت

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

ہر کامیابی و کامرانی کی ضمانت محنت و مشقت ہے۔ یہ ایسی صلاحیت ہے جس کا ثمر ہمیشہ شیریں ہوتا ہے۔ روز ازل سے لے کر آج تک انسان نے جو ترقی کی منزلیں طے کی ہیں ان میں محنت کو سب سے زیادہ دخل حاصل ہے۔ اسی کی بدولت انسان نے اپنے مسائل حل کئے۔ محنت سے ہی انسان نے اپنی معاشرتی گتھیاں سلجھائیں اور اپنی ضروریات زندگی کے سامان پیدا کئے۔ انسان کی عرق ریزی اور جدوجہد ہی سے آرائش و آسائش کے سامان پیدا ہوئے۔ محنت ہی سے انسان نے پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کیا اور محنت سے ہی سمندروں کی تہہ میں پہنچا۔ محنت سے ہی نئے نئے ملک دریافت کئے گئے۔ رات دن کی کوششوں سے ہی انسان نے ایجادات کیں۔ آج جو جو عجیب و غریب چیزیں نظر آ رہی ہیں۔ (مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، فوٹوگرافی، بجلی، ہوائی جہاز وغیرہ) یہ سب محنت و تجسس ہی کا پھل ہیں۔ اس کے برعکس جو قومیں محنت اور مشقت نہیں کرتیں وہ پسماندہ رہ جاتی ہیں اور اپنی عزت اور وقار سب کچھ کھو کر مفلسی اور بیچارگی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ انہیں دوسری ترقی یافتہ قوموں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔

محنت ہی سے ترقی ممکن ہوتی ہے۔ جس چیز کے لئے محنت سے کوشش کی جائے وہ ضرور مل جاتی ہے۔ کسان محنت سے کھیت میں بیج ڈالتا ہے، اس کی گوڈی

کرتا ہے اور اسے پانی دیتا ہے۔ پھر جا کر اسے اناج میسر آتا ہے۔ اگر وہ کچھ نہ کرے یا محنت کرنے کی بجائے لاپروایا تن آسان ہو جائے تو کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح سے ایک طالب علم جو محنت نہیں کرتا امتحان میں کامیاب نہیں ہوگا۔ محنت ہی ایک ایسا جوہر ہے جو انسان کو ہر میدان میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرتا ہے۔

ہمارے نبی کریمؐ جن کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے اس دنیا میں پیغمبر آخر الزماں بنا کر بھیجا تھا اور جن کی ہدایت حرف آخر تھی آپؐ نے خود محنت اور مشقت کی اور انسانیت کے لئے یہ سبق چھوڑا کہ محنت میں عظمت ہے اور اس کے بغیر انسان کا کوئی عقدہ حل نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ آپؐ اپنے ذاتی کام خود اپنے دست مبارک سے کیا کرتے تھے۔ جو لوگ اپنے کام کی ذمہ داری خود نہیں سنبھالتے یا اسے محنت اور مشقت سے نہیں کرتے ناکام زندگی گزارتے ہیں۔

فلسفہ اقبالؒ بھی یہی ہے کہ انسان کو محنت اور مشقت سے اپنے مسائل کی عقدہ کشائی کرنا چاہیے۔ عمل پیہم اور جہد مسلسل ہی انسان کو کامرانی سے ہمکنار کرتا ہے جو لوگ ہوش و خرد کی شمع ہاتھ میں سنبھال کر پوری خود اعتمادی اور اولوالعزمی سے تدبیر کا تیشہ ہاتھ میں لے کر محنت و مشقت کرتے ہیں وہ یقیناً پہاڑ میں سے بھی دودھ کی نہر نکال لیتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

بے محنت پیہم کوئی عقدہ نہیں کھلتا

میخانہ حافظ ہو کہ بت خانہ فرہاد

زندگی کا کوئی شعبہ ہو اور کوئی بھی مسئلہ حل طلب ہو ترقی اسی وقت ممکن ہے جب اس کے لئے پوری ہمت و محنت سے کام کیا جائے۔

جو لوگ اپنے معمولی کام خود کرنا عار سمجھتے ہیں ان لوگوں سے بڑے کاموں کی تکمیل کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے لوگ چھوٹے چھوٹے کام کرنا بے عزتی سمجھتے ہیں اور بڑے کام کرنے کے لئے محنت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ناکامی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ اپنے کام خود سنوارنا اور جو کام بھی کرنا ہو اس کے لئے دماغی اور جسمانی محنت کرنا اعلیٰ ظرفی کی نشانی ہے۔ یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ زندگی جہد مسلسل کا ہی دوسرا نام ہے۔ تاریخ نے آج تک کوئی ایسی مثال پیش نہیں کی کہ کسی نے بغیر محنت و مشقت کے نام پیدا کیا ہو یا عزت پائی ہو یا احترام و وقار کی نشست پر متمکن ہوا ہو۔ ایسے لوگ جو اپنے کام دوسروں سے کرواتے ہیں وہ اپنی صلاحیت کار سے محروم ہو جاتے ہیں اور کسی مشکل وقت کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ دولت کے نشے میں آ کر اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں سے اپنے کام کروانا توہین انسانیت ہے۔

اصل میں ایک بات اور بھی ہمارے آڑے آ گئی ہے کہ ہم نے ذات پات، کالے گورے، افسری ماتحتی کو مختلف مدارج و مراتب دے دیئے ہیں۔ یہ بگاڑ اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ افسر کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ماتحت کو اتنی عزت نہیں دی جاتی حالانکہ دونوں کا احترام یکساں ہونا چاہیے اور دونوں اسی حکومت کے

ملازم ہیں اور اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ احساس برتری و کم تری انگریز کی پیداوار ہے جس نے افسر شاہی اور عوام کے درمیان ایک حد فاصل کھڑی کر دی اور طبقات میں تقسیم کر دیا تا کہ Divide And Rule کا عمل جاری رہے اور ایسا وہ صرف ہندوستان میں آ کر کرتے تھے۔ وہ کبھی کسی عوامی آدمی سے بات بھی کرنا گوارا نہ کرتا تھا جبکہ اپنے ملک میں وہ ہل بھی چلاتا تھا اور محنت بھی کرتا تھا۔

دنیا کی جو قومیں مسند ترقی پر متمکن ہوئی ہیں وہ بغیر مشقت کے نہیں ہوئیں۔ انہوں نے مسلسل عرق ریزی کی۔ وہ سالہا سال تجسس کی وادی میں سرگرداں رہے اور پھر کہیں جا کر انہوں نے زندگی کے اعلیٰ مقاصد حاصل کئے۔ انسان عظمت محنت کا قائل ہو جائے اور اسی کو اپنی ترقی کی نشوونما کا راز تصور کر لے تو اسے محنت و مشقت میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی اور وہ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگ جائے گا۔ عظمت انسانیت اسی میں ہے۔

اپنی مدد آپ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ شعر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کو خود ہمت کرنی چاہیے اور اپنا کام خود کرنا چاہیے۔ دوسرے سے وہ کام کروانا جو آدمی خود کر سکتا ہو اپنے آپ کو ناکارہ اور بیکار کر لینے کے برابر ہے۔ جو لوگ اپنا کام خود نہیں کر سکتے وہ ایک تو دوسرے کے دست نگر ہو جاتے ہیں دوسرے وہ اپنی قوت کار ختم کر بیٹھتے ہیں۔ ان میں نہ کام کرنے کی صلاحیت رہتی ہے اور نہ ہی ان میں خود اعتمادی رہتی ہے۔ جس طرح دوسروں کے دست نگر رہنے والے افراد ترقی نہیں کر سکتے اسی طرح جو قومیں دوسروں کی دست نگر رہتی ہیں وہ بھی ترقی نہیں کر سکتیں۔

جو لوگ اپنے کام خود کرتے ہیں یا اپنی مدد آپ کرتے ہیں ان کو اپنی صلاحیتوں پر اعتماد ہوتا ہے۔ اپنا کام اپنے ہاتھوں کرنے سے کام اپنی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ تسلی بخش ہوتا ہے۔ خرچ کم ہوتا ہے۔ جلدی ہوتا ہے۔ وہی کام آپ کسی اور سے کرائیں تو اس میں اس کی مرضی ضرور شامل ہوگی اور کام تسلی بخش نہیں ہوگا اور اس میں دیر بھی زیادہ لگے گی۔ خود کام کریں گے تو جسم چست رہے گا اور اعضاء بھی مضبوط رہیں گے، بیماری دور رہے گی۔ زندگی حرکت کا دوسرا نام ہے۔ اگر جسم حرکت ہی میں نہیں تو زندہ اور مردہ میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔ جو لوگ دوسروں کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ ان کے اپنے جسم بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں

اوران کی کام کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

اپنی مدد آپ کے اصول سے بہت سے مشکل کام آسان ہو جاتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ دیہات میں پہنچنے کے لئے سڑکیں پختہ نہیں ہوتیں۔ بعض اوقات گاؤں کے لوگ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ڈسٹرکٹ کونسل خود ہی سڑک بنائے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے لیکن اس کے برعکس ایسے گاؤں بھی ہیں جو اپنی مدد آپ کے اصول پر کاربند ہوتے ہیں۔ وہ ڈسٹرکٹ کونسل سے رجوع کرتے ہیں۔ اس کی توجہ کچی سڑک کی طرف مبذول کراتے ہیں اور اپنی تکلیف کا احساس دلاتے ہیں۔ یوں افسران سے افہام و تفہیم کے ذریعے معاملہ کچھ اس طرح طے پاتا ہے کہ جو میٹریل لگے گا ڈسٹرکٹ کونسل مہیا کرے گی لیکن افرادی قوت دیہات والوں کے ذمے ہوگی۔ ایسا کرنے سے سڑک احسن طریقے سے بن جاتی ہے اور دیہات کے لوگوں کے علاوہ دیگر علاقوں کے لوگوں کے لئے بھی سہولت ہو جاتی ہے۔ ذرائع آمد و رفت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو ویگنیں اور بسیں بھی چلنا شروع ہو جاتی ہیں اور گاؤں کی شہر سے دوری ختم ہو جاتی ہے۔

ضروریات زندگی شہر سے آسانی سے لائی جا سکتی ہیں۔ ذرائع آمد و رفت کے ہونے سے گاؤں کے لوگوں کو بھی یہ اشیاء بہ سہولت مل جاتی ہیں۔ لوگوں کی اجناس منڈی میں لے جانے کے لئے بھی آسانی ہو جاتی ہے۔ کاروبار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ گاؤں کے لئے سکول اور ہسپتال کا قیام بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ اگر یہی گاؤں والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے اور مدد کے لئے دوسروں کی طرف تکتے

رہتے تو یہ سہولتیں جو ان کو سڑک بننے سے میسر آئیں کبھی نہ آ سکتی تھیں اور جو ترقی کی راہیں ان کے لئے کھل گئیں کبھی نہ کھل سکتیں۔ سو اپنی مدد آپ کا اصول انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی مفید ہی ثابت ہوتا ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ امیر لوگ گھروں کے کام کاج کے لئے ملازم رکھ لیتے ہیں حالانکہ وہی کام وہ خود بھی کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صفائی کا کام بھی نوکر کرتے ہیں۔ باورچی خانے کا کام بھی نوکروں کے سپرد ہوتا ہے اور بیگمات بیکار بیٹھی رہتی ہیں یا ضرورت سے زیادہ سوئی رہتی ہیں اور سست ہو جاتی ہیں۔ انہیں غذا بھی کھانے کو اچھی ملتی ہے۔ اس لئے موٹی ہو جاتی ہیں اور دل کی بیماریوں، بلڈ پریشر اور شوگر جیسی مہلک امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہمیں خوراک بھی صحیح ملتی ہے گھر میں ہر طرح کا آرام بھی میسر ہے، بے فکری بھی ہے کوئی تکلیف بھی نہیں تو یہ بیماری کیوں لگ گئی۔ لیکن جو اصل وجہ ہے اس کو تو سمجھا نہیں جا رہا کہ کام نہ کرنے کی وجہ سے قوت مدافعت ختم ہو گئی اور بیماری کو حملہ کرنے کا آسانی سے موقع مل گیا۔ ان لوگوں کے مقابلے میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ دیہات کی عورتیں سارا دن محنت سے کام کرتی ہیں۔ مویشیوں کے لئے چارہ تک خود بناتی ہیں۔ گھر کا کام کاج اپنے ہاتھوں سے کرتی ہیں۔ مردوں کو صبح کا ناشتہ کھیتوں میں پہنچاتی ہیں۔ سارا دن کھیتوں میں بھی کام کاج کرتی ہیں اور شام کو گھر آ کر گھر کی ذمہ داری بھی سنبھالتی ہیں تو وہ تندرست ہوتی ہیں۔ ان کو بیماری بھی نہیں لگتی۔ ان کا جسم بھی چاق و چوبند ہوتا ہے۔ موٹاپا ان کے پاس تک نہیں

پھٹک سکتا۔ وہ خوراک بھی خوب کھاتی ہیں اور ہضم بھی آسانی سے کر لیتی ہیں۔ ان کی صحت قابل رشک ہوتی ہے اور اسی طرح سے دیہاتی مرد بھی تن آسان شہریوں سے زیادہ صحت مند اور تندرست ہوتے ہیں۔

وہ قومیں جو اپنی مدد آپ کے اصولوں پر عمل نہیں کرتیں ترقی یافتہ قوموں کی دست نگر ہو کر رہ جاتی ہیں اور ترقی وہ قومیں کرتی ہیں جو اپنی مدد آپ کرتی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔ اس لئے دوسروں پر تکیہ کرنا اپنی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ اپنے کام خود کرنے چاہئیں اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالنا چاہئیں۔

گفتگو کے آداب

گفتگو ہی ایسا ذریعہ ہے جس سے کسی کے ذہنی معیار، قابلیت اور شخصیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب انسان کسی سے ملتا ہے تو گفتگو سے ہی اپنے آپ کو متعارف کراتا ہے۔ گفتگو کا اسلوب شائستہ مہذبانہ، متوازن اور شیریں ہو گا تو انسان کی شخصیت کو عظیم سمجھا جائے گا اور اگر زبان میں مٹھاس نہیں اور گفتگو شستہ نہیں بلکہ بے ربط بھی ہے تو کوئی شخص بھی اس کے متعلق اچھی رائے قائم نہیں کرے گا۔

دوران گفتگو دوسروں کی تنقید کو حوصلے سے سننا اور اس کا مدلل جواب دینا عالی ظرفی کا ثبوت ہے۔ تنقید کا جواب بردباری اور شیریں زبانی سے دینا چاہیے کیونکہ گفتگو کا اصل مقصد سمجھنا اور سمجھانا ہوتا ہے۔ تبادلہ خیالات سے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ گفتگو کے دوران حفظ مراتب کا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔ اگر گفتگو کرنے والا کوئی بزرگ ہے تو اس کے ساتھ بڑے ادب و احترام سے گفتگو کرنا چاہیے۔ اگر ہم عمر ہے تو اس سے برادرانہ گفتگو کرنا چاہیے اور اگر آپ سے چھوٹا ہے تو اسے مشفقانہ انداز سے سمجھانا چاہیے۔ اس طرح وہ یہ نہیں سمجھے گا کہ آپ اس پر اپنی بات ٹھونس رہے ہیں اور وہ بھی دوران گفتگو کوئی نازیبا بات کہنے کی جرات نہیں کرے گا۔

گفتگو کے دوران دوسرے بات کرنے والے کو بھی بات کرنے اور دلائل دینے کا پورا پورا موقع دینا چاہیے اور مخاطب کی رائے کو یکدم غلط قرار نہیں دینا

چاہیے۔ اسے سمجھائیں کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، درست تو ہے مگر اس میں یہ تبدیلی ہو جائے (یعنی جو آپ کہنا چاہتے ہیں) تو آپ کی بات کی تائید ہو جاتی ہے۔ اسے یہ احساس نہ ہونے دیں کہ آپ اس کی مخالفت کر رہے ہیں بلکہ اسے یہ پتہ چلے کہ دوستانہ ماحول میں سمجھنے اور سمجھانے کی غرض سے گفتگو ہو رہی ہے۔

مجلس میں بیٹھ کر کسی کی عیب جوئی نہیں کرنی چاہیے۔ نہ اس طرح کہ سننے والے آپ کو گھٹیا قسم کا انسان سمجھیں کہ کیسا شخص ہے جو منہ بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتا مگر غیر موجودگی میں چغلی کھا رہا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ سمجھیں کہ آپ بھی اسی قسم کے انسان ہیں۔ قرآن حکیم میں بھی ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جو شخص عیب جوئی کرتا ہے وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھا رہا ہے۔

آداب گفتگو میں یہ اصول بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ محفل میں بیٹھ کر ڈینگیں مارنے کی عادت سے کم ظرفی کا ثبوت ملتا ہے۔ عقلمند لوگ جھٹ سمجھ جاتے ہیں کہ ''جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے۔'' کے مصداق اس میں ہلکا پن پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اپنی ذہانت اور قابلیت کی دھاک بٹھانے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔ کسی کا مذاق اڑا کر اپنی برتری جتانا بھی کوئی اچھی عادت نہیں۔ اس سے دوسروں کی دل شکنی ہوتی ہے۔ کسی کی دل شکنی کرنا بظاہر تو معمولی فعل معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقوق العباد کے گناہ کبیرہ تک جا پہنچتا ہے۔ اگر مذاق کرنا ہی مقصود ہو تو ایسا شستہ مذاق کرنا چاہیے جو ہنسی خوشی تک ہی محدود ہو۔ اس میں کسی کی توہین یا تحقیر کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ اپنی برتری جتانے اور کسی کا مذاق اڑانے سے خواہ مخواہ دشمنی

پیدا ہوتی ہے۔ گفتگو تو ایسی ہونی چاہیے کہ آپ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا سکیں اور ان کی ہمدردیاں حاصل کر سکیں۔

بعض مجلسوں میں دیکھا گیا ہے کہ بات بات پر گالی گلوچ سے مخاطب کیا جاتا ہے ایسا کرنے سے فساد ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ ویسے بھی یہ شائستگی کے منافی ہے۔ اگر یہ عادت بن جائے تو لوگ آپ کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھیں گے۔ چنانچہ بیہودہ گفتگو سے بھی پرہیز کرنا چاہیے کہ اس کے ہمیشہ برے نتائج نکلتے ہیں اور خواہ مخواہ وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔

دوران گفتگو اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ کسی کی ذاتیات پر بحث نہ کی جائے۔ اس سے کسی کی عیب جوئی کا پہلو بھی نکلتا ہے اور اپنی برتری جتانے کا بھی۔ کسی کے ذاتی معاملات میں تجسس سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ اس سے بھی خواہ مخواہ کی دشمنی پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ دوسرا شخص بھی آپ کے متعلق اسی طرح سے کرید کرے گا۔ یوں ایک دوسرے کے عیوب سامنے آئیں گے۔ بلاوجہ اپنی برتری جتانے اور نجی حالات بیان کرنے سے بھی آپ دوسروں کی ہمدردیاں کھو بیٹھیں گے۔ ویسے تو فطرتاً ہر آدمی برتر ہونے کی خواہش رکھتا ہے مگر جب آپ اس کا ذکر برملا کرتے ہیں تو ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔

گفتگو کرتے وقت یہ بھی ضروری ہے کہ آپ دوسرے کے ذہن کو بھی پڑھیں۔ کئی لوگ مخصوص عقائد رکھتے ہیں۔ ان کے خلاف گفتگو کرنا بھی مخالفت مول لینے والی بات ہے۔ اگر آپ کسی کی پسند کو اپنی پسند میں تبدیل کرنا چاہتے

ہیں تو اس کی پسند کو برا نہ کہیے بلکہ ایسے انداز میں اپنی پسند کی اچھائیاں ذہن نشین کرائیں کہ وہ برا محسوس نہ کرے۔ اس کے علاوہ جس مجلس میں آپ گفتگو کر رہے ہیں یا جس فرد سے آپ گفتگو کر رہے ہیں اس کی عملی قابلیت اور ذہنی معیار کا اندازہ ضرور رکھنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ فلسفہ بیان کرنے لگ جائیں جس کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تو ایسی گفتگو لاحاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں حضورؐ کا فرمان بھی ہے کہ لوگوں کی سمجھ کے مطابق بات کرو۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں سننے والے کو ناگوار تو نہیں گزر رہا۔ اگر ایسا ہے تو اپنی گفتگو کا رخ موڑ لیں۔

لمبی، غیر متعلقہ اور فالتو بات سے پرہیز کریں۔ فرمان رسولؐ ہے کہ ''بہترین بات وہ ہے جو مختصر، مدلل، جامع، مفید اور بامعنی ہو۔''

بدکلامی اور اس کا انجام

کسی شخص کے ساتھ بد اخلاقی اور بدتمیزی سے پیش آنے اور اسے ایسے الفاظ میں مخاطب کرنے کو جو نازیبا ہوں اور جن سے اس کی عزت نفس مجروح ہوتی ہو بدکلامی یا بدزبانی کہتے ہیں۔ یہ عادت نہایت بداخلاقی میں شمار ہوتی ہے اور اس کی مثال گناہ بےلذت کی ہے کیونکہ بدکلامی کرنے والے کو اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچتا۔ کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن بدزبانی ایسا عیب ہے جس سے نقصان ضرور پہنچتا ہے مگر فائدہ کبھی نہیں ہوا۔

جو لوگ بدزبان ہوتے ہیں کوئی بھی شریف آدمی ان سے بات کرنا گوارا نہیں کرتا۔ یہ عادت جب راسخ ہو جائے تو بدنامی کا باعث بنتی ہے جس سے انسان کی شہرت داغ دار ہو جاتی ہے اور وہ کسی اچھی سوسائٹی کے قابل نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اس لئے بخشی ہے کہ وہ اپنی شیریں بیانی سے دوسرے انسانوں کو مسحور کرے۔ دشمنوں کو خوش کن گفتگو سے مسخر کرے۔ ایک آدمی خواہ کتنا ہی پڑھا لکھا ہو، کتنا خوبصورت ہو، کتنا ہی ہوشیار و چالاک کیوں نہ ہو اور کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو اگر وہ بدزبان ہے تو اس کی ساری صفات خاک میں مل جاتی ہیں۔ کوئی شخص نہ کسی کی عقل دیکھتا ہے نہ خوبصورتی اور نہ کوئی دوسری صفت۔ انسان کا سب سے پہلا تعارف اس کی زبان کراتی ہے۔ اگر زبان شیریں ہے تو سننے والا اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے لیکن اگر زبان گندی ہے تو اس سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا میں

محبت اور نفرت دو متضاد چیزیں ہیں۔ آپ خود ہی سمجھ لیں کہ محبت جس قدر اچھی صفت ہے نفرت اسی قدر بری ہے۔

والدین کو اپنی اولاد سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ دنیا میں اولاد سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی اور والدین کی محبت بھی لازوال ہوتی ہے۔ مگر جب اولاد والدین کے سامنے بدتمیزی یا بدکلامی کرتی ہے تو والدین کی محبت نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر والدین کی محبت جو بچوں کے لئے کبھی کم نہیں ہوتی اس میں فرق آ سکتا ہے تو دوسرے لوگ جن کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہیں وہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ کوئی ان سے بدتمیزی یا بدکلامی سے پیش آئے۔

دنیا کا برے سے برا انسان بھی اپنی بے عزتی اور بے حرمتی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ بدکلامی سے براہ راست کسی کی عزت و توقیر پر حملہ ہوتا ہے۔ کئی لوگ بے تکلف دوستوں میں بیٹھ کر مغلظات کا بکثرت استعمال کرتے ہیں اور یہ ان کی عادت بلکہ فطرت کا حصہ بن جاتی ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی بیٹھتے ہیں اسی طرح کی غلیظ گفتگو کرتے ہیں اور جس سوسائٹی میں وہ گفتگو کر رہے ہوتے ہیں اس کا ہر فرد ان کو نفرت بھری نگاہ سے دیکھنے لگ جاتا ہے۔ اس طرح ایسے لوگ کسی اچھی اور مہذب سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں رہتے۔ افسران کو ماتحت عملے یا پرائیویٹ ملازمین کے ساتھ بھی شستہ کلامی سے پیش آنا چاہیے۔ ان سے اگر بدکلامی کی جائے تو ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے کہ وہ جواباً بے عزتی پر اتر آتے ہیں اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب بھی ہوتے ہیں کیونکہ وہ بھی تو آخر

انسان ہی ہوتے ہیں۔ وہ بھی چاہتے ہیں کہ کوئی ان کے ساتھ برا سلوک نہ کرے۔ بدکلامی سے بسا اوقات فساد بھی ہو جاتے ہیں اور یہ بڑے بڑے نقصان کا باعث بنتی ہے۔

حلیم الطبعی، شستگی اور خوش کلامی بھی انسانیت کے زیور ہیں۔ اگر کوئی شخص ترش کلامی سے گفتگو کرتا ہے تو اس کا جواب بردباری اور نرمی سے دیا جائے تو یقیناً اس پر اچھا اثر پڑتا ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ شخص مجھے عزت سے ہم کلام کر رہا ہے تو میں بھی اس کا جواب اسی طرح دوں۔ ہمارے ہادی برحقؐ نے ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم فرمایا ہے اور خود انہوں نے اس پر عمل کر کے دکھایا۔ آپؐ نے برائی کا جواب ہمیشہ اچھائی سے دیا اور ایک دفعہ نہیں بے شمار بار اسی طرح دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ اوروں نے برائی ترک کی اور راہ مستقیم پر آ گئے۔ سو بدکلامی کے جواب میں بھی بدکلامی نہیں کرنی چاہیے۔

دنیا کے ہر معاملے میں بدکلامی نقصان دہ ہوتی ہے۔ ملازمت ہو یا تجارت دونوں حالتوں میں بدکلامی بدنامی کا باعث ہی بنتی ہے۔ اس سے کبھی فائدہ نہیں ہوتا۔ تجارت میں تو خاص طور پر بدکلامی کو ایک مکروہ فعل سمجھا جاتا ہے۔ مال لیتے ہوئے یا دیتے ہوئے اگر آپ کسی سے ذرا سی بھی بدزبانی سے کام لیں گے تو وہ آپ کو مال دے گا نہ آپ کا مال خریدے گا۔ جس سے مال آپ نے خریدنا ہے وہ سوچے گا کہ مال بیچنا ہے عزت نہیں بیچنی۔ اسی طرح سے خریدنے والا بھی کہے گا کہ مال خریدنا بے عزتی تو نہیں خریدنی۔ ہر آدمی نفرت کرنے لگ جائے گا اور

دنوں میں کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے برعکس جو دوکاندار خوش اخلاق ہیں اور حفظ مراتب کا خیال رکھ کر دوسروں سے پیش آتے ہیں ان کا کاروبار دنوں میں چمکنے لگتا ہے۔ گاہک ان سے مال خرید کر خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے سفر میں بھی وہ لوگ خوشی خوشی اپنی منزل کو پہنچتے ہیں جو خوش اخلاق ہوتے ہیں بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ دوران سفر ایسے ایسے دوست پیدا کر لیتے ہیں جو ان کی آئندہ زندگی میں ان کے بہت ہی رفیق اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔

بسا اوقات بدکلامی کی وجہ سے ایسے ایسے تنازعات پیدا ہو جاتے ہیں جو مستقل دشمنی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہر انسان کو چاہیے کہ اپنے ذاتی اور ملی مفاد کے لئے اور قوم و ملک کی ترقی کے لئے خوش اخلاقی کو اپنا شعار بنائے اور بدکلامی سے اجتناب کرے۔

لائبریریوں کی ضرورت اور اہمیت

علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت کے لئے فرض قرار دے دیا گیا ہے اسی طرح علم سکھانا اور اس کو فروغ دینا بھی بہترین اعمال میں سے ہے۔ لائبریریاں علم کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ لائبریریوں کے قیام اور ان کے ذریعے علم کے فروغ کے بغیر کوئی قوم عروج حاصل نہیں کر سکتی۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی مسلمانوں کا اقبال جب عروج پر تھا تو اس وقت کتب خانوں کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ مولانا فرماتے ہیں۔

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

مسلمانوں نے ہندوستان پر ہزار سال تک حکومت کی۔ انہوں نے بہت سی لائبریریاں اور کتب خانے قائم کئے۔ شاہان دہلی و اودھ کے گراں بہا کتب خانے نیز ٹیپو سلطان اور دیگر امراء کے کتب خانے اس وقت کے نوادرات کے ذخیروں میں شمار ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ہی انگریز حکمران انہیں ایک ایک کر کے اٹھا کر لے گئے۔ انڈیا آفس لائبریری میں ایک بہت بڑا کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے جو انگریز ہندوستان ہی سے لے کر گئے تھے۔

''لندن کا برٹش میوزیم'' بقول سر سید احمد خاں کتابوں کا ایک بڑا ''جنگل'' ہے۔ یہ میوزیم انگریز کی علم دوستی اور علمی شغف کا ایک بین ثبوت ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں کتب خانوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ امریکہ، جرمنی، فرانس اور

دیگر ترقی یافتہ ممالک کے کتب خانے اپنی مثال آپ ہیں۔ متحدہ ہندوستان میں عہد مغلیہ تک کتب خانوں کی یہی کیفیت تھی برصغیر پاک و ہند علم و فضل کا بحر بیکراں تھا۔ دور دراز سے سیاح آ کر انہی کتب خانوں سے مستفیض ہوتے تھے۔ یہاں پر اس قدر کتب خانے تھے کہ اگر ان کے نام لکھے جائیں تو ایک اچھی بھلی کتاب بن جائے۔ یہ عظیم سرمایہ کچھ تو ۱۸۵۷ء کی نذر ہو گیا اور کچھ انگریز اپنے ملک میں لے گئے۔

لائبریری کتابوں کا ایسا ایک مشترکہ سرمایہ ہوتا ہے جہاں سے لوگ علم کی پیاس بجھاتے ہیں۔ ہر آدمی بڑی بڑی قیمتی کتابیں خریدنے کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اگر ہو بھی سکتا ہو تو کتاب کو ایک دفعہ پڑھ کر اسے زینت طاق بنا دیتا ہے۔ اگر یہ کتاب لائبریری میں ہو گی تو اس کو ایک آدمی نہیں پڑھتا بلکہ بے شمار آدمی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس طرح ایک کتاب مدتوں تک چشمہ فیض بنی رہتی ہے۔

لائبریریاں جس قدر بلند پایہ کی ہوں گی اور تعداد میں زیادہ ہوں گی اسی قدر لوگوں کی علم کی پیاس بجھا سکیں گی اور جہالت کی تاریکی دور ہو گی۔ لائبریریوں سے شوق مطالعہ بھی بڑھتا ہے اور اچھی اچھی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام بھی بڑھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحبان علم اور اہل قلم کی قدر و قیمت بڑھتی ہے اور ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ تلاش علم کا کام بڑھتا ہے، نئے نئے علم و فنون کا پتہ چلتا ہے۔ تحقیق و تجسس کا کام ترقی پذیر ہوتا ہے۔

لائبریری ایک صدقہ جاریہ ہے۔ جب تک قائم رہے گی لوگ اس چشمہ سے

فیض یاب ہوتے رہیں گے اور ان کے قائم کرنے والوں کو اس کا اجر ملتا رہے گا۔ اگر ہمارے ہاں لائبریریوں کی کثرت ہو تو حصول علم کے لئے ہمیں اغیار کا محتاج نہیں ہونا پڑے گا۔

لائبریریوں کو فنون کے اعتبار سے بھی مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک شہر میں مختلف لائبریریوں میں ایک لاکھ کتب ہیں تو ان کو الگ الگ عمارتوں یا حصوں یا سیکشنوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصے میں ''انگریزی زبان کی قدیم و جدید تصنیفات ہوں۔ دوسرا کسی اور زبان کے لئے مخصوص ہو۔ تیسرا اردو زبان کی تصنیفات کے لئے ہو، چوتھا عربی فارسی کے لئے، پانچواں سائنسی علوم کے لئے ہوں اور اگر ان میں بھی کتابیں بہت زیادہ ہو جائیں تو ان میں بھی تخصیص کر دی جائے۔ مثلاً سائنس اور انجینئرنگ کی کتب الگ الگ کر دی جائیں، طبی کتب الگ ہوں، الیکٹرک سے متعلق الگ ہوں۔ اس طرح مطالعہ کرنے والے کے لئے آسانی ہو جاتی ہے اور تحقیق و تجسس کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔

لائبریریوں میں ہر مزاج اور ہر معیار کی کتب کا ہونا لازمی ہے۔ بچوں کے مطالعہ کے لئے الگ کتابچے اور رسالے ہونا چاہئیں۔ یہ ضروری نہیں کہ لائبریری میں صرف بڑے بڑے عالم فاضل ہی جا کر مطالعہ کر سکتے ہیں۔ بچے بھی جا سکتے ہیں بلکہ بچوں سے ہی تو ترقی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ان کے اذہان کو علم سے آراستہ کرنا قوم کی ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ان میں مطالعہ کا شوق ترقی کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہے۔ بچوں کے لئے ہلکی پھلکی اور دلچسپ کتابیں مہیا

کرنا اور انہیں ان کتابوں سے استفادہ کرنے کا سلیقہ سکھانا ہمارا فرض ہے۔

ملک وقوم کی ترقی کے لئے علم کو فروغ دینا بہت ہی ضروری ہے۔ مدرسوں میں نصاب بہت محدود ہوتا ہے۔ اس لئے علم کو وسعت دینے کے لئے لائبریریوں کا قیام بہت ضروری ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

زرمبادلہ کی اہمیت

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی ملک کی معیشت کے استحکام کا انحصار اس کی بیرونی تجارت پر ہے اور بین الاقوامی تجارت کے لئے زرمبادلہ کی ضرورت ہے۔ ہر ملک کی کرنسی علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے۔ اس لئے بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینے کے لئے ضروری ہے، کافی زرمبادلہ موجود رہے۔ یہی وجہ ہے کہ زرمبادلہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ دوسرے ممالک سے معاشی رشتوں کو استوار کرنے اور لین دین کا عمل جاری رکھنے کے لئے ہر ملک زرمبادلہ کا محتاج ہے۔

مثال کے طور پر ایک پاکستان تاجر امریکہ سے ایک لاکھ روپے کی مشینری درآمد کرتا ہے۔ امریکہ میں ہم جس فرم سے مشینری خریدتے ہیں وہ ہماری پاکستان کرنسی قبول نہیں کرتی کیونکہ پاکستان کرنسی امریکی تاجر کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ تو ڈالر لینا پسند کرے گا۔ لہٰذا پاکستانی تاجر کے لئے ضروری ہوگیا کہ اس مشینری کی قیمت وہ ڈالروں میں ادا کرے۔ اسی طرح سے اگر کوئی امریکی تاجر پاکستان سے کپاس درآمد کرتا ہے تو اسے کپاس کی قیمت پاکستان روپیہ میں ادا کرنا ہوگی۔ انفرادی بیرونی تجارت کا یہی اصول بین الاقوامی سطح پر بھی لاگو ہوتا ہے کہ جو مال ہم باہر سے منگوائیں اس کی قیمت ہماری اشیا برآمد سے نہ بڑھنے پائے۔ ہر حال میں ہمارا زرمبادلہ برابر ہونا چاہیے۔

ہمیں اپنے ملک کی صنعت کو ترقی دینے کے لئے مشینری اور دیگر صنعتی اشیاء اور پرزہ جات درآمد کرنا پڑتے ہیں۔ چونکہ ہمارا ملک بنیادی طور پر ایک زرعی

ملک ہے اس لئے ہمیں بیرون ملک سے اشیاء برآمد کرنے کے لئے زرمبادلہ کی ضرورت ہے۔ ہمارا یہ مقصد زرمبادلہ کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہم اپنی فالتو پیداوار کو بیرونی ممالک میں فروخت کرتے ہیں۔ اس طرح سے جو زرمبادلہ ہم ملکی پیداوار سے حاصل کرتے ہیں اس سے ہم اس مال کی قیمت ادا کرتے ہیں جو ہم بیرون ملک سے درآمد کرتے ہیں۔ یہ درآمدات خواہ صنعتی مشینری کی صورت میں ہوں یا فالتو پرزے ہوں یا اسلحہ ہو۔ کسی ملک کی صنعتی ترقی اور معاشی استحکام کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اپنے ملک کی پیداوار بیرون ملک فروخت کرکے زیادہ سے زیادہ زرمبادلہ کمائیں۔ ہم اپنی برآمدات کو جتنا بڑھائیں گے اور درآمدات کو جتنا گھٹائیں گے اتنا ہی ہمیں معاشی استحکام حاصل ہوگا۔ ہمیں دوسری ادائیگیوں میں آسانی رہے گی اور ہمارا ملک جلد ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔ چنانچہ ہمیں اپنے ملک کی پیداوار پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینا چاہیے اور رات دن محنت کرکے ملکی پیداوار کو بڑھانا چاہیے۔

زرمبادلہ ایک ایسی دولت یا سرمایہ ہے جس سے ہم بیرون ملک سے اشیائے درآمدات کی قیمت ادا کرسکتے ہیں اور یہ ہر دور اور ہر قسم کے حالات میں کام آنے والی چیز ہے۔ صنعتی اور تجارتی فوائد کے علاوہ بھی زرمبادلہ ایسے حالات میں فائدہ مند ہوتا ہے جب کبھی کسی ملک میں اشیائے ضرورت کی قلت پیدا ہو جائے یا کسی وقت ایسے حالات پیدا ہو جائیں جب درآمدات ناگزیر ہو جائیں مثلاً ادویات تو چیزیں باہر سے ہی منگوانا پڑتی ہیں۔ یہ چیزیں ہمیں بالعموم امریکہ جرمنی انگلینڈ اٹلی

وغیرہ سے منگوانا پڑتی ہیں۔ ایسے میں اگر ہمارے پاس زرمبادلہ ہوگا تو ہم آسانی سے منگوا سکیں گے۔ ناسازگار حالات اور آسمانی آفات اور قحط وغیرہ پڑ جانے کی صورت میں بھی زرمبادلہ ہمارے بہت کام آتا ہے۔ اگر زرمبادلہ ہوگا تو باہر سے خوراک اور دیگر سامان منگوایا جا سکتا ہے۔ ورنہ ملک بہت بڑی مشکلات میں پھنس جاتا ہے۔ ایسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی زرمبادلہ بہت ضروری ہے۔

زرمبادلہ برآمدی اور درآمدی تجارت کا ذریعہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زرمبادلہ سے یہ بھی فائدہ پہنچتا ہے کہ کسی ملک کے آجر اور پیدائش کنندگان دوسرے ملکوں کے مقابلہ کے خطرے کی وجہ سے اپنی پیداوار اور مصنوعات کے معیار کو برقرار رکھتے ہیں اور اس میں روز بروز ترقی کی نئی نئی راہیں نکالتے رہتے ہیں تاکہ ان کے مال کی مانگ بڑھے۔ اس کے علاوہ جب درآمدی اور برآمدی کاروبار کو فروغ ملتا ہے تو ایک ملک کے تجارتی وفود دوسرے ممالک میں جاتے ہیں اور ان کے درمیان تجارتی معاہدے ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں ان کی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور باہمی تعلقات بڑھتے ہیں۔ ان وفود کی وجہ سے ممالک کے درمیان خیر سگالی کا جذبہ بڑھتا ہے۔

زرمبادلہ بہت ہی اہم چیز ہے۔ اس لئے دنیا کے ہر ملک نے چاہے وہ ترقی یافتہ ہو یا ابھی ترقی کر رہا ہو زرمبادلہ پر اپنا کنٹرول رکھا ہوا ہے تاکہ اشیا درآمدات کی قیمت اشیا برآمدات سے بڑھ نہ جائے اور قیمت ادا کرنے میں تکلیف نہ ہو۔ حکومت پاکستان نے یہ ذمہ داری سٹیٹ بنک آف پاکستان کے سپرد کر رکھی ہے۔

برآمدات کے بدلے میں جو زرمبادلہ کمایا جاتا ہے وہ سٹیٹ بنک کی تحویل میں رہتا ہے اور اس کے ذریعے اشیا درآمدات کی قیمت ادا کی جاتی ہے۔ جو لوگ تجارت کی غرض سے یا تفریحی مقاصد کے لئے باہر جاتے ہیں ان پر بھی بنک کڑی نظر رکھتا ہے۔ حجاج کرام کے لئے علیحدہ کرنسی نوٹ جاری کئے جاتے ہیں۔ بہر حال زرمبادلہ ہر ملک کے لئے بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لئے ہم پاکستانیوں کو چاہیے کہ اپنی برامدات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کریں تا کہ ہمارے ملک کو معاشی استحکام حاصل ہو۔

All rights reserved.
©2002-2006

معاشرتی خرابیاں اور ان کی اصلاح

لکڑی کو گھن اور معاشرے کو برائیاں کھا جاتی ہیں۔ معاشرتی برائیوں کو اس قدر فروغ حاصل ہو چکا ہے کہ نہ صرف ذاتی زندگی بلکہ ہماری قومی اور اجتماعی زندگی بھی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔ اگر کہا جائے کہ برائیوں نے ہمیں نہیں گھیرا بلکہ ہم نے خود ہی برائیوں کو اپنے اوپر حاوی کر لیا ہے تو غلط نہ ہو گا کیونکہ برائیاں خود نہیں آ جاتیں ہماری اپنی کوتاہی، سستی اور دین سے بے زاری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہم مغربیت کے جنون میں اپنا آپ بھلا بیٹھے ہیں۔ ہم نے اپنی صلاحیتوں اور اقدار کو خیر باد کہہ دیا ہے اور ہماری زندگی کا سب سے زیادہ افسوسناک اور خطرناک پہلو یہی ہے جس نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ مادی اقدار کی یلغار نے ہمارے معاشرے میں ہمدردی، جذبہ ایثار، اخوت، رحمدلی، انصاف جیسے روایتی جذبات و احساسات کو کمزور کر ڈالا ہے۔ سیم و زر کی ہوس اور عیش کوشی نے ہمیں بالکل بے راہ رو کر دیا ہے۔ ہماری مقدس مجلسی اور تہذیبی روایات براہ راست ان برائیوں سے متاثر ہو چکی ہیں۔ ہر میدان اور ہر شعبہ کاروبار میں خود غرضی اور ذاتی منفعت پرستی نے اصول پرستی اور قومی مفاد کی جگہ لے لی ہے۔ اتفاق و اتحاد کی بجائے تفریق و منافقت فروغ پا رہی ہے۔ علاقائی اور لسانی تعصب نے ہماری ملی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ ہماری خود غرضیوں نے ہمیں رشوت، ناانصافی اور بدعنوانیوں کے لامتناہی چکر میں پھنسا دیا ہے۔ ہر شخص پریشان و مضطرب نظر آتا ہے۔

جب قوموں کے دلوں سے خدا کا خوف جاتا رہتا ہے تو ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ احکام الٰہی سے سرکشی اور الحاد کے نظریات کو اپنانا یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن سے یہ خرابیاں پیدا ہونا لازمی ہیں۔ اس ہمہ گیر خرابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے ہادی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کو بالکل بھلا کر شیطانیت کو اپنا لیا ہے۔ جب ہمارے دل میں یہ تصور ہی باقی نہیں رہا کہ ہم نے ایک دن خدا کے سامنے پیش ہو کر جواب دہ ہونا ہے تو خوف کس چیز کا ہے۔ بس ہمارے مدنظر تو دنیا کی شان و شوکت اور عیش و آرام ہے۔ معاشرتی تقاضوں کا شعور ہم میں رہا ہی نہیں، یہ قوم کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ غالب اکثریت معاشرتی مسائل کے حل کے لئے نہ کبھی سوچتی ہے اور نہ کار خیر میں حصہ لینے کے لئے کسی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ انہیں اپنی خودغرضیوں سے ہی فرصت نہیں۔ وہ قومی اور ملی مسائل پر کیوں دماغ خراب کریں۔ وہ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ہم نے اپنا فلاں کام کس طرح نکالنا ہے۔ چاہے یہ مسئلہ رشوت سے حل ہوتا ہو یا کسی کا حق مارنے سے ان کا مطلب نکلتا ہو اگر کسی کو قتل کرنے سے انہیں فائدہ پہنچتا ہو تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ جب اس قدر بے حسی اور لاتعلقی پیدا ہو جائے تو اجتماعی مفادات کی کون پاسبانی کرتا ہے؟ اجتماعی مفادات کے لئے بعض اوقات ذاتی مفادات کو بھی قربان کرنا پڑتا ہے مگر جذبہ ایثار و قربانی اور ہمدردی ہی مفقود ہو جائے تو کیا ہو سکتا ہے اور ساری قوم اپنی برائیوں سے نالاں بھی ہے اور پھر ان پر عمل پیرا بھی ہے۔ انہیں پتہ بھی ہے کہ یہ برائی ہے مگر برائی سے بچ کر بھی

نہیں چلتے۔

احساس ذمہ داری ایک ایسا جذبہ ہے جو غلط سے غلط انسان کو بھی درست راہ پر لے آتا ہے۔ وہ غلطی، غلطی نہیں ہوتی جس میں غلطی کرنے کی نیت کارفرما نہ ہو۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے ہمارے اندر احساس ذمہ داری بالکل رہا ہی نہیں۔ جب ہمیں احساس ہی نہیں کہ ہم پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور ہمیں کس طرح ان سے عہدہ برآ ہونا ہے تو ایسے میں اصلاح کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ البتہ اس کی بجائے اپنی غلطی کو دوسرے کی غلطی گردانا یا اپنی ذمہ داری کو دوسرے کے کندھوں پر ڈال دینا عام معمول ہو چکا ہے۔

ہماری قومی زندگی کا ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم منافقت سے کام لیتے ہیں ہمارے قول و فعل میں تضاد ہے۔ ہمارے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان پر کچھ اور۔ اس طرح قومی مسائل حل نہیں ہوا کرتے بلکہ الجھ کر رہ جاتے ہیں اور نتیجتاً بجائے فائدہ کے ہمیں نقصان ہوتا ہے۔ ہم میں یہ نقص بھی ہے کہ ہم باتیں تو بہت کرتے ہیں مگر عملی طور پر بالکل صفر ہوتے ہیں۔ ہم دوسروں کو نصیحتیں کرتے ہیں مگر کبھی اپنا احتساب نہیں کرتے۔ اگر ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر درست سوچے اور درست کام کرے تو اس سے ساری قوم ٹھیک ہو جاتی ہے کیونکہ افراد کے مجموعے ہی سے قومیں بنتی ہیں۔

ایک اور خرابی ہماری قوم کے مزاج میں رچ گئی ہے کہ ہم ہلڑ بازی، بدنظمی، ہنگامہ آرائی اور شوریدہ سری سے اپنا مطلب حاصل کرنا پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ

ایسا کرنے سے بہت سوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ افراتفری پھیلتی ہے۔ ایسا کرنے سے ہم غلط ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ نیز ہمارے لئے وقت بھی کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ جبکہ وقت سونے سے بھی زیادہ قیمتی چیز ہے ہمیں وقت کے ضیاع کا احساس نہیں رہا ہمیں ان برائیوں کی بجائے اپنے اندر قومی سوچ پیدا کرنی چاہیے۔ تب قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ کام ہو سکے گا۔ جب تک ہم خوف خدا کو اپنے دلوں میں جگہ نہیں دیتے اور اسوۂ حسنہ کو نہیں اپناتے تب تک یہ برائیاں ختم نہیں ہو سکتیں۔ خوف خدا اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی میں تمام مسائل کا حل موجود ہے۔

All rights reserved. ©2002-2006

قلم اور تلوار

کوئی پوچھ لے مرد مختار سے
قلم تیز چلتا ہے تلوار سے

قلم دیکھنے میں ایک معمولی چیز نظر آتی ہے۔اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہوتی اور اس کا کوئی خاص وزن بھی نہیں ہوتا۔ بظاہر قلم جسامت وضخامت میں بھی کوئی شے نہیں۔لیکن اس کے اندر بڑی طاقت ہے۔صاحب قلم صاحب علم ہوتا ہے، وہی سرفراز ہوتا ہے۔اسی کا حکم چلتا ہے۔قلم ہی سے علم حاصل کیا جاتا ہے۔اگر جنگجو کا ہتھیار تلوار ہے تو عالم فاضل اور صاحب امر کا ہتھیار قلم ہوتا ہے۔جس نے قلم کو ہاتھ میں لیا اسے عزت اور دولت ملی اور جس نے اسے چھوڑ دیا وہ ناکام و نامراد رہا۔ترقی،عزت اور دولت ہر شے سے محروم ہوگیا۔

تاریخ نے جتنے بڑے بڑے فلاسفر،حکماء،فضلاء، دانشور،مصور، سائنسدان، شاعر،ادیب،مصنف،ڈاکٹر،انجینئر پیدا کئے ہیں سب کے سب قلم کی بدولت ہی نامور ہوئے اور اگر وہ قلم نہ پکڑتے تو علم حاصل نہ کر سکتے اور اگر علم حاصل نہ کرتے تو کچھ بھی نہ بن سکتے۔صاحب قلم لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں فلاسفر اپنے اصول اور اپنے افکار وخیالات چھوڑ جاتے ہیں۔حکماء اپنے قول اور اصول تشخیص و علاج چھوڑ جاتے ہیں۔فضلاء و دانشور اپنا علم چھوڑ جاتے ہیں۔ سائنسدان اپنی ایجادات اور اپنی تحقیق چھوڑ جاتے ہیں۔شاعر،مصنف اور ادیب اپنی تصانیف چھوڑ جاتے ہیں۔ڈاکٹر انجینئر بھی اپنی زندگی کے تجربات چھوڑ

جاتے ہیں۔ اگر یہ قلم کا سہارا نہ لیتے تو ان کے نام ان کی موت کے ساتھ ہی دفن ہو جاتے۔ اگر آج ان کے نام زندہ ہیں تو محض قلم کی بدولت۔

دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک کے افراد نے علم حاصل کیا۔ وہ تحقیق و تجسس میں لگے رہے۔ انہوں نے سائنس میں ترقی کی، تجارت و صنعت میں ترقی کی، زراعت میں ترقی کی، دولت میں ترقی کی اور اپنا عزت و وقار بڑھایا۔ انہوں نے انجن، بجلی، جہاز، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسری ایجادات کیں۔ سمندر، پہاڑ، زمین و آسمان، چاند، سورج کو تسخیر کیا۔ آگ، پانی، ہوا پر کنٹرول کیا۔ آج انسان چاند سے بھی آگے نکلنا چاہتا ہے۔ سائنس نے مصنوعی دماغ ایجاد کر لیا ہے۔ مصنوعی انسان بنا لیا ہے، نامراد اور مہلک امراض کا علاج دریافت کر لیا ہے۔ انسانوں کے لئے آرائش و آسائش کا سامان پیدا ہو گیا ہے۔ دور دراز کے ملک بھی ایک دوسرے کے نزدیک ہو گئے ہیں۔ دنیا کے ایک کونے پر کھڑا انسان دنیا کے دوسرے کونے کے حالات و واقعات سے باخبر رہے۔ یہ سب کس طرح ہوا اور کس کی بدولت ہوا۔ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ علم کی بدولت اور علم قلم کا دوسرا نام ہے۔

دوسری طرف تلوار ہے۔ تلوار بھی کم اہمیت کی حامل نہیں۔ تلوار طاقت کا دوسرا نام ہے۔ طاقت ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے حکمران حاکم کہلاتا ہے۔ بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے۔ طاقت سے ہی دشمن کو زیر کیا جاتا ہے۔ طاقت سے ہی سکندر یونان سے ہندوستان تک پہنچا اور فتح و نصرت کے پرچم لہراتا چلا آیا۔ تلوار کی طاقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی درست ہے کہ جس کے پاس تلوار ہو گی یا

طاقت ہو گی وہی صاحب امر ہو گا اور صاحب امر کے ماتحت صاحب قلم ہو گا۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے آج جس کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں اسے ہی طاقت ور سمجھتے ہیں۔ مگر یہ ایٹم بم تیار کس طرح ہوئے ان کو تلوار نے تیار کیا یا قلم نے جب کہ قلم کا دوسرا نام علم ہے تو جواب ہو گا علم کی بدولت ہی یہ سب کچھ تیار ہوا۔ معلوم ہوا کہ طاقت بھی علم کی محتاج ہے۔ طاقت اور ترقی کے لئے بھی علم کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ علم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

قلم کے اثرات زیادہ دیرپا اور مضبوط ہوتے ہیں۔ قلم کے نقش صدیوں تک محفوظ رہتے ہیں۔ قلم کے کارناموں سے ہزاروں سال تک یا یوں کہئے کہ جب تک یہ دنیا قائم ہے علم کے شیدائی استفادہ کرتے رہیں گے۔ جس تلوار کو قلم کی حمایت حاصل نہیں ہو گی اس کی طاقت ناپائیدار اور بے اثر ہو گی۔

تلوار نے ظالموں کے سر قلم بھی کئے ہیں۔ تلوار نے ظلم کو دبایا بھی ہے اور بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس تلوار نے ظلم بھی کئے جیسا کہ چنگیز خاں کی تلوار نے کیا۔ اس وقت اسرائیل کیا کر رہا ہے۔ چنانچہ تلوار انصاف کے لئے بھی چلتی ہے اور ظلم کے لئے بھی لیکن قلم جس کا دوسرا نام علم ہے قوموں کو مہذب بناتا ہے اور ظلم نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ علم حق و انصاف کا علمبردار ہے اور ہر مظلوم سے ہمدردی کا سبق دیتا ہے۔

جب ہم قلم اور تلوار کا مختلف پہلوؤں سے موازنہ کرتے ہیں تو مسابقت کے میدان میں قلم ہی کو آگے پاتے ہیں۔

کفایت شعاری

روزمرہ کے اخراجات جو زندگی کی گاڑی چلانے، عزت اور صحت کو بحال رکھنے اور دوسرے حق داروں پر خرچ کرنے کے لئے ضروری ہیں کے علاوہ غیر ضروری اور نامناسب اخراجات سے احتراز کرنے اور اعتدال پسندی کو اپنا شعار بنانے کو کفایت شعاری کہتے ہیں۔

کفایت شعاری ایسی عادت ہے جو ہر حالت میں مفید ثابت ہوتی ہے اور ایسا عمل ہے جو ہر حال میں مدد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ تندرستی ہو یا بیماری، تیزی ہو یا مندہ، جنگ ہو یا امن، انسان گھر پر ہو یا باہر، کفایت شعاری تفکرات اور پریشانیوں کو کم کرتی ہے اور زندگی خوش اسلوبی اور چین سے گزرتی ہے۔ ضرورت کے لئے خرچ تو بہر حال کرنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی ضرورت کے مطابق کرتا ہے۔ کوئی ضرورت سے زیادہ کرتا ہے۔ کوئی ضرورت پر بھی نہیں کرتا۔ گویا یہ مختلف طریقے ہیں جن سے انسان زندگی گزارتا ہے۔ لیکن ان سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ کفایت شعار اور اعتدال پسندی کو اپنا شعار بنایا جائے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے ''بیشک فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں'' اور حضور رسول اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''بہترین کام وہ ہیں جن میں میانہ روی اختیار کی جائے۔'' فضول خرچی نہ خدا کو پسند ہے نہ رسولؐ کو۔ اس میں اپنا بھی نقصان خون پسینہ سے کمایا ہوا روپیہ فضول اور غیر ضروری کاموں پر خرچ کر دینا اور خود تکلیف اٹھانا بھی تو کوئی عقمندی نہیں ہے۔ ایک تو روپیہ کا ضیاع اور دوسرے اپنے اور اپنے بال بچے کو

محروم کر دینا دور اندیشی کے یکسر منافی ہے۔ اسی طرح بخل کے لئے بھی ارشاد نبویؐ ہے کہ بخیل آدمی خواہ کتنا بھی متقی اور پرہیز گار کیوں نہ ہو جنت میں نہیں جائے گا۔ کیونکہ جو شخص روپیہ پیسہ رکھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کھانے پینے کی لذتوں سے محروم رکھتا ہے وہ ان لوگوں پر جو اس کے پیسے میں حقدار ہیں یعنی یتیم ہیں، مسکین ہیں، حاجت مند، کمزور یا بیمار ہیں کب خرچ کرے گا۔ اس کا پیسہ نہ اس کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے نہ دوسروں کے لئے۔ لہٰذا اسلام نے بخل سے بھی احتراز کرنے کا حکم دیا ہے۔

ہمیں سادہ زندگی گزارنا چاہیے۔ اس سے تسکین بھی رہتی ہے اور فضول خرچی کے نقصانات سے بھی انسان بچا رہتا ہے۔ فضول خرچ ہمشہ پریشان ہی دیکھے گئے ہیں چاہے انہیں کتنی بھی آمدن کیوں نہ ہو۔ بیاہ، شادی، غمی، خوشی پر بے جا اسراف ہوتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ وہی روپیہ ایسے ضروری کاموں پر لگایا جائے جن سے ملک وقوم کی خدمت ہو سکے۔ امراء تو زیادہ خرچ کر سکتے ہیں مگر غریب لوگ بھی اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ وہ محض جھوٹا بھرم قائم رکھنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ اگر سادہ زندگی بسر کرنے اور اعتدال پسندی کی عادت پڑ جائے تو تقریبات بھی سادگی سے سرانجام دی جا سکتی ہیں۔ ملمع سازی، جھوٹا وقار اور تصنع پسندی انسان کو ذلیل کر کے رکھ دیتی ہیں اور وہ ضروری کام جن پر ترقی کا انحصار ہوتا ہے ادھورے رہ جاتے ہیں۔ فضول خرچی سے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں جبکہ کفایت شعاری کو اپنانے سے تنگدستی اور افلاس سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔

فضول خرچی ہمارا روزانہ کا معمول بن چکی ہے۔ ہم اپنی ضرورت اور استعداد سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں۔ جہاں پر پچاس روپے کے جوڑے سے باعزت گزارہ ہوسکتا ہے ہم محض خودنمائی خاطر سو دوسو خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور مہنگے سے مہنگے درزی سے سلوانا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ فضول خرچی کی دوڑ میں ہم بھی شریک ہو چکے ہیں۔ امیر کی دیکھا دیکھی غریب بھی اسی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ سادہ زندگی بسر کرنے میں پہل امیر طبقے کو کرنا چاہیے ورنہ معاشرہ کبھی ٹھیک نہیں ہوسکتا۔ غریب اپنی جھوٹی عزت بنانے کے لئے مجبور ہے۔ اس لئے کہ وہ ایسا نہیں کرتا تو اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ یہ مسئلہ انفرادی نوعیت کا نہیں بلکہ اجتماعی قسم کا ہے۔

ہمارے ملکی حالات کا بھی یہی تقاضا ہے۔ ہم اسراف سے احتراز کریں۔ ہماری بے شمار ضروریات ایسی ہیں جن کے لئے ہمیں سرمایہ کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے بہت سے ایسے منصوبے نامکمل پڑے ہیں جن پر ہماری اقتصادی ترقی کا انحصار ہے۔ جو روپیہ ہم فضول خرچی میں ضائع کرتے ہیں اگر اسے بچا کر ان منصوبوں پر لگایا جائے تو ملک کی معاشرتی ترقی میں مدد مل سکتی ہے اور سارا ملک چند سالوں میں خوشحال و فارغ البال ہوسکتا ہے۔

کفایت شعاری کو اپنانے کے لئے روزمرہ کا حساب لکھنا ضروری ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کون سی مد ایسی ہے جس میں خرچ زیادہ ہو رہا ہے تاکہ اسے کنٹرول کیا جائے اور سادہ زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ ہمیں چاہیے

کہ خرچ کرتے وقت کئی بار سوچا جائے۔ آیا یہ ہمارے لئے ضروری ہے، غیر ضروری تو نہیں۔ اگر ضروری ہے تو بھی اعتدال سے خرچ کیا جائے اور اگر غیر ضروری ہے تو بالکل خرچ نہ کیا جائے۔ تھوڑا تھوڑا بھی پس انداز کیا جائے تو بڑی رقم بن جاتی ہے۔ دانہ دانہ می شود بسیار۔ تھوڑی آمدن میں سے بھی کچھ نہ کچھ بچا لینا عقلمندی اور دوراندیشی کا تقاضا ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

زراعت

زندگی گزارنے کے لئے انسانوں نے مختلف قسم کے پیشے اختیار کر رکھے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ اتم کھیتی، نکھد چاکری یعنی سب سے اچھا پیشہ کھیتی باڑی یا زراعت ہے اور سب سے گھٹیا پیشہ چاکری یعنی ملازمت ہے۔ چنانچہ زراعت ان میں سے اعلیٰ ترین پیشہ میں شمار ہوتی ہے۔ زراعت ہمارے ملک کی سب سے زیادہ آمدن کا ذریعہ ہے۔ اسی فیصد لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ اس میں عزت و وقار خدمت، خلوص اور محنت سب کچھ پایا جاتا ہے۔ ہمارا ملک بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور لوگوں کی اکثریت اسی پیشے کو اپنائے ہوئے ہے۔ وہ کھیتی باڑی کر کے اسی میں سے اپنی تمام ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔

مشینی دور سے پہلے کھیتی باڑی بہت ہی مشکل کام تھا مگر اب بہت سی سہولتیں میسر آ گئی ہیں۔ پہلے زمانے میں بیلوں کے ذریعے ہل چلایا جاتا تھا۔ سوہاگہ بھی بیلوں سے چلاتے تھے اور گہائی بھی انہی سے کرتے تھے۔ کھیتوں کو پانی بھی رہٹ کے ذریعے دیتے تھے۔ مگر اب ہر کام ٹریکٹر اور ویٹ تھریشر کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ پہلے کسان ایک دن میں بمشکل ایک ایکڑ زمین پر ہل چلا سکتا تھا مگر اب ایک دن میں ایک مربع زمین تک میں ہل چلایا جا سکتا ہے۔ رہٹ کے ذریعے تھوڑی سی زمین سیراب ہو سکتی تھی مگر اب نہروں اور ٹیوب ویلوں کے ذریعے گھنٹوں میں کھیت سیراب کئے جا سکتے ہیں۔ اب طرح طرح کی کھاد بھی دستیاب ہے جس سے ایک فصل کی بجائے تین تین فصلیں لی جا سکتی ہیں۔ زمین آج کل سونا اگل

رہی ہیں۔زمینوں کی آمدن کئی گنا زیادہ ہوگئی ہے۔فی ایکڑ پیداوار میں تین چار سو فیصد اضافہ ہوگیا ہے۔گورنمنٹ نے محکمہ زراعت اس مقصد کے لئے قائم کر رکھا ہے کہ زمینداروں اور کاشت کاروں کو تجربات کر کے مفید مشورے دے۔انہیں بیج اور کھاد کی سہولتیں بہم پہنچائے۔زرعی بنک زمینداروں کو مشینری خریدنے کے لئے قرضے دیتے ہیں تا کہ پیداوار زیادہ ہو ملک جلد ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے بھی کاشتکاروں کے لئے ہدایات نشر کی جاتی ہیں۔

زمیندار یا کاشتکار کی ایک چھوٹی سی بادشاہت ہوتی ہے۔اس میں وہ خود مختار ہوتا ہے۔وہ اپنی اس ریاست میں زمین بھی رکھتا ہے۔اس کا گھر بھی اسی میں ہوتا ہے۔وہ بالکل آزاد ہوتا ہے۔وہ جس قدر دیکھ بھال کرے گا اسی قدر اپنی آمدن بڑھالے گا۔کہتے ہیں جتنا ہل اتنا پھل۔زمین پر جتنی محنت کی جائے پیداوار میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے۔یہ پیشہ اس قسم کا ہے جس میں نقصان نہیں ہوتا۔اگر خدانخواستہ کبھی کسی قدرتی آفت کی وجہ سے نقصان بھی ہو جائے تو قدرت اگلی فصل پر اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔آج تک یہ دیکھنے میں کبھی نہیں آیا کہ فلاں شخص نے زمین پر محنت کی اور اسے نقصان رہا۔جدید آلات کے استعمال،طرح طرح کی کھاد کی سہولتوں اور زرعی مشوروں نے زراعت کو اور بھی آسان اور نقصان کے احتمال سے مبرا کر دیا ہے۔صرف توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔پہلے ایسا بھی ہوتا تھا کہ کیڑے مکوڑے فصل کو تباہ کر دیتے تھے مگر آج کل یہ خدشہ بھی باقی نہیں رہا۔ ایسی ادویات ایجاد ہو چکی ہیں جن کو سپرے کرنے سے کیڑے مر جاتے ہیں اور

فصل کی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ زمین کا سیم تھور ختم کرنے کے لئے جپسم نکل آیا ہے جو سیم کو ختم کر دیتا ہے اور مردہ زمین بھی زندہ ہو جاتی ہے۔ گویا اب زراعت پہلے سے بھی زیادہ منفعت بخش، پروقار اور باعزت پیشہ بن چکا ہے۔

جب کسان ہل چلاتا ہے تو بہت پرامید ہوتا ہے۔ جب وہ بیج ڈالتا ہے تو بھی امید کے سہارے ڈالتا ہے۔ جب فصل زمین کا سینہ چیر کر سر باہر نکالتی ہے تو کسان اپنی محنت کو کامیاب ہوتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ جب بڑی ہوتی ہے تو اس وقت بھی اور جب اسے پھل لگتا ہے اس وقت بھی اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ آپ نے میلہ بیساکھی میں دیکھا ہو گا کہ دیہاتی لوگ بھنگڑا ڈالتے ہیں ناچتے ہیں۔ اصل میں یہ اس خوشی کا اظہار ہوتا ہے کہ اب ہماری فصلیں تیار ہو گئی ہیں۔ ہم کاٹیں گے اور اناج سے اپنے گھر بھر لیں گے۔ یہ ان کی چھ ماہ کی کمائی ہوتی ہے اور سب سے بڑی فصل ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے زراعت کا پیشہ اپنایا ہوا ہے ان کی زندگی سادہ ہوتی ہے۔ ان کے دلوں میں خلوص ہوتا ہے۔ وہ محنت کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کی کمائی ہوئی روزی حلال سمجھی جاتی ہے۔ ہمیں ان لوگوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے کیونکہ انہوں نے ہل چلانے سے لے کر فصل کاٹنے اور اناج نکالنے تک کوئی ایسا کردار ادا نہیں کیا ہوتا جس میں محنت، تن دہی اور لگن نہ ہو۔ ان کا کردار ایک مثالی کردار ہے۔ ہمیں ان لوگوں سے پیار، محبت اور عزت سے پیش آنا چاہیے کیونکہ وہ ملک کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔

تجارت

تجارت وہ پیشہ ہے جس کے متعلق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دولت کو دس حصوں میں تقسیم کیا۔ نو حصے تجارت کو دیئے ہیں اور باقی ایک حصہ دوسرے پیشوں کو دیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے تجارت میں سب سے زیادہ برکت رکھی ہے۔

انسان کو گذر اوقات کے لئے کوئی نہ کوئی پیشہ تو اپنانا ہی پڑتا ہے۔ کوئی کھیتی باڑی کرتا ہے، کوئی ملازمت اختیار کرتا ہے، کوئی تجارت کرتا ہے اور کوئی مزدوری۔ یہ سب پیٹ پالنے کے دھندے ہیں لیکن ان سب میں سے افضل پیشہ تجارت ہے۔ ہمارے رسول بھی تجارت کیا کرتے تھے۔ جو مسلمان تاجر دوسرے ملکوں میں بغرض تجارت جاتے تھے وہ تبلیغ اسلام کا فریضہ بھی سرانجام دیتے تھے اور اس طرح تجارت تبلیغ اسلام کا موثر اور مفید ذریعہ بنی۔ جو لوگ تجارت کو نہیں اپناتے انہیں ملازمت کے لئے دھکے کھانا پڑتے تھے۔

تجارت ایک ایسا پیشہ ہے جس میں کسی کی ماتحتی نہیں ہوتی بلکہ پوری آزادی ہوتی ہے۔ شوق اور لگن سے کام کرنا پڑتا ہے۔ تجارت میں مستقل مزاجی اور کفایت شعاری لازمی ہے۔ تجارت میں پہلے پہل کام جمانے کے لئے سخت محنت کی ضرورت ہے اور جب کاروبار چل جاتا ہے تو جسمانی محنت کی بجائے دماغی تدابیر سے ہی کام چلتا رہتا ہے۔ نئی نئی منصوبہ بندی سے کاروبار بڑھتا رہتا ہے۔ پھر خود محنت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ کارندے خود ہی سارے کام کرتے

رہتے ہیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں روپیہ کی ریل پیل ہو جاتی ہے۔

تجارت سے صرف تاجر کو ہی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس سے ایک مزدور سے لے کر کارخانہ دار تک کو فائدہ پہنچتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک کتب فروش دیکھنے میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض کتابیں بیچ رہا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ نہ اکیلا اس کام کو چلا رہا ہے اور نہ اکیلا اس کام سے مستفید ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے ایک مصنف کتاب لکھتا ہے۔ اس میں وہ کاغذ استعمال کرتا ہے۔ سیاہی خریدتا ہے۔ ان چیزوں کو کتنے لوگ ہیں جو تیار کرتے ہیں اور کتنے لوگوں کی روزی اسے سے منسلک ہے۔ اس کے بعد کتاب تیار ہوتی ہے۔ کاتب اسے لکھتا ہے۔ جتنی اشیاء وہ استعمال کرتا ہے اتنے ہی لوگ ان کو خریدنے، بیچنے اور ادھر ادھر لے جانے اور ان کی منفعت میں حصہ دار ہوں گے۔ اس کے بعد پرنٹ تیار ہو کر پریس میں جاتا ہے۔ اس میں جتنے آدمی کام کر رہے ہیں، جتنی مشینری کام کر رہی ہے جتنی وہاں پر خرید و فروخت ہوتی ہے اس سے جتنے لوگ متعلق ہیں وہ سب اس کے لئے کام بھی کرتے ہیں اور اس سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ پھر جا کر کتاب کتب فروش کی دکان پر پہنچ کر بکتی ہے۔ بکنے کے بعد بھی جہاں جہاں وہ جاتی ہے لوگوں کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ تجارت اصل میں اسے ہی کہتے ہیں کہ اشیاء کی خرید و فروخت کو اس کی پیداوار سے لے کر آخری مرحلے تک کسی نہ کسی شکل میں چکر دیتے رہنا اور اس سے فائدہ اٹھاتے رہنا۔ اگر اسی چکر کو شمار کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ چکر بہت ہی وسیع ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی لئے اس میں سب سے

زیادہ برکت رکھی ہے کیونکہ اشیاء نے جہاں بھی جانا ہے اور جس شکل میں بھی جانا ہے تیار کرنے والے اور خریدنے اور بیچنے والے کے لئے رزق کا وسیلہ بنتا ہے۔ نہ جانے کون کون سے اللہ کے بندے اس چکر میں رزق کما رہے ہوتے ہیں۔

اکثر نوجوان اس ذہن سے تعلیم حاصل کرتے ہیں کہ وہ پڑھ لکھ کر ملازمت کریں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب کو ملازمت مل جائے۔ جن کو ملازمت مل جاتی ہے وہ تو کام پر لگ جاتے ہیں مگر جن کو ملازمت نہیں ملتی وہ اس دھن میں وقت ضائع کرتے رہتے ہیں کہ ملازمت ملے گی تو کام کریں گے۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ ملازمت کے علاوہ اور بھی تو ذریعہ معاش اپنایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ان میں سے اکثریت کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا۔ لیکن دنیا میں ایسے کاروبار بھی ہیں جو کم سرمائے سے بھی کئے جا سکتے ہیں۔ مگر ان میں سرمایہ کی بجائے محنت اور ہوش مندی سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے۔ اس چھوٹے کاروبار میں بھی زیادہ نہ سہی تو کچھ نہ کچھ تو ملتا ہی رہتا ہے اور پھر اسی میں نئے نئے راستے نکلتے رہتے ہیں۔ کم خرچی کی تکلیفیں بھی اٹھانا پڑتی ہیں۔ محنت اور دیانت سے مارکیٹ میں تھوڑا بہت اعتماد پیدا ہو جاتا ہے تو یہ مشکلیں بڑی حد تک آسان ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ایک آدمی مصمم ارادہ کر لے کہ میں نے کاروبار ہی کرنا ہے چاہے چھوٹے پیمانے پر ہو اور خوب محنت کر کے اس میں کامیاب ہونا ہے اور جتنی مشکلات بھی آئیں گھبرانا نہیں۔ یہ تمام شرائط پوری کرنے کے بعد وہ آدمی بھی کامیاب ہو سکتا ہے جس کے پاس سرمایہ کم ہے۔

قیام پاکستان کے بعد قدرت نے ہمیں خوب موقع دیا اور ہم ارادی اور غیر ارادی طور پر تاجر بن گئے۔ ہمیں تجارت کے لئے مارکیٹیں مل گئیں۔ دوکانیں بیٹھنے کے لئے دستیاب ہوگئیں۔ ملک کی پیداوار برآمد کرنے کے مواقع میسر آ گئے اور درآمدات بھی شروع ہوگئیں۔ پاکستان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب اور راز یہی ہے کہ ہمیں تجارت کرنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ جب ہندو پاکستان متحدہ تھا تو مسلمان کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ یہ صرف اور صرف خداوند تعالیٰ کی خاص مہربانی اور قائداعظم جنہوں نے بیماری کی حالت میں بھی آرام نہ کیا اور شب و روز محنت کر کے ہمیں پاکستان لے کر دیا یا ان اکابرین ملت کی کاوشوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے خلوص دل سے قوم و ملت کے لئے کام کیا۔

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم جہاں جہاں بھی ہیں ملک و قوم کی ترقی اور خوشحالی کے جذبے سے کام کریں تا کہ ہمارا ملک دنیا میں سربلندی حاصل کرے۔ اس سے نہ ہماری آمدن کم ہوگی نہ دولت کم ہوگی بلکہ ملک کے ترقی کرنے سے ہمیں اجتماعی طور پر مزید سہولتیں اور زیادہ آرام و آسائش میسر ہوں گے۔

صنعت وحرفت

صنعت وحرفت بھی تجارت اور زراعت کی طرح ایک آزاد پیشہ ہے۔ اس کے معنی ہیں مختلف چیزیں بنانا، دستکاری تجارت اور صنعت وحرفت آپس میں ملتے جلتے پیشے ہیں۔ اگر یوں کہہ دیا جائے کہ تجارت اور صنعت وحرفت ایک ہی خاندان کے دو افراد ہیں جن کی عادات ایک دوسرے سے تقریباً ملتی جلتی ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ تجارت اور صنعت وحرفت کا مزاج ایک ہی ہے۔ تجارت میں صرف خرید وفروخت کی جاتی ہے۔ صنعت وحرفت میں بھی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تاجر تیار شدہ اشیاء یا مال کی تجارت کرتا ہے اور صنعتکار خام مال خرید کر اسے تیار کر کے فروخت کرتا ہے۔ تاجر مال کو جوں کا توں خریدتا ہے اور بیچ دیتا ہے اور صنعت کار اس کو دوسری شکل دے کر فروخت کرتا ہے۔ صنعت وحرفت بھی تجارت کی دوسری شکل ہے۔ انگریزی میں اس کو انڈسٹری کے نام سے پکارتے ہیں اور آج کل یہ لفظ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ ناخواندہ آدمی بھی انڈسٹری کے معنی اور مفہوم کو خوب سمجھتا اور بولتا ہے کیونکہ لفظ انڈسٹری صنعت و حرفت کی بجائے بولنے میں آسان اور عام فہم ہے۔

صنعت وحرفت میں کسی دوسرے کی ماتحتی نہیں کرنی پڑتی۔ جب تک جی چاہے کام کرتے رہو، جب جی چاہے بند کر دو۔ ہر قسم کی بے فکری اور آزادی ہے۔ صنعت وحرفت دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کام خود کیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے کارخانے کی شکل دے کر کاریگروں سے مال

تیار کروایا جائے۔ آج کی اصطلاح میں صنعت وحرفت یا انڈسٹری سے مراد چھوٹے یا بڑے کارخانے ہی ہیں۔ ایک شخص جو کھڈی پر دس بیس گز روزانہ کپڑا بن کر گزراوقات کرتا ہے اور وہ جو اپنے کارخانہ میں ہزار گز کپڑا تیار کرواتا ہے دونوں صناع ہی ہیں۔ لیکن دونوں کی حیثیت میں ضرور فرق ہے۔ فی زمانہ اول الذکر کی وقعت کچھ نہیں جبکہ موخر الذکر کی حیثیت ایک کارخانہ دار کی ہے۔ لہٰذا زمانے کی رفتار اور ضرورت کے مطابق آج کل صناع یا صنعت کار سے مراد وہ شخص ہے جو کارخانہ دار ہو۔ صنعت بھی اسی طرح بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ گویا جو لوگ کاریں بناتے ہیں، ہوائی جہاز بناتے ہیں، پانی کے جہاز تیار کرتے ہیں، بسیں، ٹریکٹر، بل ڈوزر، کپڑا اور بجلی کا سامان تیار کرتے ہیں صنعتکار کہلواتے ہیں۔ اب آپ کو صنعت کار کی دولت، امارت اور عزت ووقار کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ صنعت وحرفت میں کس قدر فائدہ ہے اور اس میں کس حد تک ترقی کے مواقع ہیں۔ جس طرح تجارت میں عزت بھی ہے اور نفع بھی ہے اسی طرح صنعت و حرفت میں منافع بھی ہے اور عزت ووقار بھی۔

جن ملکوں نے انڈسٹری کو ترقی دی ہے وہ ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں جا کھڑے ہوئے ہیں۔ انگلینڈ، امریکہ، جاپان، جرمنی، فرانس، روس سب نے انڈسٹری کے ذریعے ہی ترقی کی ہے۔ برطانیہ ہندوستان سے خام روئی لے جاتا تھا اور اپنے ملک میں کپڑا تیار کر کے پھر یہیں فروخت کے لئے بھیج دیتا تھا۔ یوں وہ ایک روپیہ خرچ کر کے دس روپے کماتا تھا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی انڈسٹری کو

ترقی دی۔ اسی طرح سے وہ طرح طرح کی مشینری تیار کر کے دنیا کے ممالک میں فروخت کرتا تھا۔ جاپان نے اتنی جلدی ترقی کیوں کر کی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس ملک کا ہر فرد صناع ہے۔ اہل حرفہ ہے۔ وہاں بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ یہ ملک برقی آلات اور کاریں بنانے میں بھی اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ دنیا کی مارکیٹوں پر چھایا ہوا ہے۔ جرمنی، فرانس اور روس بھی اس طرح سے ہی ترقی کر رہے ہیں۔ براعظم یورپ نے جس قدر ترقی کی وہ سب صنعت وحرفت کی بدولت ہی کی۔ یورپ والوں نے قسم قسم کی ایجادات کیں، جنہیں دیکھ کر انسان کی عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ قدیم اہل ہند اور مصری وغیرہ بھی دست کاری میں ماہر سمجھے جاتے تھے مگر انہوں نے مزید تحقیق وتجسس کا کام چھوڑ دیا۔ اس لئے ان کی ترقی رک گئی۔ وہ جہاں تھے وہیں رہ گئے اور ترقی یافتہ ملک ان سے آگے نکل گئے۔ انہوں نے تحقیق وتجسس کا کام پوری مستعدی سے جاری رکھا۔

صنعت وحرفت میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تحقیق وتجسس نہایت ضروری ہے۔ قسم قسم کے سائنسی تجربات کے ذریعے نئی نئی ایجادات کی جاتی ہیں۔ جو ملک جس قدر سائنس میں ترقی کرتا ہے اسی قدر صنعت وحرفت میں ترقی کرے گا۔ صنعت کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس وقت ضرورت کس چیز کی ہے اور اسے کس طرح تیار کرنا ہے۔ کس طرح تیار کرنا ہے والا مسئلہ تو وہی حل کر سکتا ہے جو سائنسدان ہوگا۔ گویا فی زمانہ سائنس کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کوئی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہمارا نصاب تعلیم اس قسم کا ہونا

چاہیے اور ہمیں ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے زیادہ سے زیادہ ڈاکٹر، انجینئر اور سائنسدان بن سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان میں ایسا ذہنی رجحان پیدا کیا جائے جس سے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ انہوں نے محض دولت اکٹھی کرنے کے لئے تعلیم حاصل نہیں کرنی بلکہ انہیں **ملک** وقوم کی خدمت بھی کرنی ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ملازمت

انسان کو روزی کمانے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہی اس کا پیشہ بن جاتا ہے۔ یوں تو بے شمار پیشے ہیں مگر اس وقت زیر بحث پیشہ ملازمت کا ہے۔

روزی کمانے کے لئے ملازمت اچھا پیشہ ہے مگر اس میں وہ آزادی نہیں جو زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت میں ہے۔ اس میں ملازم سراپا پابند ہوتا ہے۔ ملازم نے اپنی خدمات مالک کے پاس ایک مخصوص معاوضہ کے عوض فروخت کی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ اس کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ایک قسم کا قیدی یا غلام ہوتا ہے۔ ذرا سی حکم عدولی پر اسے موقوف یا معطل کیا جا سکتا ہے۔ چھوٹی سی غلطی پر بھی حاکم اس کی جواب طلبی کر سکتا ہے۔ ڈیوٹی کے بعد وہ آزاد ہوتا ہے اور بظاہر اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا مگر بہت سے خوف اسے گھیرے رکھتے ہیں مثلاً اسے ڈیوٹی پر مقررہ وقت پر پہنچنا پڑتا ہے اور مقررہ وقت پر چھٹی کرنا پڑتی ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقت ختم ہونے کے بعد بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ ملازم کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے آقا کو خوش رکھے۔ بسا اوقات افسران کی خوشامد بھی کرنا پڑتی ہے کیونکہ اکثر افسر بھی تو اسی مزاج کے ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے افسروں کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے ماتحتوں سے اسی قسم کی امید رکھتے ہیں اور جو ایسا نہیں کرتا اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ ملازمت میں سب سے زیادہ عیب یہ ہے کہ افسر کی ہاں میں ہاں ملانا پڑتی ہے۔ چاہے وہ غلط کہہ رہا ہو یا صحیح۔ ملازمت میں ضمیر کی آواز کو دبانا پڑتا ہے۔ بعض

افسران نیک دل اور خوش سیرت ہوتے ہیں اور جو خود بھی ایمان دار ہوتے ہیں اور اپنے ماتحتوں سے بھی ایمانداری کی توقع رکھتے ہیں۔ وہ اچھے آدمی کی قدر کرتے ہیں اور اگر ملازم اپنا کام نیک نیتی، دیانتداری اور محنت سے کرے تو وہ اسے ترقی دے دیتے ہیں۔ اس سے اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ مزید تن دہی اور احساس ذمہ داری سے کام کرتا ہے۔ بعض پوسٹیں ایسی ہوتی ہیں جہاں پر عوام سے براہ راست واسطہ پڑتا ہے۔ ایسی جگہوں پر دو فرائض سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو اپنا فرض جس کے لئے وہ تنخواہ لیتا ہے دوسرا خدمت خلق۔ مثال کے طور پر ایک آدمی آپ کے پاس کسی مطلب کے لئے آتا ہے لیکن وہ کام آپ کی ڈیوٹی میں شامل نہیں۔ اس کو آپ اگر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ کام میں نہیں کرتا فلاں آدمی کرتا ہے، آپ اس کے پاس چلے جائیں تو آپ کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ خود اٹھ کر اس آدمی کے پاس لے جاتے ہیں اور یہ سمجھ کر کہ سائل کمزور ہے، بوڑھا ہے یا کسی وجہ سے معذور ہے تو یہ کام خدمت خلق خدا ہوگا۔ مزید برآں جس شخص کے پاس آپ اسے لے جاتے ہیں وہ بے جا تاخیر کرتا ہے مگر آپ اس معذور کا کام کروانے میں مدد کرتے ہیں تو وہ آپ کو دعائیں بھی دے گا اور اللہ بھی آپ کو اس کی جزا دے گا۔ اس قسم کے کام نیکوکار لوگ ہی کرتے ہیں۔

ملازمت میں آزادی تو نہیں ہوتی مگر ایک چیز ضرور ہوتی ہے کہ ملازم لوگ پابند محض اتنے وقت کے لئے ہی رہتے ہیں جتنے وقت کے لئے ان کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ جو ان کا جی چاہے کریں۔ تفریح

کریں۔گھر میں رہیں۔ڈیوٹی کا کوئی بوجھ ان پر سوار نہیں ہوتا لیکن ایک تاجر یا صنعت کار چوبیس گھنٹے اپنی ترقی کے لئے غور کرتا رہتا ہے کیونکہ یہ اس کا اپنا کام ہے۔دکان پر ہو یا کارخانے میں ہو،گھر پر ہو،سفر میں ہو،باہر ہو،اندر ہو،دماغ کی گراریاں چلتی رہتی ہیں۔کبھی مال لانے کی فکر،کبھی مال نہ نکلنے کی فکر،کبھی باہر سے اگر نوصولی کرنے کی فکر،اور کبھی دینے والوں کی فکر کبھی مندا آ گیا،کبھی کچھ ہو گیا اور اگر ایسا نہیں کرتا تو اس کا کام نہیں چل سکتا۔کاروبار میں بہت سی تدابیر کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاروبار میں مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے اور قیمت خرید سے بھی کم قیمت پر مال بیچنا پڑتا ہے۔یہ سب باتیں تاجر کو تحمل اور بردباری سے برداشت کرنا پڑتی ہیں۔لیکن ایک ملازم ایسی سب الجھنوں سے آزاد ہوتا ہے۔گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر۔وہ دفتر کی فکر دفتر میں چھوڑ آتا ہے۔اس طرح سے کاروباری آدمی کے پاس وقت کم نکلتا ہے۔ملازم کو Earned Leaves, Casual Leaves اور اسی طرح کئی قسم کی چھٹیاں ملتی رہتی ہیں۔سال بھر میں اسے تقریباً دو ماہ کی چھٹیاں مل جاتی ہیں اور یہ اتوار یا تیوہاری چھٹیوں کے علاوہ ہوتی ہیں۔جب اس کا جی چاہے سیر و تفریح کے لئے چھٹیاں لے اور چلا جائے۔ایسے میں دفتر کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔

ملازمت میں تنخواہ واقعی بہت قلیل ہوتی ہے اور ملازم کو خوش پوش بھی رہنا پڑتا ہے اور اپنی حیثیت کے مطابق مہمانداری بھی کرنا پڑتی ہے۔شاید اسی لئے جیسا کہ ان سے سنا گیا ہے کہ رشوت نہ لیں تو کیا کریں۔صرف تنخواہ میں تو ہمارا چولہا

بھی نہیں چلتا۔ باقی اخراجات، مکان کا کرایہ اور بچوں کے اخراجات کہاں سے کریں۔ دوسری طرف رشوت کا لینا اور دینا دونوں گناہ ہیں۔ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہوں گے تو مسئلہ واقعی حل طلب ہے کہ اگر رشوت لیتے ہیں تو گناہ ہے اور اگر نہیں لیتے تو گذر اوقات نہیں ہوتی۔ یہ مسئلہ ملازمین کے تعاون اور حکومت وقت کے ہمدردانہ رویے سے ہی حل ہوسکتا ہے۔ عالم یہ ہے کہ جہاں جاؤ رشوت کا بازار گرم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انہیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ بغیر رشوت کے کوئی کام جائز ہو یا ناجائز ہوتا ہی نہیں۔ یہ چیز معاشرے کی بہت بڑی برائی ہے جسے ختم کرنا عوام اور حکومت کی ذمہ داری ہے۔

دیہاتی زندگی

مل جل کر رہنے کا طریقہ سب سے پہلے دیہات سے شروع ہوا۔ بڑھتے بڑھتے دیہات قصبوں اور شہروں میں تبدیل ہوتے گئے۔ حسب ضرورت نئے شہر آباد ہوتے گئے۔ اب بھی یہی ہو رہا ہے۔ شہر سے ملحقہ دیہات بھی شہر کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ انسانی معاشرے کا اولین گہوارہ دیہات ہیں۔ سادگی دیہات کا زیور ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر حسن، کھلی ہوا، سبزہ زار، سایہ دار درخت، چمن زار، مرغان چمن کی چہک اور پھولوں کی مہک سے زندگی انتہائی پر کیف ہو جاتی ہے۔

دیہات کی زندگی نئی تہذیب کی ملمع اور تصنع سے پاک ہوتی ہے۔ حسن سادہ کی رنگینیاں دل کو لبھاتی ہیں محلوں کی بجائے گارے اور مٹی کے بنے ہوئے سیدھے سادے مکانوں میں زیادہ سکون ملتا ہے۔ ذہن پریشانیوں، شہری گھٹن اور پر تکلف اور غیر ضروری لوازمات سے پاک رہتا ہے۔ شہروں میں زندگی کو آرام اور سکون میسر نہیں۔ یہاں کی ہوا کثیف ہوتی ہے۔ کارخانوں کی چمنیوں گیس اور تیل کے چولہوں کے دھوؤں، بسوں کاروں اور موٹر سائیکلوں کی گیس کی وجہ سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کی موجودگی صحت کو خراب کرتی ہے۔ صاف اور ستھری ہوا نام کو نہیں ملتی۔ پانی، بجلی اور دیگر تعلیمی سہولتیں ملتی ہیں۔ تجارت کے مراکز بھی شہروں میں ہوتے ہیں۔ مصنوعات کی پیداوار بھی شہروں میں ہی ہوتی ہے۔ ہر آدمی کو کام آسانی سے مل جاتا ہے۔ مزدور کو مزدوری مل جاتی ہے۔

شہروں میں فطرت کی تازگی، لطافت اور حسن کی بجائے گھٹن، تلخی اور تنگی ملتی

ہے۔ دیہاتی آدمی شہر میں رہ کر یوں محسوس کرتا ہے جیسے اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا ہو۔ نہ اسے کھلی ہوا ملتی ہے نہ وہ پرندوں کے چہچہے ہوتے ہیں نہ گلوں کی تازگی نہ مرغان چمن کے نغمہ ہائے جان فزا ہوتے ہیں نہ شبنم کے تابدار موتی۔ وہ شہر کے پرتکلف ماحول بلند و بالا عمارتوں شور و غوغا، ٹرکوں، بسوں، موٹروں اور دیگر ٹریفک کی بھیڑ سے گھبرا کر دیہات کو بھاگنے کی جلدی کرتا ہے۔

دیہات میں تازہ سبزی اور پھل خالص گھی دودھ اور مکھن عام مل جاتے ہیں۔ شہروں میں جو سبزیاں اور پھل وغیرہ دستیاب ہوتے ہیں دیہات کے ہی مرہون منت ہیں۔ آفتاب کا طلوع و غروب، چاند کی ضیاء پاشی ستاروں کی چمک، بہاروں کا جوش، خزاں کا شیوں اور برسات کی بہاریں سبھی بے ساختگی اور سادگی پیش کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیہاتیوں کی زندگی شہریوں کی نسبت آسان اور سادہ ہوتی ہے اور صحت بھی اچھی ہوتی ہے۔ دیہاتی چونکہ محنت و مشقت کے عادی ہوتے ہیں اس لئے ان میں قوت مدافعت زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں بیماریاں بہت کم ہوتی ہیں۔ شہروں میں خوراک مرغن ملتی ہے۔ تن آسانی اور پرتکلف ماحول ان کو قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ دل کی بیماریاں، بلڈ پریشر، شوگر اور کینسر وغیرہ شہروں میں ہی زیادہ پائی جاتی ہیں۔

گاؤں کی فضا میں ایک خاص نوعیت کا سکون اطمینان اور خاموشی ہوتی ہے جو ذہن کو یکسوئی بخش کر عظیم تخلیقی کاموں کے لئے تیار کرتی ہے۔ وہاں کی فضا میں اطمینان کی دولت ملتی ہے۔ شہروں میں سکون نایاب، اطمینان ختم اور تسکین ناپید

ہے۔سڑک پر ہر دم زندگی اور موت کی جنگ لگی رہتی ہے۔حادثات کئی گھرانوں کے چراغ بجھا دیتے ہیں۔لیکن گاؤں میں ایسا نہیں ہے۔وہاں کا ماحول پرسکون ہوتا ہے حادثات کا ڈر بہت کم ہوتا ہے۔یہ درست ہے کہ وہاں پر پیدل زیادہ چلنا پڑتا ہے۔شہروں کی طرح قدم قدم پر تانگے ٹیکسیاں میسر نہیں ہیں۔مگر ذرا غور سے سوچا جائے تو یہی ان کی اچھی صحت کا راز ہے۔پیدل چلنے والا انسان چاق و چوبند رہتا ہے اس کے پٹھے مضبوط رہتے ہیں اور اس کی قوت مدافعت بڑھتی ہے۔بیماریاں اس کے پاس پھٹکنے نہیں پاتیں۔آج کل تو سڑکوں کی سہولتیں اور بجلی دیہات میں بھی میسر آ گئی ہیں اور پختہ عمارتیں بھی بننا شروع ہوگئی ہیں۔

اس کے برخلاف تہذیب وتمدن کی دوڑ میں شہر سبقت لے گیا ہے۔وہاں کتب خانے ہیں اور مطالعہ کے لئے لائبریریاں ہیں جس سے پل پل کے حالات سے انسان باخبر رہتا ہے۔اخبارات آسانی سے میسر ہو سکتے ہیں جس سے سیاست کے طلوع وغروب اور بین الاقوامی شب و روز سے واقفیت رہتی ہے۔تہذیب وتمدن کے نئے نئے طریقے اور ضابطے انسان شہر ہی سے سیکھتا ہے۔سکول اور کالجوں، دینی اور ٹیکنیکل درسگاہوں سے شہری زیادہ مستفید ہوتے رہتے ہیں۔اس کے مقابلے میں گاؤں میں عام طور پر ایک پرائمری یا زیادہ سے زیادہ مڈل سکول ہوتا ہے۔کسی کسی گاؤں میں ہائی سکول بھی مل جاتا ہے جس میں گنتی کے چند استاد ہوتے ہیں۔دیہاتی استاد کی تنخواہ بھی کم ہوتی ہے۔لیکن شہری استاد کی نسبت یہ دیکھا گیا ہے کہ دیہاتی استاد تدریسی فرائض زیادہ تن دہی اور

خلوص سے سرانجام دیتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی سادہ ہے اور وہ زیادہ حریص نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد بھی استاد کا زیادہ ادب کرتے ہیں اور ان کے زیادہ تابع فرمان ہوتے ہیں۔ ان کی تعلیم بھی شہروں کی نسبت زیادہ ٹھوس ہوتی ہے۔ شہروں میں تو طلباء پڑھائی کے وقت کو ٹیلی ویژن کی نذر کر دیتے ہیں مگر دیہات کے رہنے والے طالب علم زیادہ سے زیادہ وقت کو پڑھائی پر صرف کرتے ہیں۔

گاؤں میں لوگ سارے دن کی محنت اور مشقت کے بعد رات کو چوپال یا کسی ڈیرے میں اکٹھے ہوتے ہیں جہاں پر وہ ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ گاؤں کے مسائل زیر بحث آتے اور ان کے حل کی تدابیر زیر غور آتی ہیں۔ یہ گاؤں کی ایک قسم کی قانون ساز اسمبلی یا انتظامیہ ہوتی ہے جہاں چھوٹے چھوٹے مسائل لوگ خود ہی حل کر لیتے ہیں۔

شہری اور دیہاتی زندگی

کچھ لوگ شہر میں رہتے ہیں اور کچھ لوگ دیہات میں ۔ دیہات میں جس طرح کی قدرتی رعنائیاں ملتی ہیں وہ شہر میں نہیں اور جو سہولتیں شہر میں میسر ہیں وہ دیہات میں نہیں ۔ کئی اعتبار سے شہری زندگی بہتر ہے اور کئی پہلوؤں سے دیہات کی زندگی پسند کئے جانے کے لائق ہے ۔

شہروں میں طرح طرح کی سہولتیں میسر ہیں ۔ ضروریات زندگی آسانی سے دستیاب ہوتی ہیں ۔ سکولوں اور کالجوں کے علاوہ اور دوسری مذہبی اور ٹیکنیکل درسگاہیں اور سائنسی تجربہ گاہیں بھی ہوتی ہیں ۔ دور جدید کی تمام آرام و آسائش کی اشیاء مل جاتی ہیں ۔ بجلی، پانی، سوئی گیس کی سہولتیں ملتی ہیں ۔ تہذیب و شائستگی سیکھنے کے مواقع مل جاتے ہیں ۔ لائبریریاں ہیں، دارالمطالعے ہیں، طبی امداد بروقت مل سکتی ہے ۔ رات ہو یا دن ہسپتال کھلے رہتے ہیں ۔ پرائیویٹ ڈاکٹر بھی مل جاتے ہیں ۔ حادثات کی صورت میں بھی طبی امداد مل جاتی ہے ۔ سواری کے لئے تانگے، رکشے، بسیں، لاریاں، کاریں دن رات چلتی رہتی ہیں ۔ مال برداری کے لئے لوڈر اور ٹرک بھی آسانی سے مل جاتے ہیں ۔ گویا زندگی کی ہر آسائش کا سامان آسانی سے میسر ہے مگر دیہات میں یہ چیزیں میسر نہیں ۔

شہر میں کھانے پینے کی اشیاء بروقت ملتی رہتی ہیں ۔ ہوٹل ہیں ۔ قہوہ خانے ہیں ۔ دودھ اور مٹھائی کی دوکانیں ہوتی ہیں ۔ بیکری کا سامان، مچھلی، گوشت ہر قسم کا سامان دستیاب ہے ۔ مشینری کا سامان اور ہر قسم کے برتن شہر میں مل جاتے ہیں ۔

ریشمی اور سوتی کپڑے، کھیس، کمبل، جوتے اور دوسری ضروریات زندگی کی سہولتیں شہروں میں ہی میسر ہیں۔

شہروں میں رہنے والے لوگ بین الاقوامی، ملکی اور مقامی حالات سے ہر وقت باخبر رہتے ہیں۔ ٹی وی، اخبار، رسائل، جلسے جلوس، شہری آبادی کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ معلومات حاصل کرنے یا پیغام رسانی کے لئے ٹیلیفون کی سہولتیں یہ سب شہروں میں ملتی ہیں۔ تفریح کے لئے باغ، سینما، سرکس ہوتے ہیں جو شہریوں کو محظوظ کرتے ہیں۔ دیہات کے رہنے والے ان سے محروم ہیں۔

آمدورفت کے لئے پختہ سڑکیں ہیں جن کی وجہ سے شہری ایک سے دوسری جگہ آسانی سے آجا سکتے ہیں۔ دن رات بسیں، لاریاں، ریلوے، ٹرینیں چلتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ شہروں میں کارخانے فیکٹریاں ہوتی ہیں جن میں عام آدمی کو مزدوری بھی مل جاتی ہے اور فکر معاش سے جلد چھٹکارا مل جاتا ہے۔ دیہات میں یہ چیزیں نہیں ہیں۔ وہاں پر کسب معاش کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ شہر میں چھوٹے بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے کے بہت مواقع ہیں۔ عام آدمی کو سرکاری اور غیر سرکاری ملازمت بھی مل جاتی ہے۔ یہاں مزدور محنت مزدوری کر کے یا ضرورت پڑے تو چھابڑی یا ریہڑی لگا کر بھی اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔

باوجود اس کے کہ شہروں میں طبی امداد کے مراکز بھی بکثرت ہیں ڈاکٹر بھی عام مل جاتے ہیں۔ ادویات بھی ڈھیروں مل جاتی ہیں۔ مگر صحت کو برقرار رکھنے کے لئے نہ تو یہاں تازہ ہوا ملتی ہے اور نہ ہی اچھی اور خالص غذا ملتی ہے۔ یہاں کے

دودھ فروش دودھ میں پانی ملاتے ہیں اور پانی ملے دودھ میں سے کریم بھی پہلے ہی نکلی ہوئی ہوتی ہے۔ نہ گھی اچھا ہوتا ہے نہ دودھ خالص۔ اس صورت حال میں کھانے پینے کی اشیاء پیٹ تو بھر سکتی ہیں صحت قائم نہیں رکھ سکتیں۔ یہاں پر کارخانوں، ملوں، فیکٹریوں، ٹرکوں، بسوں، موٹروں، کاروں، رکشوں کے دھوئیں سے ہوا کثیف رہتی ہے اور پھیپھڑوں میں جا کر صحت کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ شہر کے گلی کوچوں میں جدھر جائیں غلاظت کے ڈھیر لگے ہوئے ملتے ہیں۔ جگہ جگہ فلتھ ڈپو بنے ہوئے ہیں۔ وہ بھی ملحقہ آبادی کے لئے وبال جان بنے ہوئے ہیں۔ شہروں میں سینما تفریح کی بجائے معاشرے میں بگاڑ پیدا کر رہے ہیں۔ نوجوان طبقہ کی سوچ ہی سینماؤں اور گندی سوسائٹی نے غلط کر کے رکھ دی ہے اور پراگندگی ان کے ذہنوں میں راسخ ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں فضول خرچی، تکلف، ذخیرہ اندوزی اور ملاوٹ نے شہری زندگی کو پریشان کر رکھا ہے۔

دیہات کے لوگ سادہ، مخلص، خدمت گزار محنتی ہوتے ہیں۔ دیہات میں گھی، دودھ، مکھن خالص مل سکتا ہے۔ وہاں کھلی فضا میں رہنے سے صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔ دیہات میں طرز معاش ہی اس قسم کی ہے کہ محنت سے روزی کمانی پڑتی ہے۔ اس میں عورتیں اور بچے سبھی شامل ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی صحت شہریوں کی نسبت اچھی ہوتی ہے۔ کسان ہماری ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو نہ شہروں میں کارخانے ہوں نہ ملیں ہوں اور نہ فیکٹریاں چلیں اور نہ تجارت ہو۔ یہ سب انہی کی بدولت ہے۔

دیہات میں اخلاقی فضا شہروں کے مقابلے میں بہتر ہوتی ہے۔ دیہات میں لوگ بڑوں کا ادب کرتے ہیں۔ وہ مذہبی رجحان زیادہ رکھتے ہیں اور فریب کاری میں بہت کم ماہر ہوتے ہیں۔ وہاں کی عورتیں بھی محنتی اور خدمت گزار ہوتی ہیں۔ وہاں قدرتی مناظر دل و دماغ کو سکون بخشتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیہات کے لوگوں کی صحت بہتر ہوتی ہے۔

چنانچہ جس طرح کچھ اچھائیاں اور برائیاں شہری زندگی میں ہیں اسی طرح کچھ خوبیاں اور خامیاں دیہاتی زندگی میں بھی ہیں۔ سو فیصد معیاری تو کوئی جگہ بھی نہیں۔ اب یہ اپنی اپنی پسند ہے کہ ان خوبیوں اور خامیوں سمیت ہمیں شہری زندگی پسند ہے یا دیہاتی۔

دیہات سدھار

دیہات سدھار کہہ لیجئے یا دیہات کی اصلاح، بات ایک ہی ہے۔ ہمارے ملک میں دیہات کے رہنے والے لوگوں کی آبادی اسی فیصد ہے۔ ملک کی اقتصادیات کا انحصار دیہات کی پیداوار ہے لیکن ان کی فلاح و بہبود کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ جو دیہات شہری آبادی سے دور ہیں وہاں پر نہ بجلی کی سہولت ہے نہ پختہ سڑک نہ سکول نہ ہسپتال، گویا یہ لوگ زیادہ بیچارگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر کوئی بیمار پڑ جائے تو طبی امداد کا ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے گھر والوں کو اس کی چارپائی سر پر اٹھا کر نزدیکی شہر کے ہسپتال میں علاج کے لئے لے جانا پڑتا ہے۔ اس طرح انہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں پر کوئی ڈاکٹر ہو نہ کوئی ہسپتال ہو ظاہر ہے کہ کوئی میڈیکل سٹور بھی نہیں ہو سکتا۔ ایسے میں ہر قسم کی دوا کے لئے انہیں کسی شہر یا قصبے کی طرف ہی دوڑنا پڑتا ہے۔

ایسی جگہوں پر جہاں گورنمنٹ کی طرف سے نہ تو کوئی طبی مرکز ہو اور نہ ہی کوئی پرائیویٹ پریکٹیشنر ہو گورنمنٹ کو طبی امداد کے لئے مرکز کھولنے چاہئیں اور وہاں کوئی مقامی آدمی تعینات کرنا چاہیے یا کم از کم ایسا آدمی مقرر کیا جائے جو وہاں سے نزدیک ہی کا رہنے والا ہو۔ اسے دیہاتی الاؤنس بھی دیا جانا چاہیے۔ آج کل گورنمنٹ ڈاکٹروں کو دیہات میں بھیجنے کی بہت کوشش کرتی ہے مگر ڈاکٹر دیہات میں جانا پسند نہیں کرتے۔ ان کا مطمع نظر صرف روپیہ کمانا اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کوشش بسا اوقات ناکام ہو جاتی ہے۔ شہری ڈاکٹر

دیہات میں جانا پسند نہیں کرتے ۔اس کا بہترین حل یہ ہے کہ میڈیکل کالجوں میں داخلہ دیا جائے تو ایسے علاقے کا کوٹہ اس میں رکھا جائے جہاں جہاں پر ڈاکٹروں کی ضرورت ہو۔ایسے امیدواروں کو مواقع دیئے جائیں جو اس علاقے کے رہنے والے ہوں اور ان سے تحریری معاہدہ کر لیا جائے کہ حصول تعلیم کے بعد وہ اسی علاقے یا گاؤں میں خدمات سر انجام دیں گے تاوقتیکہ کہ حکومت کو کسی اور شہر یا گاؤں میں ضرورت نہ پڑ جائے ۔اس کے علاوہ کوئی اس کا حل نظر نہیں آتا ۔یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ کوئی ایسا کورس شروع کیا جائے جو محض دیہات کے لوگوں کے لئے ہی مخصوص ہو۔اس کورس کے لئے دیہات سے ہی طلباء بھرتی کر کے انہیں تعلیم دی جائے ۔اس طرح وہ اس کورس کی تکمیل کے بعد بخوشی دیہات میں ہوں گے لہٰذا ان کو دیہات میں جانے میں کوئی مشکل نظر نہیں آئے گی۔اس کے علاوہ دوسرا طریقہ اپنی مدد آپ کے اصول والا ہے ۔ایسے دیہات والے لوگ چھوٹا سا شفا خانہ خود کھولیں اور اس کا خرچہ اردگرد کے گاؤں والے خود برداشت کریں لیکن یہ اس وقت ممکن ہے کہ نزدیک نزدیک کے دو چار گاؤں والوں کے درمیان باہمی ہم آہنگی ہو اور ان کے دلوں میں اس اہم ضرورت کا احساس ہو۔گاؤں کے لوگوں میں اتفاق و محبت کا جذبہ ہو اور وہ ایسے فلاح و بہبود کے کام کرنے کے لئے دل سے خواہاں ہو۔

دوسرا مسئلہ تعلیم کا ہے۔گاؤں میں اگر کوئی سکول نہ ہو تو وہاں کی آبادی بالکل ناخواندہ رہ جاتی ہے۔وہ زیور تعلیم سے کبھی آراستہ نہیں ہو سکتے ۔ایسے دیہات

کے لوگوں کے لئے جہاں سکول نہیں ہیں سکول قائم کرنے کی طرف توجہ دینا چاہیے کیونکہ اس میں ان کا مستقبل پنہاں ہوتا ہے۔ یہ ان کی آنے والی نسل کی ترقی کی نشوونما کا مسئلہ ہے۔ انہیں چاہیے کہ وہ محکمہ سے رجوع کریں۔ جو سہولتیں محکمہ سے مل سکتی ہوں ان سے لے لیں۔ باقی انتظام خود کر لیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ محکمہ استاد تو دینے پر رضامند ہو جاتا ہے لیکن عمارت پر کثیر رقم خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لئے گاؤں کی کوئی اچھی سی عمارت استعمال میں لائی جا سکتی ہے یا مل جل کر ایک چھوٹی سی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ آج کل گاؤں میں لوگوں کو معقول آمدنی ہو رہی ہے۔ یہ کام اتنا مشکل نہیں ہے صرف جذبہ چاہیے۔ اگر سر سید احمد خاں کی مثال مدنظر رکھی جائے جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تعلیم کا انتظام کیا تھا اور پھر ایک بڑی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ تو یہ کام با آسانی کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سے دیہات میں بھی پہلے پہل چھوٹا سا سکول کھولا جائے۔ بعد میں اسے ترقی دیتے رہیں اور کم از کم ہائی سکول کی سطح تک لے جائیں۔

اس کے علاوہ گاؤں میں ایک اور مسئلہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ گاؤں میں گلیاں کوچے بہت تنگ اور غلاظت سے اٹے پڑے ہوتے ہیں۔ پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ بعض مکانات حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق تعمیر نہیں ہوتے۔ ایک ہی کمرے میں بہت سے افراد رہتے ہیں یا ایک کمرے میں خود رہتے ہیں اور ساتھ والے کمرے میں مویشی باندھتے ہیں اور اس پر ظلم یہ کہ اس کا

دروازہ بھی رہائش والے کمرے کی طرف ہوتا ہے۔ رہائش کا یہ طریقہ صحت کے لئے بہت ہی مضر ہے۔ اس طرح اچھی بھلی صاف ہوا گندی ہو کر سانس کے ذریعے پھیپھڑوں میں داخل ہو کر قسم قسم کی مہلک بیماریاں پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ گاؤں کے اچھے اور سلجھے لوگوں پر مشتمل ایک سوسائٹی بنائیں تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوسائٹی باہمی مشوروں سے اور لوگوں کو سمجھا کر گلیوں کو کشادہ کروائے اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ گلیوں کو گندگی کے ڈھیروں میں تبدیل کرنے کی بجائے انہیں صاف ستھرا رکھیں۔ ہر گھر اپنی اپنی گلی کی صفائی کا خیال رکھے۔ یہ سوسائٹی لوگوں کو ہوادار مکان بنانے کی تلقین کرے اور ان کو حفظان صحت کے اصولوں سے روشناس کرائے۔ یہی سوسائٹی وہاں کی مشترکہ املاک و مسجد وغیرہ کا انتظام بھی بڑی خوبی کے ساتھ کر سکتی ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کوآپریٹو سوسائٹی بنالی جائے اور یہ ساری ذمہ داری اس کو سونپ دی جائے۔ چونکہ کوآپریٹو سوسائٹیوں کا انتظام حکومت کے ماتحت ہوتا ہے یہ تمام امور زیادہ خوش اسلوبی سے طے ہو سکتے ہیں۔

میرا پسندیدہ رہنما

ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں بڑے بڑے راہنماؤں کا ذکر ملتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ہماری ملکی تاریخ میں قائد اعظم محمد علی جناح علیہ الرحمتہ کا نام سرفہرست ہے۔ وہ میرے پسندیدہ راہنما ہیں۔

قائداعظم بہت بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے، ان کی بلند حوصلگی، عالی ظرفی، محنت، خلوص اور دیانت کا اعتراف تمام دنیا کرتا ہے۔ پاکستان بنانے کا کام ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ یہ کام انہوں نے انتھک محنت، جدوجہد اور پورے خلوص سے سرانجام دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی صحت کی بھی پروانہ کی۔ انہوں نے اپنے آرام کا بھی خیال نہ کیا۔ ہندوستان کی دیگر اقوام اور انگریز حاکم بلکہ خود مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان کا مخالف تھا لیکن یہ سب مخالفتیں ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ پیدا کر سکیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میرا مقابلہ عیار دشمن سے ہے اور میری قوم سو رہی ہے اس لئے مجھے جاگتے رہنا ہوگا۔ اگر میں سو گیا تو میری قوم ہندوؤں کے چنگل میں پھنس جائے گی۔ آپ جیسا محنتی، پرخلوص اور دیانتدار لیڈر روز روز پیدا نہیں ہوتا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آپ کی نگاہ بلند تھی، آپ عزم صمیم رکھتے تھے اور مجسمہ خلوص تھے۔ صداقت و

دیانت آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور آپ کے قول و فعل میں ہم آہنگی تھی۔ آپ عمل پیہم اور جہد مسلسل میں یقین کامل رکھتے تھے۔ آپ دشمنوں یعنی انگریز اور ہندو کی چالوں کو خوب سمجھتے تھے اور ان کے جواب دینے کی دندان شکن اہلیت بھی رکھتے تھے۔ آپ کی قابلیت کا اعتراف آپ کے بدترین دشمنوں نے بھی کیا ہے۔

آپ کا سن پیدائش ۱۸۷۶ء ہے۔ آپ کے والد محترک کا اسم گرامی پونجا جناح تھا آپ نے ابتدائی تعلیم گوکل داس تیج پرائمری سکول بمبئی میں حاصل کی۔ پندرہ سال کی عمر میں آپ نے میٹرک پاس کرلیا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں آپ بیرسٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد آپ نے ۱۸۹۷ء میں بمبئی میں وکالت شروع کردی۔ ابتداء میں آپ کو کچھ مالی مشکلات بھی پیش آئی تھیں اور وکالت کے نتائج بھی کچھ حوصلہ افزا نہ تھے مگر آپ نے حوصلے بلند رکھے۔ آپ کو ۱۹۰۰ء میں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی آسامی مل گئی مگر آپ نے استعفےٰ دے دیا۔ اس وقت حکومت برطانیہ نے آپ کو پندرہ سو روپے ماہانہ کی ملازمت کے لئے پیش کش کی جو انہوں نے ان تاریخی الفاظ کے ساتھ ٹھکرا دی کہ میں پندرہ سو روپے ماہوار کی بجائے پندرہ سو روپے یومیہ کمانا چاہتا ہوں جو بعد میں آپ نے ثابت کر دکھایا۔

ان ایام میں دادا بھائی نوروجی نے کانگریس کی صدارت کا انتخاب جیت لیا تھا۔ انہوں نے قائد اعظم کی قابلیت کو بھانپ لیا اور انہیں اپنا سیکرٹری مقرر کرلیا۔

اس دن سے آپ نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ آپ کانگریس میں ہی شامل ہو گئے۔ اس وقت آپ کا خیال تھا۔ کہ ملک کو آزاد ہونا چاہیے اسے تقسیم نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور محسوس کرتے تھے کہ سب مل کر آزادانہ زندگی گزار سکتے ہیں اور آزادی کا ثمر حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی لئے آپ نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی لیکن جب آپ کو کچھ عرصہ ہندوؤں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو آپ پر واضح ہوگیا کہ ہندو تو صرف ہندوؤں کی آزادی چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو اپنی غلامی میں جکڑنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا آپ نے کانگریس سے علیحدہ ہو کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں آپ مسلم لیگ کے مستقل صدر چن لئے گئے۔ آپ کا یہ نظریہ درست تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہے۔ مسلمانوں کا مذہب تمدن ہندوؤں سے بالکل الگ ہے اور اسی بنا پر انہوں نے ایک الگ آزاد ریاست کا مطالبہ کیا اور ۱۹۴۰ء کو باقاعدہ طور پر بذریعہ قرارداد پاکستان بمقام لاہور پاکستان کا مطالبہ کیا۔

آپ میں پاکستان کی تعبیر دیکھنے کی بڑی تڑپ تھی۔ ایک تقریر میں فرماتے ہیں۔

''ہم منزل کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن میری روح آپ کی طرح جوان ہے۔ میری زندگی کی انتہائی تمنا ہے کہ مسلمانان ہند جو عدیم النظیر روایات کے حامل ہیں، جن کا ماضی درخشندہ ہے میں ان کا مستقبل بھی زندہ دیکھ سکوں۔ میرا دل چاہتا ہے اور میری خدا سے دعا ہے کہ میں اپنی زندگی میں

قیام پاکستان دیکھ سکوں۔ میری آنکھیں مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک قوم کی طرح ظفریاب و کامیاب دیکھ سکیں۔ آمین! اس کے بعد اگر مجھے موت بھی آ جائے تو میں خوشی خوشی اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دوں گا۔ میری روح کو سکون اور اطمینان ہوگا۔''

قائداعظم سچے مسلمان تھے۔ ایک دفعہ آپ کو لندن جانے کا اتفاق ہوا۔ ماہ رمضان کا مہینہ تھا۔ آپ کو ایک ضیافت پر مدعو کیا گیا۔ آپ نے صاف انکار کر دیا کہ میں مسلمان ہوں۔ میں روزے سے ہوں۔ اس لئے میں دعوت نامہ قبول نہیں کر سکتا۔ ہر تقریر میں ان کے سچے مسلمان ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ساری عمر انہوں نے مسلمانوں کی خدمت کی اور مسلمانوں کو پاکستان لے کر دیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا معاوضہ قوم سے وصول کرنے کی بجائے آپ قوم کے لئے خود خرچ کرتے رہے۔ آپ نے نصف صدی تک قوم کی بے لوث خدمت کی۔ ایسا انسان جس نے اپنی زندگی کی پروانہ کی ہو، جس نے اپنی دولت کی پروانہ کی ہو اور ہمہ وقت قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتا ہو قدرت روز روز پیدا نہیں کرتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی کام کے لئے پیدا کیا تھا۔ ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح (خدا مغفرت کرے) نے بھی بھائی کے ساتھ ساتھ رہ کر قوم کی خدمت میں ان کا پورا پورا ہاتھ بٹایا اور ثابت کر دیا کہ اگر قائداعظم بابائے قوم تھے تو محترمہ فاطمہ جناح صحیح معنوں میں مادر ملت تھیں۔

قوم کا یہ بطل جلیل اور میرا محبوب رہنما ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اللہ کو پیارا ہو گیا۔

میرا پسندیدہ شاعر

یوں تو بڑے بڑے عالی دماغ شاعر پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنے اپنے فن میں کمال حاصل کیا مگر قدرت نے علامہ اقبال کو جو صلاحیتیں اور بلند نگاہی، قوم کا درد اور تڑپ بخشی تھیں وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئیں۔ بعض انسانوں کو موت ہمیشہ کے لئے سلا دیتی ہے لیکن بعض اپنے کارہائے نمایاں کی وجہ سے مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں انہیں میں علامہ اقبال ہیں۔

علامہ اقبال کے کلام کی قدر ان کی زندگی میں اتنی نہیں ہوئی جتنی کہ ان کے انتقال کے بعد۔ صاحب نظر و فراست تو ان کی زندگی میں بھی ان کے قدر دان تھے۔ بعد میں تو پوری قوم ان کی مداح بن گئی۔

نظریہ پاکستان کے خالق علامہ اقبال ہی تھے۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ہی پاکستان کی تجویز پیش کی تھی کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں ان کے عقائد و نظریات، ان کی تہذیب و تمدن ان کے رسم و رواج ہندوؤں سے بالکل جداگانہ ہیں۔ مسلمان اور ہندو ایک قوم نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔

علامہ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ کے ایک مشہور معزز خاندان میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی جس کے بعد آپ نے مشن کالج میں جو اب مرے کالج سیالکوٹ کہلاتا ہے داخلہ لے لیا جہاں پر آپ کو علامہ میر حسن صاحب جیسے مشفق و مہربان استاد سے فیض حاصل کرنے کا موقعہ ملا جن کی صحبت سے ان کی صلاحیتیں اجاگر ہو گئیں۔ اس کا اعتراف انہوں نے زندگی میں بارہا کیا

اور دم آخر تک ان کے ممنون رہے۔ انہوں نے اپنے استاد محترم کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو

سیالکوٹ سے انٹر پاس کرنے کے بعد آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔ یہاں پر آپ ایک عظیم علمی اور ادبی شخصیت سے متعارف ہوئے۔ یہ پروفیسر آرنلڈ تھے جن کی دوررس نظروں نے پہچان لیا کہ اقبال میں وہ نایاب گوہر پنہاں ہیں کہ اگر ان کو ذرا سی جلا دے دی جائے تو ان کی چمک دمک سے سارا زمانہ جگمگا اٹھے گا اور یہی ہوا۔ ان کی صحبت نے اقبال کو آفتاب علم بنا کر رکھ دیا جس کی ضیاء پاشی سے دنیا روشن ہوگئی۔ آپ نے وظیفہ کے ساتھ بی اے پاس کیا اور ایم۔ اے میں امتیازی پوزیشن حاصل کی جس کے بعد آپ اورینٹل کالج میں پروفیسر لگ گئے۔ ۱۹۰۵ء میں آپ بیرسٹری کی تعلیم کے لئے برطانیہ چلے گئے۔ بیرسٹری میں کامیابی کے بعد میونخ یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے ۱۹۰۸ء میں لاہور واپس تشریف لے آئے۔

علامہ اقبال صرف شاعر ہی نہیں تھے قانون دان اور سیاست دان بھی تھے۔ آپ نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگا کر احساس دلایا کہ عمل پیہم اور جہد مسلسل ہی انسان کی کامیابی کا راز ہے۔ انسان کو اپنی ہمت عقل و فراست سے اپنی تقدیر بنانی چاہیے۔

انہوں نے بڑی عمدہ مثالیں دے کر قوم کو عمل کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی اور واضح کیا کہ ہمت یا تدبیر ہی انسان کی قسمت بدلتی ہے اور وہ قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں جو عمل نہیں کرتیں۔

دیکھئے آپ نے قوم کو کس انداز میں فکر کی دعوت دی اور واشگاف الفاظ میں خبردار کیا کہ

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

آپ عاشق رسولؐ تھے۔ صرف خدا سے ڈرتے تھے۔ اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ آپ حق بات بے باکانہ کہہ دیتے تھے اور اسی طرز عمل کی تلقین فرماتے تھے۔

آئین جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ویسے تو آپ کا کلام عین نظریہ اسلام کے مطابق ہے مگر دیکھئے کس طرح صرف ایک شعر میں ضابطہ حیات کو یوں بند کر دیا جس طرح کوزے میں دریا بند کر دیا ہو۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ایسے ایسے مرد قلندر روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو یعنی

جس دن آپ نے اس دنیائے فانی سے سفر فرمایا وفات سے صرف چند لمحے قبل ہی آپ نے فرمادیا تھا۔

سرود رفتہ باز آید کہ نہ آید
نسیمے از حجاز آید کہ نہ آید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

میری پسندیدہ کتاب

زمانہ طالب علمی میں مطالعہ حصول علم کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اچھی کتب کا ذخیرہ ہی مطالعہ کی پیاس بجھا سکتا ہے۔ موجودہ دور علم و ادب کی ترقی کا زمانہ ہے۔ ہر موضوع پر اچھی سے اچھی کتاب بازار میں دستیاب ہے۔ ہمارے شاعر اور ادیب ادب کے گراں بہا سرمائے میں برابر اضافہ کر رہے ہیں۔ اس لئے اردو ادب کے وسیع ذخیرے میں سے اپنی پسند کی کتاب کی نشان دہی کرنا آسان کام نہیں۔ با ایں ہمہ اگر کوئی میری پسندیدہ کتاب کے بارے میں سوال کرے تو میں پورے اعتماد سے کہہ سکوں گا کہ اردو کے شعرے ادب میں سے مجھے ''بانگ درا'' سب سے زیادہ پسند ہے۔

''بانگ درا'' شاعر مشرق علامہ اقبال کی اردو نظموں کا اولین مجموعہ ہے جو سب سے پہلے ستمبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اب تک اس کے درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مجموعہ کلام تین سو چھتیس صفحات پر مشتمل ہے اور تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں ہیں۔ حصہ دوم میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اور حصہ سوم میں ۱۹۰۸ء کے بعد کا کلام ہے۔

بانگ درا کا دیباچہ اردو ادب کے عظیم محسن رسالہ مخزن کے ایڈیٹر شیخ سر عبدالقادر نے لکھا ہے۔ انہوں نے اس دیباچے میں علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور مفصل تبصرہ کیا ہے۔ اس دیباچے کا مطالعہ آدمی کو شاعر مشرق کی شاعری اور پیغام کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ شیخ صاحب نے

اس تاریخی دیباچے میں علامہ کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اگر سر عبدالقادر یہ دیباچہ نہ لکھتے تو علامہ اقبال کی زندگی کے بہت سے پہلو ہماری نظروں سے یقیناً اوجھل رہتے۔

بانگ درا کی سب سے پیاری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی نظمیں ایسے موضوعات پر لکھی گئی ہیں جن پر اردو میں کسی شاعر نے طبع آزمائی نہیں کی تھی۔ بیشتر نظمیں قدرتی مناظر کی عکاسی کرتی ہیں۔ مثلاً ہمالیہ، ابر کوہسار، ایک آرزو، ماہ نو، جگنو، نمود صبح وغیرہ بعض نظمیں قومی اور ملی موضوعات و احساسات کی ترجمان ہیں جن میں تصویر درد، ترانہ ملی، شکوہ، جواب شکوہ، خطاب بہ نوجوانان اسلام، شمع اور شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام وغیرہ کو لافانی شہرت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ بعض نظمیں بچوں کے لئے بھی ہیں۔ ہماری درسی کتابوں میں علامہ اقبال کی جو نظمیں بچوں کے لئے شامل ہیں ان میں سے بیشتر بانگ درا ہی سے لی گئی ہیں۔ ان کی شاعری میں فلسفے کا رنگ بہت نمایاں ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے اشعار کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے دوسرے مجموعے ''بال جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' مجھے خاصے مشکل محسوس ہوتے ہیں لیکن بانگ درا، کی نظمیں نسبتاً عام فہم اور آسان ہیں جنہیں میں اکثر اوقات ترنم سے پڑھتا ہوں اور اپنے سکول کی بزم ادب میں بھی پڑھا کرتا ہوں۔

بانگ درا، جیسی عظیم کتاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا میری استعداد سے باہر ہے مزید کچھ کہنے کی بجائے شیخ عبدالقادر کے یہ الفاظ نقل کرنے

پر اکتفا کرتا ہوں۔ موصوف کتاب کے دیباچے میں رقم طراز ہیں۔

''یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں آج تک کوئی ایسی کتاب اشعار کی موجود نہیں جس میں خیالات کی یہ فراوانی ہو اور اس قدر مطالب و معانی یکجا ہوں اور کیوں نہ ہو ایک صدی کے چہارم حصہ کے مطالعہ اور تجربہ اور مشاہدہ کا نچوڑ اور سیر و سیاحت کا نتیجہ ہے۔ بعض نظموں میں ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع ایسا ہے کہ اس پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔''

میرا شفیق استاد

احترام استاد ہر دور میں واجب رہا ہے۔ اس کا درجہ کسی طرح بھی باپ سے کم نہیں ہوتا۔ والد تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک والد وہ ہوتا ہے جس کے خون سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ ایک والد وہ ہوتا ہے جو اپنے علم سے انسان کی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے اس کے دل و دماغ کو صیقل کر دیتا ہے اور دولت علم سے اسے مالا مال کر دیتا ہے۔ ایک والد وہ ہے جو اپنی بیٹی دے کر بیٹا بناتا ہے تو گویا استاد بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے۔

استاد ایک ایسی واجب الاحترام ہستی ہے جس کے فیوض و برکات کا اعتراف ہر عظیم انسان کو ہے۔ بادشاہ ہو یا فقیر سبھی استاد کی توجہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ استاد کی شفقت سے ہی تاریخ میں بڑی بڑی ہستیاں نامور ہوئیں۔ علم سے پہلے انسان بالکل حیوان کی طرح ہوتا ہے۔ علم کی بدولت وہ انسان بنتا ہے۔ علم کے نور سے اسے رہنمائی ملتی ہے۔ بے علم انسان خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ علم کی ابتدا بھی عرفان سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا بھی عرفان ہی ہے اور عرفان کون دیتا ہے؟ استاد۔ بڑے بڑے فلاسفر بڑے بڑے دانشور عالم و فاضل استاد کے سامنے ہی زانوئے تلمذ تہہ کرتے ہیں۔ استاد کی اصل قدر اس وقت ہوتی ہے جب انسان سن شعور کو پہنچتا ہے اور اس پر استاد کی مہربانیوں کے راز کھلتے ہیں۔ وہ جوں جوں علم کی روشنی سے مستفیض ہوتا چلا جاتا ہے توں توں استاد کی عزت کا اعتراف بڑھتا چلا جاتا ہے۔

سبھی استاد احترام کے قابل ہوتے ہیں چاہے وہ پہلے جماعت کے ہوں یا پی ایچ ڈی کے۔ سب کے لئے احترام واجب ہے۔ سب کے احترام میں دیدۂ دل جھکا دینے و دل چاہتا ہے۔ مُس بھی سکول کے سب اساتذہ کا احترام کرتا ہوں۔ میری انتہائی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کوئی استاد مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ ہمارے انگلش کے استاد جناب ارشاد احمد ارشاد مجسمہ شفقت ہیں۔ پیکر علم و اخلاق ہیں۔ ان کا طلبہ کے ساتھ برتاؤ ایسا ہے کہ وہ ان کے اخلاق حمیدہ کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اتنے شستہ، متمدن اور حلیم الطبع ہیں کہ ان کے پاس بیٹھے رہنے کو دل چاہتا ہے۔ ان کا پیریڈ ختم ہو جانے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت بہت جلد گزر گیا ہے۔ ذرا اور پڑھائیں تو اچھا ہوگا۔ ان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاگرد ان سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی شخصیت سے پیار کرنے لگ جاتا ہے۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ شاگرد کے ذہن کو پڑھتے ہیں۔ وہ جس قابلیت اور ذہن کا مالک ہوتا ہے اس کے مطابق پڑھاتے اور سمجھاتے ہیں وہ ہر قدم پر شاگرد کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اسے وہ مقام دلانے کے لئے کوشش کرتے ہیں جس مقام کی قابلیت وہ رکھتا ہو۔ انہیں کبھی غصہ نہیں آتا وہ فرمایا کرتے ہیں کہ بچوں کا دل ننھی کلیوں کی طرح ہوتا ہے۔ اگر انہیں احساس کمتری ہو جائے تو وہ پڑھنے کے قابل نہیں رہتے اور اگر نالائق ہیں تو ان کا دل ٹوٹ جاتا ہے مایوس ہو جاتے ہیں اور ان کا ذہن کند ہو جاتا ہے۔ ان کے ذہن کو بنانے کے لئے ان کی قابلیت کے معیار سے اوپر لے جانا ضروری ہے اور اگر وہ پہلا دوسرا سبق

پڑھ سکتا ہے تو اسے تیسرا سبق پڑھایا جائے گا تو اسے سمجھ آئے گا۔ اگر اسے بیسواں سبق پڑھایا جائے تو نہیں پڑھ سکے گا جب تک اس کی کمی کو پورا نہ کیا جائے گا۔ وہ آگے چلنے کے قابل نہیں ہو سکتا اور اس کے لئے بہت محنت درکار ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے استاد موصوف پیدا ہی فریضہ تدریسی کے لئے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھاتے اتنے پیار اور شفقت سے ہیں کہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔

ان میں دوسری صفت یہ ہے کہ وہ طلباء کو استاد بن کر ہی نہیں پڑھاتے بلکہ بحیثیت ایک دوست اور ہمدرد کے پڑھاتے ہیں۔ اس سے وہ شاگردوں کے دلوں میں اتر جاتے ہیں۔ وہ محبت بھی بہت کرتے ہیں۔ اس لئے تمام شاگردان کا احترام بھی بہت کرتے ہیں۔

جناب ارشاد کی رفتار و گفتار سے ان کی پروقار شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہمیشہ متبسم رہتے ہیں۔ انہیں اپنے مضمون پر مکمل عبور حاصل ہے۔ جب وہ پڑھاتے ہیں تو محض دائرہ کتاب کے اندر نہیں رہتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم و معرفت کا سمندر ہیں جو موجوں سے کھیل رہا ہے۔ وہ علم کے موتی بکھیرتے ہیں اور ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں جس سے حصول علم میں زیادہ دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

ان کی سب سے بڑی ہدایت یہ ہوتی ہے کہ میرا فرض ہے سمجھانا تمہارا فرض ہے سمجھنا۔ اگر میں تم کو صحیح نہیں سمجھتا تو میں اپنے فرض میں ناکام ہوں اور اگر تم نہ سمجھ کر کہتے ہو کہ سمجھ لیا ہے تو یہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ مجھے بھی دھوکے میں رکھا

اور اپنے آپ کو بھی۔ اس لئے جب تک بات تمہاری سمجھ میں نہ آ جائے کبھی نہ کہو کہ ہاں سمجھ آ گئی۔ اس چیز سے کبھی گھبرانا کہ پہلے اتنی بار پوچھ چکے ہیں۔ سو بار پوچھو میں سو بار سمجھاؤں گا پھر بھی سمجھ میں نہ آئے پھر پوچھتے رہو تا کہ پوری طرح سمجھ میں آ جائے۔

آپ بہت ہی نیک سیرت، خوش اخلاق اور پابند نماز ہیں۔ نماز کے لئے انہوں نے کبھی کسی کو جھڑکا نہیں، نیکی اور نماز کی خوبیاں بیان کر کے شوق پیدا کرتے ہیں جس سے طلباء خود بخود نماز کی طرف راغب ہو گئے ہیں۔ اسلام کو دین فطرت کہتے ہیں۔ تقلید بانی اسلامؐ میں ہر درد کا مداوا ان کا ایمان ہے۔ خدمت ملک وقوم ان کا اصول ہے۔ بلند ہمتی اور انکساری ان کا شعار ہے۔ الغرض ان کی بلند شخصیت کو میں اپنے لئے شمع ہدایت سمجھتا ہوں۔ ان جملہ اوصاف کی وجہ سے وہ مجھے بہت پسند ہیں۔

میرا بہترین دوست

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ کسی سے محبت کرے اور وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے دے۔ ایسے شخص کو جس سے وہ محبت کرتا ہے دوست کہا جاتا ہے۔ دوستی اور پیار محبت میں پائیداری صرف اس صورت میں ممکن ہے جب دو انسانوں کے خیالات کردار اور اطوار ملتے ہوں۔ ان کے افکار و اعمال ایک نقطہ پر مرکوز ہوتے ہوں تو یقیناً دونوں کے درمیان رابطہ اور محبت پیدا ہوگا اور اس میں پائیداری بھی ہوگی۔

ہر شخص کا خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ غریب ہو یا امیر شہری ہو یا دیہاتی کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی کو وہ اپنا ہمدرد ضرور سمجھتا ہے، اور کسی نہ کسی سے ہمدردی ضرور رکھتا ہے۔ یہ روحانی رشتہ روز ازل سے چلا آیا ہے۔ ہر دور میں ہر حال میں کسی کا کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہوتا ہے۔ انسانوں کی طرح دوستوں کے بھی مدارج ہوتے ہیں۔ کچھ دوست عام قسم کے ہوتے ہیں اور کچھ خاص قسم کے اور ان میں سے کوئی ایک خاص الخاص ہوتا ہے۔ اسے بہترین دوست سمجھا جاتا ہے جو دوست کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ خود مصائب اور تکالیف برداشت کرتا ہے لیکن اپنے دوست پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتا۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو دوست کہلواتے تو ہیں مگر جب دوست کو مصیبت پڑے تو پہلو تہی کر جاتے ہیں۔ یہ محض اپنی ذاتی منفعت کی خاطر دوست بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ زبانی دعوے تو بہت کرتے ہیں مگر بوقت امتحان پیٹھ

دکھا جاتے ہیں۔ دراصل ایسے لوگ دوست نہیں ہوتے بلکہ دوستی کے نام پر دھبہ ہوتے ہیں۔ ان میں نہ اخلاق ہوتا ہے نہ وفاداری کا شائبہ۔ انہیں دوست کہنا لفظ دوست کی توہین ہے۔

خدا کا شکر ہے مجھے بہت ہی اچھا دوست ملا ہے جو ہمہ صفت موصوف ہے۔ اس کا نام احمد ہے وہ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔ میرے محلے کا ہے اور نہایت ہی شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ حق دوستی کو سمجھتا ہے اور دوستی کے منشا کو خوب جانتا ہے۔ وہ پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک میرے ساتھ پڑھتا چلا آیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی طبیعت و عادات کو خوب سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ ہماری طبیعتیں اور عادتیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ احمد میری خاطر جان قربان کرنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے پریشان دیکھ کر خود پریشان ہو جاتا ہے۔ آڑے وقت میں میرے کام آتا ہے۔ کبھی کوئی الجھن آن پڑے تو اس کے لئے مجھے بہترین مشورے دیتا ہے اور مجھے ہر طرح سے تسلی دیتا ہے اور زبانی اور عملی مدد بھی کرتا ہے۔

جب ہم دوسری جماعت میں پڑھتے تھے تو احمد ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ وہ نہایت شریف اور کم گو لڑکا تھا مگر پڑھائی میں ہوشیار تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے ابو بھی احمد سے بہت پیار کرتے تھے اور مجھے اکثر کہا کرتے تھے کہ میں اس کے ساتھ سکول جایا کروں اور اس کے ساتھ جماعت میں بیٹھوں اور پڑھوں اور اس کے ساتھ کھیلا کروں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت سے میں جماعت میں بھی

اس کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ ہم اکٹھے ہی سکول جاتے اور آتے ہیں۔ کھیل کے وقت بھی اکٹھے ہی ہوتے ہیں اور پڑھائی بھی ہم اکٹھے ہی کرتے ہیں۔ میرا بھی جماعت کے اچھے لڑکوں میں شمار ہوتا ہے اور احمد کا بھی۔ اس لئے پڑھائی میں ہم ایک دوسرے کے لئے بہت ہی مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور اپنی جماعت میں بہت ہی ہر دل عزیز ہیں۔ احمد خاص طور پر اچھے اخلاق کا مالک ہے۔ ہر لڑکا اس کی عزت کرتا ہے۔ اساتذہ کرام بھی اسے بہت ہی شفقت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے ہماری پڑھائی پر اور بھی اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اس وقت ہم جماعت کے بہترین طلباء میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اتنی محنت کریں کہ دسویں جماعت میں وظیفہ حاصل کر لیں۔ احمد بہت ہی عزم صمیم کا مالک ہے اور اس نے یہ صلاحیت مجھ میں بھی پیدا کر دی ہے۔ انشاءاللہ ہم دونوں وظیفہ حاصل کریں گے۔

احمد سمجھتا ہے کہ آج کی محنت کل ہمارے لئے مفید ثابت ہوگی کیونکہ کالج میں داخلہ کے لئے زیادہ نمبروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا ارادہ انٹر میں سائنس مضامین لینے کا ہے۔ چونکہ ہم دونوں انجینئرنگ کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اس لئے کالج میں پری انجینئرنگ مضامین رکھنے پڑیں گے اور یہ صرف اس وقت ممکن ہوگا جب اعلیٰ نمبر حاصل کریں گے۔ ہمیں اس حقیقت کا علم ہے اور ہم اس کو پیش نظر رکھ کر محنت کرتے ہیں۔

احمد اکثر یہ کہا کرتا ہے کہ جس نے بزرگوں کی خدمت نہیں کی وہ کبھی مخدوم نہیں

ہوا اور جس نے اپنے اساتذہ کرام کا احترام نہیں کیا وہ کبھی دولت علم سے مالا مال نہیں ہوسکتا۔ اس لئے وہ خود بھی اس پر عمل کرتا ہے۔ اپنے والدین کی بے حد فرمانبرداری کرتا ہے۔ اپنے اساتذہ کرام اور بزرگوں کی بہت عزت کرتا ہے اور استاد بھی احمد پر خاص نظر شفقت رکھتے ہیں اور اس کی مشکل وقت میں رہنمائی کرتے ہیں۔ میں بہت ہی خوش بخت ہوں کہ مجھے احمد جیسا نیک، ہمدرد، قابل، فرمانبردار، وفا شعار، ذہین اور محنتی دوست ملا ہے۔

اختتام ۔۔۔

فہرست

میری پیاری سہیلی

سکول کی زندگی

میرا سکول

ہمارا ہوسٹل

زمانہ طالب علمی

طالب علم کا روزنامچہ

موسم برسات

موسم بہار

چاندنی رات

صبح کی سیر

ایک سیر

ایک یادگار سفر

ریل کا سفر

بس کا سفر

ہوائی جہاز اور اس کا سفر

ہمارے ذرائع آمد و رفت

ورزش کے فائدے

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کھیلوں کی اہمیت

ایک کرکٹ میچ کا آنکھوں دیکھا حال

فٹ بال میچ

میرا پسندیدہ کھیل

کبڈی

تعطیلات موسم گرما

سائنس کے کرشمے

پاکستان میں فنی تعلیم کی ضرورت

ٹیلی ویژن

ٹیلیفون

ریڈیو

آب دوز کشتی

عید الفطر

عید الاضحیٰ

یوم عاشورہ

۶ ستمبر

جلسہ تقسیم انعامات

چڑیا گھر

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

عجائب گھر

ایک دیہاتی میلہ

حضرت داتا گنج بخشؒ

داتا صاحبؒ کا عرس

ایک سرکس کا آنکھوں دیکھا حال

کسی شاندار جلوس کا آنکھوں دیکھا حال

ریلوے سٹیشن کا منظر

تندرستی ہزار نعمت ہے

حفظان صحت

دانتوں کی حفاظت

تمباکو نوشی اور اس کے نقصانات

ایٹم بم اور اس کی تباہ کاریاں

سیلاب کی تباہ کاریاں

بس کا حادثہ

آتشزدگی کا واقعہ

ریل کا حادثہ

روضہ تاج محل

مقبرہ جہانگیر

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

نور جہاں کا مزار

شہری دفاع

جنگ کے فوائد و نقصانات

گھریلو دستکاریاں

گداگری

فلم بینی

اخبار بینی

قومی تعمیر و ترقی میں افواج پاکستان کا حصہ

طاعون

ایڈز

غالب

میرا مشغلہ

رمضان المبارک

سچائی

استاد کے حقوق

والدین کے حقوق

میرا نصب العین

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights
©2002-2006

میری پیاری سہیلی

میری زندگی میں بہت سی سہیلیاں بنیں اور ان کے ساتھ کھیلنے کا اتفاق بھی ہوا کئی سہیلیوں سے اتنے اچھے تعلقات پیدا ہوئے کہ کئی کئی سال تک ان سے میرا رابطہ رہا مگر جو لگاؤ اور پیار مجھے سعیدہ سے ہے وہ نہ آج تک کسی سے ہوا ہے اور نہ ہی شاید کسی سے ہوگا۔

سعیدہ اور ہم ایک ہی گلی میں رہا کرتے تھے۔ اس کے والد واپڈا میں ایس ڈی او تھے اور میرے ابو تاجر تھے۔ ہم دونوں نے چھٹی جماعت میں گورنمنٹ گرلز ہائی سکول گوجرانوالہ میں داخلہ لیا اور نویں جماعت تک اکٹھی ہی رہیں۔ جب ہم نویں جماعت پاس کر کے دسویں جماعت میں گئیں تو سعیدہ کے ابو کا تبادلہ لاہور ہو گیا۔ مجبوراً ان لوگوں کو لاہور جانا پڑا اور سعیدہ کو بھی وہیں لاہور میں ہی داخل ہونا پڑا۔ اسی دن سے سعیدہ مجھے بہت یاد آتی رہتی ہے۔ ہم نے زندگی کے تقریباً چار سال اکٹھے گزارے اور اس قدر پیار اور محبت سے گزارے کہ اب بھی جب کبھی وہ لمحات یاد آتے ہیں تو آنکھوں کے پیمانے چھلک جاتے ہیں۔

جمیل آنکھوں کے پیمانے چھلک جاتے ہیں بھر بھر کے
وہ اگلی صحبت پیر مغاں جب یاد آتی ہے

سعید نہایت شریف دیندار اور پڑھی لکھی فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ پابند صوم و صلوٰۃ تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کی بہنیں اور امی پانچوں وقت میں سے ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں کیا کرتی تھیں اور جب کبھی میں ان کے گھر گئی ہوتی

اور نماز کا وقت آ جاتا تو وہ مجھے بھی نماز میں شامل کر لیتیں۔ ماہ رمضان میں وہ پورے کے پورے روزے رکھتیں بلکہ عید کے بعد کے چھ روزے بھی نہ چھوڑتیں۔ سعیدہ میرے ساتھ اس قدر پیار سے پیش آتی کہ مجھے اپنی سگی بہن سے بھی زیادہ عزیز رکھتی اور مجھے بھی اس سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ اس سے ایک لمحہ کے لئے بھی الگ ہونے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ وہ تین بہنیں تھی۔ دو بھائی تھے۔ سعیدہ ان میں سب سے بڑی تھی۔ دوسری دو بہنیں اس سے چھوٹی تھیں اور دونوں بھائی سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے گھر کا ہر فرد مجھے پیار کرتا تھا۔ اس کی امی اور اس کے ابو تو مجھے خاص شفقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور مجھے ہمیشہ بیٹی کہہ کر پکارتے تھے جیسے میرے اپنے ابو مجھے پیار سے پکارتے ہیں۔ اس سے پیار کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ سعیدہ ہی مجھ سے محبت کرتی تھی بلکہ ان کا سارا کنبہ ہی مجھ سے محبت کرتا تھا اور آج اگر سعیدہ مجھ سے جدا ہے تو اس اکیلی کی جدائی ہی مجھے نہیں ستا رہی بلکہ ان سب لوگوں کی یاد بھی آتی ہے جو سعیدہ سے متعلق تھے۔ وہ لوگ بھی مجھے سعیدہ سے کم پیار نہیں کرتے تھے۔ خدا جانے قدرت نے انہیں اخلاق، پیار، محبت اور شفقت کا کتنا بڑا خزانہ عطا کر دیا تھا کہ آج بھی سعیدہ کی جدائی میرے دل کو تڑپاتی رہتی ہے۔ اس کی پیاری پیاری باتیں مجھے یاد آتی رہتی ہیں۔ وہ صبح کو جلدی ہی گھر سے تیار ہو کر مجھے سکول لے جانے کے لئے آ جاتی تھی۔ اگر میں تیار نہ ہوتی تو وہ میری تیاری میں میری مدد کرتی۔ اگر میرے حصے کا گھر کا کوئی کام رہ بھی جاتا تو جھٹ سے اسے کر دیتی اور مجھے اس طرح سکول لے

کر جاتی جس طرح یہ اسی کی ذمہ داری ہے۔

سعیدہ میرے ساتھ چار سال تک پڑھتی رہی مگر اس نے سکول سے ایک دن بھی ناغہ نہیں کیا اور نہ مجھے کرنے دیا۔ اگر کبھی طبیعت خراب بھی ہو جاتی تو پروا نہ کیا کرتی تھی۔ کہا کرتی تھی کہ یہاں بھی بیکار بیٹھے یا لیٹے رہنا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ سکول میں چلتے ہیں طبیعت ادھر ادھر بہل کر خود ہی ٹھیک ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ سعیدہ میں قوت مدافعت اور قوت ارادہ بہت زیادہ تھی اور خود اعتمادی تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ نہایت ذہین تھی۔ وہ چھٹی جماعت سے ہائی کلاس تک وظیفہ لیتی چلی آئی تھی اور اگر اب بھی ہمارے سکول میں وہ پڑھتی تو جماعت میں اول آتی اور دسویں جماعت میں بھی ضرور وظیفہ حاصل کرتی۔ اب بھی مجھے امید ہے جہاں کہیں بھی ہے انشاءاللہ وظیفہ ضرور لے گی۔ اس کے خطوط سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ وظیفے کی تیاری کر رہی ہے۔

سعیدہ کے چلے جانے کے بعد مجھے ہی نہیں ہمارے گھر والوں کو بھی ان سب کا خلا محسوس ہوا۔ میرے ابا اکثر کہتے ہیں کہ سعیدہ بہت ہی نیک بچی تھی جب سے وہ گئی ہے مجھے خالدہ (میرا نام) کی پڑھائی کی بہت فکر رہتی ہے۔ پتہ نہیں اب اس کی پڑھائی کا کیا حال ہے۔ وہ خود اسے محنت کرایا کرتی تھی۔ اس کا خیال رکھتی تھی۔ خود بھی نیک تھی اسے بھی نیکی کی طرف راغب کرتی تھی۔

میرے ساتھ اور بھی کئی لڑکیاں پڑھا کرتی تھیں۔ کھیلا کرتی تھیں۔ مگر خدا شاہد ہے کہ ہم دونوں کو آپس میں پڑھنے کھیلنے اور باتیں کرنے میں جو لطف محسوس ہوتا

تھا اب کبھی محسوس نہیں ہوتا کیونکہ اب سعیدہ موجود نہیں ہے۔ سعیدہ سعیدہ تھی۔ نہ اور لڑکیوں میں اس جیسی صفات ہیں اور نہ اس جیسی عادات ہیں۔ مجھے بھی وہ اسی لئے بہت یاد آتی رہتی ہے۔ میں اس کے حق میں دعا کرتی رہتی ہوں کہ وہ جہاں بھی ہو خدا اسے ہمیشہ خوش رکھے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سکول کی زندگی

زندگی میں انسان بہت سے مرحلوں اور بہت سی منزلوں سے گزرتا ہے۔ زندگی کے سفر میں سکول کی زندگی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ سکول وہ جگہ ہے جہاں پر قوم کے نونہالوں کو زیورِ علم سے آراستہ کیا جاتا ہے اور انہیں نیک و بد کی تمیز سکھائی جاتی ہے۔ ان کی ذہنی پرواز کو بلندی بخشی جاتی ہے۔ ان کے اخلاق و اطوار میں نکھار پیدا کیا جاتا ہے اور افکار و عادات میں پاکیزگی کا رنگ بھرا جاتا ہے۔ ان کے شعور کو پختہ کیا جاتا ہے اور قلب و نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

سکول کی زندگی کا زمانہ بھی سنہری زمانہ کہلاتا ہے۔ اس میں ذہن تفکرات سے آزاد ہوتا ہے۔ کوئی معاشی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ اس میں انسان اپنی نیند سوتا ہے اپنی نیند جاگتا ہے۔ یہ زندگی بنانے اور بگاڑ دینے کا زمانہ ہے یہ زندگی کا وہ حصہ ہے جس میں طالب علم جو جی چاہے بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر، قانون دان، سائنسدان، ادیب، استاد، کھلاڑی مہم جو، جنگجو وغیرہ۔ جو بھی نصب العین سامنے رکھا جائے گا اس میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ اس زمانے کی محنت ساری عمر کام آتی ہے اور جو طلباء اس زمانہ کی قدر نہیں کرتے وہ ساری عمر ذلیل و خوار پھرتے ہیں۔ سنہری موقع ہاتھ سے نکل گیا ہوتا ہے۔ تفکرات اور ذمہ داریاں ہر طرف سے انہیں گھیر لیتی ہیں۔ سب موقعے اس وقت ان کے ہاتھ سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ سکول کی زندگی کی اس وقت قدر ہوتی ہے۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

یہ زمانہ آزادی کا زمانہ ہوتا ہے۔فکر ہوتی ہے تو والدین کو یا استاد کو شاگرد کو دین و دنیا کا کوئی غم نہیں ہوتا۔صبح اٹھے ناشتہ مانگ لیا کتابیں اٹھائیں اور سکول چلے گئے دوپہر کو کھانا کھالیا۔سو گئے پھر سکول کا کام کرلیا۔شام کو کھیلنے چلے گئے۔ شام کو پھر کھانا کھایا اور سو گئے۔اور اسی طرح سے یہ زمانہ گزر جاتا ہے۔جب اتنی بےفکری ہو۔وقت بھی بہت ہو تو پھر صرف اتنا سوچ لینے سے کہ ہمارا فائدہ کس میں ہے کس میں نہیں۔زندگی بن جاتی ہے۔بس ایک طالب علم کی یہی ایک اور صرف ایک ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے برے بھلے کے لئے سوچے۔اگر وہ یہ سوچ لے تو یقیناً اس کی زندگی بن جائے گی۔اگر اسے یہ احساس ہو جائے کہ یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر واپس نہیں آئے گا تو زندگی کبھی ناکام نہیں ہوسکتی۔

سکول کی زندگی ایک طالب علم میں تنظیم، اعلیٰ اخلاق، اتحاد اور ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔غریبوں کی مدد کرنے حاجتمندوں، ضعیفوں کے کام آنے کی اقدار اسی زمانے میں پختہ ہوتی ہیں۔اس زمانے میں نیک سیرت خوش خلق اعلیٰ کردار اور صاحب علم اساتذہ کی صحبت میسر آتی ہے جو اپنے شاگردوں میں اپنے جیسی صفات پیدا کر دیتے ہیں۔اساتذہ کرام سے زیادہ زمانہ طالب علمی میں کوئی مشفقانہ رہنمائی نہیں کرسکتا۔ان کی پند و نصائح کی نعمت بھی اسی زمانے میں میسر ہوتی ہے۔نصابی علم کے ساتھ ساتھ وہ اپنے شاگردوں کو تجرباتی اسباق بھی پڑھاتے ہیں۔سکول کے در و دیوار، فضاء اساتذہ وہاں کے درخت، وہاں کا سبزہ زار، وہاں کا ہر خشک و تر صرف اور صرف طلبہ کی بہبود کے لئے ہوتا ہے۔وہاں پر

گورنمنٹ جتنا بھی خرچہ کرتی ہے وہ اسی لئے کیا جاتا ہے کہ نونہالان قوم بڑے ہو کر ملک کے لئے بہترین صلاحیتوں سے لیس ہو کر باعث فخر بنیں اور جو طلبہ پھر بھی اس سے فائدہ نہ اٹھائیں تو ان کی انتہائی بدقسمتی ہوتی ہے۔ وہ اپنی عمر کا بھی ضیاع کرتے ہیں اور ملک کا روپیہ بھی برباد کر دیتے ہیں۔ اپنے اور اپنے بوڑھے والدین پر ظلم کرتے ہیں۔

وہ طالب علم جنہیں اپنے وقت کی قدر ہوتی ہے وہ ماں باپ کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتے ہیں اور دن رات محنت کرتے ہیں تاکہ کچھ بن کر دکھائیں لیکن جن طالب علموں کو اپنے وقت کی قدر نہیں ہوتی اور انہیں اپنے والدین کے خرچ ہونے والے روپے پیسے کا خیال بھی نہیں ہوتا وہ ہمیشہ نالائق بداخلاق بدکردار اور آوارہ ہو جاتے ہیں۔ تعلیم میں ان کا دل نہیں لگتا۔ وہ والدین کو دھوکے میں رکھتے ہیں کہ ہم سکول پڑھنے جا رہے ہیں۔ گھر سے وقت پر سکول آ جاتے ہیں۔ مگر راستے ہی میں شرارتوں اور آوارگیوں میں مشغول ہو جاتے ہیں اور شام کو بن پڑھے وقت پر گھر چلے جاتے ہیں۔ ایسے لڑکے اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑا مارتے ہیں۔ اپنی غلطی کا اس وقت تو انہیں پتہ نہیں چلتا مگر جب عملی زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو بری طرح سے ناکام ہوتے ہیں۔ زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ والدین بھی بڑھاپے کے دھکے کھا کر اپنی بدقسمتی پر روتے روتے مر جاتے ہیں۔ آئندہ ترقی کے مواقع ختم ہو جاتے ہیں۔ ایسے طالب علم جو زمانہ طالب علمی سے فائدہ نہیں اٹھاتے وقت کی سزا سے نہیں بچ سکتے۔ وقت کی سزا تکلیف دہ بھی ہوتی

ہے جو زندگی کے آخری دم تک ساتھ چلتی ہے۔ جو وقت کی قدر نہیں کرتے وقت انہیں پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ سکول کا زمانہ تو انسان کی زندگی کا سنہرا زمانہ ہوتا ہے۔ اس میں اگر انسان سونے کا بھی بننا چاہے تو بن سکتا ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

میرا اسکول

سکول وہ جگہ ہے جہاں بچے کو حیوانیت سے نکال کر انسانیت کا جامہ پہنایا جاتا ہے ناپختہ ذہن کو پختگی بخشی جاتی ہے۔ جہاں جہالت کی تاریکیاں روشنیوں میں تبدیل کی جاتی ہیں۔ جہاں شعور و تمیز کا زیور پہنایا جاتا ہے۔ جہاں دل کو وسعت حوصلہ اور نگاہ کو بلندی بخشی جاتی ہے۔ علم کی ضیاء سے زمانے کو روشن کرنے کی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے۔ عادات و شعار اور فکر و نظر کی اصلاح کی جاتی ہے۔ عرفان خدا سکھا کر عبودیت کا حق ادا کرنے کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ کائنات کی ہر شے کی تسخیر کرنے کا اسلوب سکھایا جاتا ہے۔ میرا اسکول بھی انہی صفات کا حامل ہے۔ میرے سکول کے مین گیٹ کے اوپر یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

قسمت نوع بشر تبدیل ہوتی ہے یہاں
اک مقدس فرض کی تکمیل ہوتی ہے یہاں

میں جب روزانہ سکول جاتا ہوں تو ہر روز یہی شعر لکھا ہوا پاتا ہوں۔ جتنا سوچتا ہوں اس شعر کی حقیقت مجھ پر اتنی ہی واضح ہوتی چلی جاتی ہے کہ واقعی جو فرائض یہاں انجام پاتے ہیں مقدس ہیں اور اس کے تقدس کی تصدیق اس سے اور بڑی کیا ہو سکتی ہے کہ یہاں انسانوں کی قسمتیں تبدیل ہوتی ہوں۔ اساتذہ کرام کا وجود اس لحاظ سے بلند ہے کہ ان کے ہاتھوں میں لوح بھی ہے اور قلم بھی۔ جب میں سکول میں قائد اعظم اور علامہ اقبال کی تصویریں دیکھتا ہوں تو مجھے یقین آ جاتا ہے کہ یہ شعر درست ہے کہ وہ بھی تو ایسے ہی سکول میں پڑھے تھے۔

میرا سکول بہت بڑا ہے جس کے میدان بہت وسیع ہیں۔ سائنس روم ہے۔ ساتھ ہی لیبارٹری ہے۔ کھلا ڈرائنگ روم ہے۔ زراعت کے لئے تجرباتی فارم بھی ہیں۔ بجلی پانی اور پنکھوں کا انتظام ہے۔ بجلی کا علیحدہ کنٹرول روم ہے۔ پانی کی اونچی ٹینکی ہے۔ دلکش کیاریاں پھولوں کی بہاروں سے بھری پڑی ہیں۔ ہرے درخت خوبصورت پھول اگلتے ہوئے فوارے کیف ونشاط کا روح پرور منظر پیش کرتے ہیں۔

سکول کی عمارت کے سامنے والے حصے میں ایک ہال ہے جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ God is almighty سکول کے سامنے والے بڑے کمرے پر اعلان ہو رہا ہے کہ جس خدا کو ہم مانتے ہیں وہی معبودیت کے لائق ہے اور احکم الحاکمین ہے۔ وہ بڑی عظمت والا ہے اور قادر مطلق ہے ہمارا خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر ہم اس کے آگ جھکیں اور اس سے جو کچھ مانگیں گے وہ ہمیں ضرور دے گا۔

قائداعظم کی سوانح حیات میں آتا ہے کہ جس مدرسے میں انہوں نے کراچی میں داخلہ لیا تھا اس کا نام تھا سندھ مدرستہ العلوم ہائی سکول۔ اس سکول کے صدر دروازے پر لکھا ہوا تھا۔ Enter to Learn go to Serve اس نے ان کے دل میں پڑھائی کا شوق اور خدمت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اسی جذبے نے انہیں قائداعظم بنایا اور اسی جذبے نے ان کے ناتواں قواء کو پاکستان کے بنانے کے مشکل ترین کام کے لئے قوت بخشی۔

یہ خاموش تحریریں دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں۔اس لئے کہ ان میں حقائق چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ایک کمرے میں لکھا ہوا ہے۔ Do Good And Believe In God اس میں بھی بہت صداقت ہے۔سب سے پہلے عمل بالخصوص نیک عمل کی تاکید ہے۔عمل کا نتیجہ خدا پر چھوڑا گیا ہے۔خدا عمل کرنے والے کو اس کا پھل ضرور دیتا ہے۔دوسرے اس میں ایک اور سبق ہے کہ تقدیر کے سہارے ہاتھ باندھ کر بیٹھ رہنا بالکل بیکار ہے۔تیسرے جب تک تم اپنی مدد آپ نہیں کرو گے خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا۔پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھو اور پھر خدا پر توکل کرو۔خدا تعالیٰ پر مکمل یقین کے بغیر عمل بھی بے کار ہے۔

انسانیت کی خدمت کا سبق دینے کے لئے ایک جگہ لکھا ہوا ہے۔

To Love God Is To Love Man

علامہ اقبال نے ان کو اس طرح پیش کیا ہے۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

اس طرح سے میرے سکول میں لعل و جواہرات کے ایسے ایسے انبار لگے پڑے ہیں جن کی تفصیل کا احاطہ اس چھوٹے سے مضمون میں کرنا ممکن نہیں۔

میرے سکول کے ہیڈ ماسٹر نہایت قابل اور تجربہ کار ہیں۔آپ ایم اے بی ایڈ ہیں۔انہیں تعلیم و تدریس پر عبور حاصل ہے۔وہ قابل محنتی دیانتدار اور نہایت مخلص ہیں۔وہ نہایت محبِ وطن،قوم پرست اور اسلامی نظریات کے حامل ہیں۔یہی وجہ

ہے کہ ہمارے سکول کے نتائج نوے پچانوے فیصد ہوتے ہیں۔

ہمارے سکول کا سٹاف تقریباً ساٹھ اساتذہ پر مشتمل ہے جو اپنے اپنے علم و فن میں پوری دسترس رکھتے ہیں۔ طلباء کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے۔ دو چپڑاسی، مالی اور خاکروب بھی ہیں۔ میرے سکول کا شمار پنجاب کے بہترین سکولوں میں ہوتا ہے۔ مجھے اپنے سکول سے بہت محبت ہے۔ یہ سکول مجھے بہت پسند ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ہمارا ہوسٹل

جن طلباء کے گھر سکول سے دور ہوتے ہیں یا ایسی جگہوں پر ہوتے ہیں جہاں سے روزانہ آنے جانے میں بہت تکلیف ہوتی ہے اور پڑھائی بھی متاثر ہوتی ہے وہ اپنے قیام کا انتظام ہوسٹل میں داخلہ لے کر کرتے ہیں جو عام طور پر سکول کی کسی ملحقہ عمارت میں ہوتا ہے۔ مجھے بھی اسی قسم کی دقت کا سامنا تھا۔ لہٰذا مجھے بھی ہوسٹل میں داخلہ لینا پڑا۔

مجھے ہوسٹل میں داخلہ لئے ایک ماہ گزر گیا ہے۔ میرا ماحول چونکہ دیہاتی ہے میں شروع سے ہی روزانہ اپنے گاؤں چلا جایا کرتا تھا جو سکول سے سات میل دور ہے۔ اب چونکہ دسویں جماعت کا امتحان سر پر آ گیا ہے جس میں ہر حال میں کامیابی حاصل کرنا میری نصب العین تھا اس لئے میرے مشفق اور محترم اساتذہ نے مجھے مشورہ دیا کہ روزانہ صبح کو سات میل اور شام کو سات میل کا تھکا دینے والے سفر سے کم از کم دو گھنٹے ضائع ہوتے ہیں اور گھر جا کر کچھ اور بھی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ امتحان تک ہوسٹل میں داخلہ لے لو۔ والد محترم نے بھی اس سے اتفاق کیا اور میں داخل ہو گیا۔

پہلے روز جب میں ہوسٹل میں آیا تو مجھے عجیب سا لگا۔ مجھے ہوسٹل کے اصولوں سے آگاہ کیا گیا اور ان اصولوں کی پابندی کی تاکید کی گئی۔ میں کھلے ماحول میں رہنے کا عادی تھا جہاں پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ مجھے کمرہ نمبر بتایا گیا جہاں پر میرا ایک روم میٹ بھی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بہت خوش اخلاق اور محنتی لڑکا

ہے۔وہ میرا ہم جماعت ہے جس کا نام عابد ہے۔ایسا اچھا روم میٹ ملنے سے بھی خوشی ہوئی اور بعد میں بھی وہ میرے لئے اور میں اس کے لئے بہت ہی مددگار ثابت ہوئے۔

ہمارے ہوسٹل کی عمارت بالکل نئی خوبصورت اور عالیشان ہے جس میں پچاس کے قریب کمرے ہیں۔ ہر کمرے میں چار لڑکے رہتے ہیں لیکن میرا کمرہ چونکہ چھوٹا ہے اس میں صرف میرے اور میرے روم میٹ کے لئے ہی گنجائش ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے لئے بہت ہی اچھا ہوا۔ عابد اور میں کلاس کے اچھے لڑکوں میں شمار ہوتے ہیں ہماری عادات بھی ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور حسن اتفاق سے ہیں بھی ایک ہی گاؤں کے۔ ہر کمرے میں بجلی اور پنکھے کا انتظام ہے۔ کتابیں اور دوسرا سامان رکھنے کے لئے معقول انتظام ہے۔ ہر کمرے میں لڑکوں کی تعداد کے مطابق میز اور کرسیاں بھی ہیں۔ سب کمرے روشن اور ہوادار ہیں۔

ہمارے ہوسٹل میں جسمانی اور ذہنی مشاغل کا بھی انتظام ہے۔کھیل کا میدان کھیلوں اور جسمانی ورزش کے لئے ہے کامن روم میں طلباء کے لئے ریڈنگ روم بھی ہے اور ٹیبل ٹینس بھی، اخبار و رسائل کا بھی انتظام ہے۔ فارغ اوقات میں طلباء نصاب کے علاوہ غیر نصابی معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کرتے ہیں۔ ہوسٹل میں ہماری ایک بزم ادب بھی ہے جس کے اجلاس ہفتہ وار ہوتے رہتے ہیں۔ میں چونکہ ادبی ذہن رکھتا ہوں اس لئے میرے لئے یہ بہت ہی دلچسپی کا باعث ہے۔

اسی لئے میں بڑھ چڑھ کران اجلاسوں میں حصہ لیتا ہوں۔

ہمارے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ نہایت قابل، خوش اخلاق اور اعلیٰ کردار کے مالک ہیں جن کا نام نامی خلیل احمد ہے۔ آپ نفسیات میں ایم اے ہیں۔ فارغ اوقات میں وہ اکثر ہمیں اپنے علم سے مستفیض کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ نفسیاتی طور پر انہوں نے ہر ہوسٹل کے لڑکے کو اس قابل بنا دیا ہے کہ اس نے دنیا میں رہتے ہوئے عملہ زندگی میں مشکلات کا کس طرح مقابلہ کر کے کامیاب ہونا ہے۔ انہوں نے ہمارے دل میں یہ بات راسخ کردی ہے کہ انسان یہاں پر عیش و آرام کرنے نہیں دیا بلکہ یہاں پر مشکلات کا سامنا کرنے اور خلق خدا کی خدمت کے لئے آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا اچھا سبق دے کر انہوں نے ہم پر بہت احسان کیا ہے۔ ہمیں امید واثق ہے کہ زندگی کے کسی مرحلے پر ہم انشاءاللہ ناکام نہیں رہیں گے۔ ان کا موضوع اکثر اوقات اقبال کا فلسفہ خودی ہوا کرتا ہے۔ انہوں نے زندگی گزارنے کا جو بہترین فارمولا ہمیں دیا ہے وہ اس شعر میں اس طرح بند ہے جس طرح دریا کوزے میں بند کر دیا ہو۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ہوسٹل کی زندگی میں خود اعتمادی کا سبق ملتا ہے۔ والدین سے دور رہ کر اپنی ہی قوت ارادہ اور اپنی ہی رائے اور فیصلہ سے کام لینے کا عادی بننا پڑتا ہے۔ یہاں پر ایک نظم وضبط ہوتا ہے جس سے طلباء منظم ہونے کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔ پابندی وقت

ہماری عادات کا حصہ بن جاتی ہے۔ٹائم ٹیبل کے مطابق پڑھنے سے حصول علم میں بہت جلد کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم، لیاقت علی خاں اور علامہ اقبال جیسی عظیم ہستیوں نے بھی ہوسٹلوں میں قیام کیا۔

ہوسٹل میں جہاں اکثر اچھے لڑکے ہوتے ہیں وہاں کچھ ایسے لڑکے بھی ہوتے ہیں جو والدین کی غیر موجودگی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور والدین کی خون پسینے کی کمائی کو فلم بینی اور فضول مشاغل میں ضائع کرتے ہیں۔ان کے ایسا کرنے میں ہوسٹل کا کوئی قصور نہیں وہ اصل میں غیر ذمہ دارانہ ذہن رکھتے ہیں۔اگر وہ ہوسٹل میں نہ بھی داخل ہوتے تو گھروں میں رہ کر بھی اسی قسم کے شعار کے مالک رہتے۔مجموعی طور پر ہوسٹل ایک ایسی جگہ ہے جہاں طلباء کو اپنی زندگی سنوارنے کے بہت سے مواقع ملتے ہیں۔ان سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا ان کا اپنا کام ہے۔

زمانہ طالب علمی

زمانہ طالب علمی انسان کی زندگی کا سنہری زمانہ ہوتا ہے۔ طالب علمی کا زمانہ صحیح معنوں میں بے فکری، اطمینان اور آرام کا زمانہ ہوتا ہے۔ یہ زمانہ تفکرات اور معاشی ذمہ داریوں سے پاک ہوتا ہے۔ سورج مشرق سے چڑھے یا مغرب سے طالب علم کو اس بات کا غم نہیں ہوتا۔ وہ اپنی مرضی سے اٹھتا اپنی مرضی سے بیٹھتا، اپنی مرضی سے کھیلتا اور اپنی مرضی سے سوتا ہے۔ جو جی میں آیا اس نے مانگ لیا۔ اس کی صحت بھی ٹھیک ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور خوشی کھیلتی رہتی ہے۔ اور اس کی کوئی ذمہ داری ہوتی ہے تو صرف اتنی کہ صبح اٹھے ناشتہ کرے اپنے مطالبے منوائے اور سکول چل دے۔ وہاں جا کر ایک مقررہ پروگرام کے تحت پڑھنا پڑھتا ہے۔ ہر پیریڈ کے لئے ٹائم ٹیبل بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے مطابق اساتذہ کرام آ کر پڑھاتے ہیں۔ طالب علم کی ذمہ داری صرف توجہ دینا ہوتی ہے۔ تفریح میں تھوڑا بہت کھا پی کر تازہ دم ہوتے، کچھ گپیں وغیرہ ہانکتے اور پھر جماعت میں چلے جاتے ہیں۔

اختیاری مضامین میں سے تو کسی طالب علم نے کوئی مضمون لے رکھا ہوتا ہے اور کسی نے کوئی اور لیکن جو لازمی مضامین ہوتے ہیں وہ تو سب کو پڑھنے ہی پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلباء کی اپنی مرضی پر ہے کہ جو مضامین وہ اپنے لئے بہتر سمجھیں لے سکتے ہیں۔ انہیں مضامین کے انتخاب میں پوری آزادی ہوتی ہے۔ صرف اتنا ضروری ہے کہ جو طالب علم سائنس کے مضامین میں نہیں چل سکتے انہیں وہ مضامین

نہیں دیئے جاتے تا کہ آگے چل کر یہ مضامین ان کے لئے وبال جان نہ بن جائیں۔ اس لئے طلباء کو بھی چاہیے کہ مضامین کا انتخاب اپنے مزاج کے مطابق کریں۔ تا کہ ان میں وہ آسانی سے کامیابی حاصل کر سکیں ایسے مضامین لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا جن میں وہ چل نہیں سکتے۔

چھٹی ہوتے ہی طلباء آزاد ہوتے ہیں۔ خوشی خوشی گھر لوٹتے ہیں، منہ ہاتھ دھوتے ہیں یا نہاتے ہیں دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں۔ اگر گرمی کا موسم ہوا تو سو جاتے ہیں۔ اس کے بعد سکول کا کام کر لیا۔ شام ہوئی کھیل کے میدان میں کھیلنے چلے گئے۔ وہاں کوئی کرکٹ کھیل رہا ہوتا ہے۔ فٹ بال کا شوقین فٹ بال کھیلتا ہے۔ جو ہاکی سے دلچسپی رکھا ہے ہاکی کھیلتا ہے۔ غرض شام تک خوب تفریح کرتے ہیں۔ اس سے ان کی صحت کو قائم رکھنے کا انتظام بھی ہوتا ہے اور سارے دن کا دماغی بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ دوسروں سے تبادلہ خیال اور ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے اور شام کو اپنے گھر کی طرف رخ کرتے ہیں۔

سکول کی زندگی میں تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کی صحت درست رکھنے کے لئے کھیلوں کا انتظام بھی ہوتا ہے اور جسمانی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ بعض طلباء کھیل میں اس قدر دلچسپی لیتے ہیں اور ان میں ایسی صلاحیتیں ہوتی ہیں کہ وہ بہت جلد کھیل کے میدان میں اپنا نام پیدا کر لیتے ہیں اور اپنی پسند کے کھیل میں آہستہ آہستہ مہارت حاصل کر لیتے ہیں اور قومی سطح پر پہچانے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اگر وہ اس میں بھی زیادہ آگے نکل جائیں تو بین الاقوامی مقابلوں کے لئے منتخب کر

لئے جاتے ہیں۔ جو کھلاڑی بین الاقوامی سطح پر کھیلتے ہیں اور نام پیدا کرتے ہیں اس میں محض ان کی اپنی عزت ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ اس ملک کا نام بھی روشن کرتے ہیں جس سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ عمران خان کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ جب بھی عمران خان کا نام آتا ہے تو پاکستان کا نام ضرور آتا ہے۔ اچھے کھلاڑی ایسی سفارت کاری کرتے ہیں کہ ملک کے سفارت خانے بھی انجام نہیں دے سکتے۔ اس سے دوسرے ملکوں سے ثقافتی تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے ملک میں آنا جانا ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

طالب علمی کا زمانہ وہ زمانہ ہوتا ہے جس میں طالب علم جو چاہے بن سکتا ہے۔ اس میں اس کا رجحان اور توجہ کام آتی ہے۔ کوئی انجینئر بننا چاہے تو بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر بننا چاہے تو بن سکتا ہے۔ دانشور بننا چاہے تو بن سکتا ہے۔ ادیب بننا چاہے یا کھلاڑی بننا چاہے تو بن سکتا ہے مگر یہ تمام چیزیں لگن محنت اور جہد مسلسل سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ نہیں کہ پڑھائی کی طرف توجہ نہ دے۔ استاد کی عزت بھی نہ کرے اور اپنے نصب العین کی طرف قدم بھی نہ بڑھائے اور کامیاب بھی ہو جائے۔ اگر ایسا کرے گا تو وہ سمجھ لے کہ اس نے ایسا موقع کھو دیا ہے جو زندگی میں کبھی ہاتھ نہیں آئے گا اور اس نے اپنے اوپر سب سے بڑا ظلم کیا ہے۔ اس نے اپنی ساری زندگی اپنے ہی ہاتھوں برباد کر لی ہے اور اب وہ جو جی چاہے کرتا رہے تیر کمان سے نکلا ہوا کبھی واپس نہیں آیا کرتا۔ لہٰذا زمانہ طالب علمی وہ زمانہ ہے جو زندگی کا اہم ترین زمانہ ہے۔ یہ سنہری زمانہ اس لئے نہیں ہے کہ اس میں کوئی فکر

فاقہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ زمانہ زیادہ تفکر کا ہوتا ہے اگر اس میں سوچ کر صحیح فیصلہ کیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو یہ سنہری زمانہ ثابت ہوسکتا ہے۔ ورنہ یہ وہ زمانہ ثابت ہوتا ہے۔ جس میں انسان اپنی زندگی کا قیمتی وقت ضائع کرتا رہا ہے۔ یہ زندگی کا اہم ترین حصہ ہوتا ہے۔ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر زندگی کا پروگرام مرتب کر کے اس پر پامردی اور مستقل مزاجی سے گامزن ہونا چاہیے تا کہ آئندہ زندگی اپنے لئے اور ملک وقوم کے لئے مفید ثابت ہو۔

All rights reserved. ©2002-2006

طالب علم کا روزنامچہ

جو لوگ اپنا حساب کتاب رکھتے ہیں وہ کامیاب تاجر ہوتے ہیں۔ اپنے کاروبار کی تفصیل روزانہ لکھنا، آمدن اور خرچ کی باقاعدہ تفصیل لکھنا ہی حساب رکھنا کہلاتا ہے۔ حساب تاریخ وار رکھا جاتا ہے۔ تاجر جو کاروبار کرتا ہے اسے قلمبند کر لیتا ہے۔ اس سے اس کا پیسہ ضائع ہونے یا اس کی کسی غلط مد پر خرچ ہونے کا احتمال نہیں رہتا اور اگر وہ حساب نہ لکھے اور صرف اپنی یادداشت پر انحصار کرے تو لین دین کا معاملہ بالکل ہی چوپٹ ہو کر رہ جائے۔ لکھے ہوئے حساب کو جب جی چاہے دیکھ سکتے ہیں اور اس سے اپنے کاروبار کی رفتار کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتنا نفع ہوا ہے یا کتنا نقصان ہوا ہے، فلاں کاروبار کی مد میں کس قدر فائدہ ہوا ہے اور فلاں میں کتنا نقصان ہوا ہے۔ اس سے ایک تو کاروبار کو کنٹرول کرنے میں مدد ملتی ہے، دوسرے جب بھی وہ کھاتہ کھولتے ہیں تو سارا حساب آئینے کی طرح سامنے آ جاتا ہے۔ حساب کی ان کتابوں میں ایک کتاب روزنامچہ ہے جسے ہر روز تاریخ وار لکھنا پڑتا ہے۔ یہیں سے حساب کی ابتدا ہوتی ہے۔

جس طرح کاروباری لوگ اپنا حساب کتاب روزانہ لکھتے ہیں اسی طرح جو لوگ اپنا روزنامچہ لکھتے ہیں۔ وہ اپنی تمام دن کی حرکات و سکنات قلمبند کر لیتے ہیں۔ یہ روزنامچہ جب بھی کھولیں تو دیکھ سکتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو کیا کیا کام کیا اور کس کس وقت کیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ روزنامچہ لکھنے والا روزانہ لکھنے کا

عادی ہوتا ہے کیونکہ وہ کچھ نہ کچھ کام تو ہر روز کرتا ہے اور اسی روز ہی اسے لکھنا ہوتا ہے اور پابندی کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے۔ اس سے روزنامچہ لکھنے والے کو یہ پتا چلتا رہتا ہے کہ اس نے فلاں تاریخ کو کونسا مفید کام کیا اور کونسا کام ایسا کیا جس میں اس نے محض وقت ضائع کیا۔ گویا اس طرح اس میں شعور سود و زیاں پیدا ہو جاتا ہے اور یہی شعور انسان کو ترقی کی راہ پر چلاتا ہے۔

میں میٹرک کا طالب علم ہوں اور پابندی سے روزنامچہ لکھنے کا عادی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ روزنامچہ لکھنے سے پابندی وقت کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے اپنی روزمرہ کی مصروفیات کو قلمبند کرنے کے لئے میں نے رات کا وقت مخصوص کر رکھا ہے۔ یہ روزنامچہ اب ایک اچھی خاصی ضخیم ڈائری کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ جب میں سابقہ تاریخوں کا روزنامچہ دیکھتا ہوں تو ایسے ایسے واقعات میرے سامنے آ جاتے ہیں جو میرے ذہن سے بالکل ہی محو ہو چکے تھے۔ بیتے ہوئے لمحات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان واقعات و مصروفیات کو از سر نو دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت میرے سامنے پچھلے جمعہ کا روزنامچہ کھلا پڑا ہے۔ حاجات ضروریہ سے فارغ ہو کر میں نے غسل کیا اور مسجد میں چلا گیا۔ نماز کے بعد صوفی صاحب کا درس سنا۔ اس کے بعد مسجد میں تلاوت کلام پاک کی اور اس کا ترجمہ پڑھا اور سمجھا۔ اس کے بعد گھر آ گیا۔ بازار سے سودا سلف لا کر تھوڑی دیر بعد ناشتہ کیا۔ رومال پکڑا اور بازار سے سبزی وغیرہ لینے چلا گیا۔ واپس آ کر یہ سب چیزیں امی کو دے کر اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلا گیا

اور ساڑھے دس بجے تک مطالعہ کیا۔ ساڑھے دس بجے میں نے ایک کپ چائے اور دو بسکٹ لئے۔ ذرا سستایا اور پھر مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ ایک بجے امی نے آواز دی کہ کھانا کھا لو۔ ہم سب نے مل کر ایک ہی دسترخوان پر بڑے مزے سے کھانا کھایا۔ آج کا کھانا نسبتاً زیادہ مزیدار بھی تھا کیونکہ جمعہ کی وجہ سے کھانے کا پروگرام خصوصی تھا۔ میٹھی ڈش خاص طور پر مزیدار تھی ہم نے تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر نماز جمعہ کے لئے قریبی مسجد میں چلا گیا نماز کے بعد کچھ دیر آرام کیا اور پھر سکول کا کام شروع کر دیا۔ پانچ بجے تک یہ کام ختم ہو گیا۔ اب میرا ہاکی کھیلنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے چائے پی اور نماز عصر ادا کرنے کے بعد ہاکی ہاتھ میں پکڑی اور گراؤنڈ میں چلا گیا۔ وہاں مغرب کی نماز تک خوب کھیلا۔ وہیں گراؤنڈ سے ملحقہ مسجد میں نماز مغرب ادا کی اور گھر واپس چلا آیا۔ جب میں گھر پہنچا کھانا تیار ہو چکا تھا۔ میں نے کھانا کھایا۔ اتنے میں ٹی وی پر ہفتہ رفتہ کا وقت ہو گیا میں نے ٹی وی پر ہفتہ رفتہ کا پروگرام دیکھا اور خبریں سنیں۔ اب ساڑھے نو بج چکے تھے۔ اس کے بعد میں مطالعہ کے کمرے میں چلا گیا اور نماز عشاء ادا کر کے کتابیں لے کر پھر بیٹھ گیا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک مطالعہ کیا اور ساتھ ہی اپنے چھوٹے بھائی کو بھی سبق دیا۔ اس کا ترجمہ درست کیا اور سونے کی تیاری شروع کر دی۔

روزنامچہ لکھنا بہت ہی دلچسپ مصروفیت ہے۔ اس سے تمام دن کی مصروفیات کا پتہ چلتا ہے۔ روزنامچہ لکھنے والے کی طبیعت کے رجحان کی بھی عکاسی

کرتا ہے۔ روزنامچہ لکھنے کی عادت آئندہ زندگی کے لئے طبیعت میں پختگی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ زندگی کا بہترین ریکارڈ ہوتا ہے جو ایک کتاب کی شکل میں محفوظ رہتا ہے۔ جب ہمارا جی چاہے اس ریکارڈ کو دیکھ سکتے ہو۔ جتنا ریکارڈ پرانا ہوگا اسی قدر وہ دلچسپ لگے گا۔ روزنامچہ لکھنے کی عادت طلباء کے لئے خاص طور پر بہت ہی مفید ثابت ہوتی ہے۔ ایک تو ان میں پابندی وقت کا احساس ہوتا ہے۔ دوسرے وہ لکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ جس سے ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور انہیں تحریر پر بھی عبور حاصل ہو جاتا ہے۔

www.iqbalcyberlibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006

موسم برسات

جون کے مہینے میں جب گرمی انتہا کو پہنچتی ہے آفتاب کی تمازت سے جسم جلے جاتے ہیں اور گرم لو ہر شے کو جھلسا دیتی ہے۔ گرمی کے سبب کوئی شخص گھر سے باہر نکلنے کی جرات کم ہی کرتا ہے۔ گلی کوچوں میں ہو کا عالم ہوتا ہے۔ ندی نالوں میں پانی بھی کم ہو جاتا ہے۔ دریا خشک ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں رحمت حق تعالیٰ اپنے بندوں اور پرندوں اور چرندوں پر ترس کھا کر ابر رحمت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اچانک ہم دیکھتے ہیں کہ سیاہ گھٹائیں جھومتی ہوئی آ رہی ہیں۔ آفتاب نے اپنا منہ چھپا لیا ہے۔ آفتاب نے اپنا منہ چھپا لیا ہے۔ ہوا میں ٹھنڈک پیدا ہو گئی ہے۔ جان میں جان آنے لگی ہے۔ گھٹائیں دیکھ کر لوگوں کی خوشیوں کی انتہا نہیں رہی۔ ایک دم بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بچے گھروں سے نکل آئے ہیں۔ سکول میں چھٹی کا گھنٹہ بج گیا ہے۔ لڑکے بھی سکول سے باہر نکل کر شور مچا رہے ہیں۔ منٹوں میں جل تھل ہو گیا۔ گلیوں کوچوں میں پانی کھڑا ہو گیا ہے۔ بچے پانی میں دوڑ رہے ہیں۔ ایک دوسرے پر چھینٹے اڑا رہے ہیں۔

چمن زاروں اور باغوں میں بہار آ گئی ہے۔ زردی میں رنگے ہوئے پتے سبز لباس میں ملبوس نظر آنے لگے ہیں۔ تین چار گھنٹے موسلا دھار بارش کے بعد اب بادل چھٹنے شروع ہو گئے ہیں۔ بارش تھمتی جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد بادل اونچے ہو گئے ہیں اور مطلع صاف ہو گیا ہے۔ موسم خوشگوار ہو گیا ہے۔ قوس قزح نے آسمان پر جھولا ڈال دیا ہے۔ فضا دھل کر صاف ہو گئی ہے۔ ہر طرف زندگی خوشگوار

ہوگئی ہے۔چشمے بہنے لگ گئے ہیں۔ پرندے خوشی سے چہچہانے لگے ہیں۔کلیاں ہنسنے لگی ہیں ہوسو سبزہ ہی سبزہ نظر آنے لگا ہے۔

اب دیکھئے بارش تھم چکی ہے۔لوگ گھروں سے نکل پڑے ہیں۔کوئی موسم کا لطف اٹھانے اور کوئی خرید وفروخت کرنے جارہا ہے۔کئی من چلے اکٹھے ہوکر آم خریدنے جارہے ہیں۔آم کل بازار میں کوئی خریدتا نہیں تھا مگر آج ریہڑی اور چھابڑی والے ہاتھ نہیں لگانے دیتے ایک دم دام دگنے ہوگئے ہیں۔کئی ٹولیاں بنا کر سیدھے باغوں میں نکل گئے ہیں باغ بھی خوب نکھرے نکھرے نظر آتے ہیں۔ ہرطرف سبزہ ہی سبزہ نظر آنے لگا ہے۔پرندے خوشیوں کے ترانے الاپ رہے ہیں۔کوئل کا نغمہ جاں فزا دل کو لبھا رہا ہے۔موسم حسین ہوگیا ہے۔گل ہائے چمن عجب بہار دکھا رہے ہیں کچھ لوگ ادھر بیٹھے خوشیاں منا رہے ہیں اور کچھ ادھر، آموں کے شوقین ٹولیوں کی شکل میں ادھر بھی نظر آرہے ہیں اور ادھر بھی، کھا بھی رہے ہیں اور گٹھلیاں ایک دوسرے کے اوپر مار رہے ہیں۔باغوں میں کوئی جھولا جھول رہا ہے۔کوئی خوشی کے گیت گا رہا ہے۔کوئی اپنے اہل خانہ کو نہر کے کنارے لے گیا ہے۔اسی طرح سے دریا کا کنارہ بھی حسین کیفیت پیش کر رہا ہے۔کوئی مشغول ترنم ہے۔کوئی دری بچھائے گھاس پر لیٹا ہوا ہے۔کوئی ریت سے کھیل رہا ہے۔کچھ لوگ اکٹھے ہوکر کشتی رانی کرنے لگ گئے ہیں۔دریا کی ساری کشتیاں پانی میں چل رہی ہیں۔لوگ زیادہ ہیں اور کشتیاں کم ہیں۔آج ملاحوں نے بھی اپنے ریٹ بڑھا رکھے ہیں۔شام ہونے تک یہی منظر چلتا ہے۔

دیہاتوں اور کھیتوں کا منظر نہایت پر کیف ہے۔ وہاں بھی چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آ رہا ہے۔ پیاسی زمین نے اپنی پیاس بجھالی ہے۔ کہیں کہیں نشیب میں پانی بھی کھڑا نظر آ رہا ہے۔ کسان اپنے کھیتوں کو تر و تازہ دیکھ کر بہت خوش ہیں۔ انہیں فصل خریف کے اچھے ہونے کی خوشی ہو رہی ہے۔ دھان کے کھیت پانی سے بھر گئے ہیں۔ زندگی ہر طرف رقص کرتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ اس وقت ٹیوب ویل بھی آرام کر رہے ہیں۔ یہ قدرت کی بے نیازی ہے کہ چند گھنٹوں میں موسم کو کس قدر خوشگوار بنا دیا ہے۔ ندی نالوں کا پر کیف اور مسرور کن شور کیسا بھلا لگتا ہے۔

برکھارت کے یہ حسین نظارے شاعروں کو ان کے گن گانے پر مجبور کر دیتے ہیں بہت سے شعرا نے برسات کے مناظر اپنی شاعری میں پیش کئے ہیں مگر نظیر اکبر آبادی نے جس خوبصورتی سے اپنی نظم ''برسات کی بہاریں'' میں برسات کے مناظر پیش کئے ہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔

گل و خار لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ جہاں برسات کی روح پرور کیفیات ہوتی ہیں وہاں طبیعت مضمحل کرنے کا سامان بھی بنتی ہے۔ اس کے فوائد بھی ہوتے ہیں اور نقصان بھی ہوتا ہے۔ بارش اگر حد اعتدال تک ہو تو سامان خوشگواری پیدا کرتی ہے۔ اگر حد سے زیادہ ہو جائے تو نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ لگاتار زیادہ بارش سے سیلاب آ جاتے ہیں۔ سڑکیں اور ریلوے لائن تباہ ہو جاتی ہیں۔ کمزور اور خستہ عمارتیں گر جاتی ہیں۔ دیہات سے دیہات اجڑ جاتے ہیں۔ مویشی ہلاک ہو

جاتے ہیں۔ جانی نقصان بھی ہوتا ہے۔ لوگ بے گھر ہو کر اونچی جگہوں پر پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کاروبار بہت متاثر ہوتے ہیں۔ ذرائع آمد و رفت بند ہو جاتے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ زیادہ دیر تک زمین میں نمی رہنے سے وبائی امراض پھوٹ پڑتی ہیں اور بہت زیادہ ہلاکت و پریشانی کا باعث بن جاتی ہیں۔ گویا وہی ابر رحمت اگر زیادہ ہو تو زحمت اور ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

موسم بہار

لفظ بہار بذات خود کتنا روح پرور لفظ ہے۔ بہار آتی ہے تو رنگ گلستان بدلنے لگتا ہے۔ پتے زرد لباس اتار کر سبز مخمل کے جوڑے پہن لیتے ہیں۔ ٹنڈ منڈ درخت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ جہاں باغوں میں خاک اڑ رہی تھی اب پر کیف ہلچل مچ رہی ہے۔ مرجھائے ہوئے پودے سرسبز و شاداب نظر آنے لگے ہیں۔ سبز شاخیں خوشی سے جھوم رہی ہیں۔ سبز پتے ہوا کے جھونکوں سے کھیل رہے ہیں۔

ذرا باہر نکل کر بہار کا عالم دیکھیں۔ چڑیاں خوشی کے ترانے گا رہی ہیں۔ بلبل نغمہ سرا ہے۔ پرندے چہچہا رہے ہیں۔ چشموں سے صاف شفاف پانی بہہ رہا ہے۔ مختلف گلوں کی خوش رنگ پتیاں دوش آب پر سوار ہوئی چلی آ رہی ہیں۔ نرم نرم شاخیں لہلہا رہی ہیں۔ باد نسیم کے جھونکے اٹھکیلیاں کھا رہے ہیں۔ کبھی اس گل کو چھیڑتے ہیں کبھی اس گل کو گدگداتے ہیں۔ پھول ہنس ہنس کر جھوم رہے ہیں۔ شاخوں پر کلیاں رقص کر رہی ہیں۔

ہر پرندہ اپنے اپنے گانے الاپ رہا ہے۔ کوئی اپنے خالق کی ثناء خوانی کر رہا ہے۔ کوئی یاودود یاودود کی تسبیح کر رہا ہے۔ کوئی اپنے ہم جنس کو نغمہ سرائی میں شرکت کے لئے بلا رہا ہے کہ آؤ مل کر خوشی کی تانیں بجائیں۔ ہر سمت سے نغمہ ہائے خوش کن ذہن و قلب کو سرور پہنچا رہے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں نیا جوش نیا خون گردش کرنے لگا ہے۔ چہرے ہشاش بشاش نظر آ رہے ہیں۔ درختوں پر بور خوش

ذائقہ پھلوں کی لذتوں کی امید بندھا رہا ہے۔ چمن میں ہر طرف رنگینیاں ہی رنگینیاں بکھری پڑی ہیں۔ خوشبو سے دماغ معطر ہو رہا ہے جس سے دل و دماغ کو تسکین مل رہی ہے۔ طبیعت بشاش ہوتی جا رہی ہے۔ زمانے کے غم ذہن سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ سبزہ زار آنکھوں کو تازگی بخش رہے ہیں۔ پر کیف مناظر دل کو لبھا رہے ہیں۔ حسن و جمال کی رعنائیاں فرصت بخش رہی ہیں۔ ذرے ذرے میں نئی روح پھونکی جا رہی ہے۔ ہر شے مسحور نظر آ رہی ہے۔ درختوں پر وجد طاری ہے۔

کیسا عالم ہے نئے نئے شگوفے نکل رہے ہیں۔ کلیاں چٹک رہی ہیں۔ پھول ہنس رہے ہیں۔ یہ شگوفے یہ پھول شبنم کی مے شبانہ سے بدمست ہوئے جا رہے ہیں۔ موسم بہار زمین سے حسن و خوشی کے خزانے اگل رہا ہے۔ باد نسیم گلوں کی خوشبو سے ہر دماغ کو معطر کر رہی ہے اور بھینی بھینی خوشبو قلب و نظر کی تسکین کا سامان پیدا کر رہی ہے۔ بہار کی رنگینیاں دل و دماغ کو دولت اور سکون کی نعمت عطا کر رہی ہیں۔ اس سے طبیعت کا جمود اور اس کی مایوسی دور ہو جاتی ہے۔

موسم بہار میں جب انسان کلیوں کی چٹک، گلوں کے تبسم اور نسیم صبح کی اٹھکیلیوں کا سماں دیکھتا ہے تو حیران ہو جاتا ہے کہ چند ماہ پہلے کیا تھا اور اب کیا ہو گیا ہے۔ وہ اس کی قدرت کا قائل ہوتا ہے۔ وہی زرد پتے سبز ہو گئے ہیں۔ وہی پتوں کے بغیر درخت سبز پتوں سے لدے پڑے ہیں۔ نہ یہ بلبلوں کی نغمہ سرائی تھی نہ گلوں کی رعنائی تھی۔ تو یہ کیسے ہو گیا۔ یہ اس ذات باری تعالیٰ کا کرشمہ ہے۔ جو ہر

چیز پر قادر ہے اور جو جی چاہے کر سکتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ہم کیسے زندہ ہوں گے ان کے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے۔۔ یہ اس خداوند باکمال کے کمالات ہیں اور اس کے جمال کا ظہور ہیں۔ اگر وہ اب بھی یہ نہ سمجھیں تو ان کی کم فہمی ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

چاندنی رات

چاندنی رات تیرا کیا کہنا
تو نے پہنا ہے نور کا گہنا

اللہ تعالی نے انسان کو اس قدر نعمتیں عطا کی ہیں کہ انہیں شمار بھی نہیں کیا جا سکتا چہ جائیکہ انسان ان سب کا شکر ادا کر سکیں۔ اس کی دی ہوئی نعمتوں میں چاندنی رات کا بھی شمار ہوتا ہے۔ چاندنی قدرت کا ایک حسین جمیل تحفہ ہے جو دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک دیتا ہے۔ یہ انمول بیش بہا اور عجیب وغریب نعمت ہے۔ ہر شخص چاندنی رات سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ چاندنی رات کی لطافتوں اور کیفیتوں کو احاطہ تحریر میں لانا بہت ہی مشکل ہے کیونکہ جس قدر اس کا لطف محسوس ہوتا ہے وہ کچھ اور ہی شے ہے۔ اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں ادراک وخرد اس کی خنکی کے راز سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جب انسان تاریک اور بے کیف راتوں سے بے زار ہو جاتا ہے تو چاندنی رات کی حسرت دل میں لئے ہوئے اس کا انتظار کرتا ہے۔

چاند کا لفظ بذات خود اپنے اندر حسن و جمال کی رعنائیاں دلفریبی اور دلکشی کے اتھاہ سمندر پنہاں رکھتا ہے۔ چاند کا لفظ لخت جگر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور محبوب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس میں بڑی خوبصورتی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاند کا لفظ خوبصورت سے خوبصورت چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

چاندنی رات میں باغ کی سیر بہت ہی لطف دیتی ہے۔گلوں کا رنگ کلیوں کا حسن کس قدر نکھرا ہوا معلوم دیتا ہے۔سبزہ دل فریب ہو جاتا ہے۔ہرے بھرے کھیت پر کیف نظارہ پیش کرتے ہیں۔جب درختوں کے سبز پتوں میں سے روپہلی چاندنی چھن چھن کر آتی ہے تو زمین پر کتنی پیاری گلکاری کرتی ہے۔موسموں میں خوشنما موسم بہار اور راتوں میں چاندنی رات خوبصورتی کا بہترین نمونہ ہیں۔برکھا کے بعد فضا دھلی ہوئی ہوتی ہے۔ایسے میں چاندنی اور بھی دل کو لبھاتی ہے۔ پرسکون تالاب اپنے دامن میں عکس ماہتاب لئے پیار کرتا ہوا کتنا مطمئن و پرسکون دکھائی دیتا ہے۔

چودھویں رات کی چاندنی پورے جوبن پر ہوتی ہے۔ہر سو نقرئی چادر سی بچھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ہر چیز دودھ سے دھلی ہوئی کتنی پیاری لگتی ہے۔کسی باکمال صناع کی صنعت کا پتہ دیتی ہے۔چاروں طرف نور ہی نور دکھائی دیتا ہے۔میدان ہوں یا صحرا سب پر چاندی کا پانی بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔دریا کا کنارہ ایسے میں قدرت کی دلنشینی کا نظارہ پیش کرتا ہے۔جھونپڑیاں بھی اتنی سفید دکھائی دیتی ہیں جیسے سنگ مرمر کے محلات۔ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے تمام کا تمام عالم دریائے نور میں غوطہ زن ہے۔یوں دکھائی دیتا ہے کہ آسمان سے نور کا سیلاب جاری ہے۔ پرلطف چاندی کا اتھاہ سمندر موجیں مار رہا ہے۔

اک زمانہ تھا جب لوگ چاند کی پرستش کیا کرتے تھے۔اس کی یہی وجہ تھی کہ چاند خوبصورت ترین سیارہ نظر آتا ہے اور دل و دماغ کو سکون اور قلب و جگر کو

ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ دلفریبی اور کشش اس قدر ہے کہ معصوم بچہ بھی اس کی طرف خواہ مخواہ متوجہ ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اسے بھی چاند سے سکون ملتا ہے۔ اس کی آنکھوں کو پیارا لگتا ہے۔ گھنٹوں ہاتھوں کے اشاروں سے چاند کو بلاتا رہتا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ اس کی روشنی سے نظر کو تازگی اور دل کو سکون ملتا ہے۔ چاند کی پر کیف روشنی کے حق میں ایک معصوم بچے سے زیادہ وزنی اور قابل اعتماد شہادت اور کس کی ہو سکتی ہے۔

چاندنی رات میں شعراء اور ادباء بھی مچل جاتے ہیں۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور رنگین شعر کہنے لگ جاتے ہیں۔ چاندنی رات کے منظر کو ایک شاعر نے اس طرح پیش کیا ہے۔

تجلی کثافت کو دھونے لگی
مکانوں پر قلعی سی ہونے لگی
بنے آئینہ سارے دیوار و در
سفیدی پھری ہر در و بام پر

شاعر کی طبیعت میں خود بخود جولانی آ جاتی ہے اور اس پر خوبصورت اشعار کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔ شب ماہتاب میں عشاق کے جذبات بھی قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ چاند کو دیکھنے سے وہ سمجھتے ہیں کہ ملاقات ہو رہی ہے۔ دو دوست چاند کو اس لئے دیکھتے ہیں کہ میرا دوست بھی اسی چاند سے آنکھیں لگائے ہوئے ہے۔ بہت سی یادوں کی وابستگی اسی چاند سے ہے۔ محبوب کو چاند سے شبیہ دی جا

رہی ہے۔

تم چاندنی ہو، پھول ہو، نغمہ ہو، شعر ہو
اللہ دے! حسن ذوق میرے انتخاب کو

چاندنی رات بچوں، جوانوں، بوڑھوں، مردوں، عورتوں سب کے لئے مسرت وشادمانی کا پیغام لے کر آتی ہے۔ روح کو غذا، دماغ کو سکون نظر کو ٹھنڈک اور گلوں کو حسن بخشتی ہے۔

All rights reserved. ©2002-2006

صبح کی سیر

صبح کی سیر تفریح بھی ہے اور ہلکی ورزش بھی۔ اس سے انسان سارا دن چاق و چوبند رہتا ہے۔ طبی اعتبار سے بھی یہ صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ سیر کرنے سے انسان کو بہت سی بیماریوں سے خود بخود نجات مل جاتی ہے۔ جو لوگ صبح سویرے اٹھنے کے عادی ہوتے ہیں وہ اٹھتے ہی کھلی ہوا میں نکل جاتے ہیں۔ وہ تازہ ہوا کے جھونکوں کا لطف بھی اٹھاتے ہیں اور اپنے پھیپھڑوں کو صحت مند رکھنے کے لئے آکسیجن بھی حاصل کرتے ہیں۔ ان کے جسمانی اور دماغی پٹھے مضبوط رہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اگر یہ کہا جائے کہ صبح کی سیر صحت کی ضمانت ہے تو صحیح ہوگا۔

صبح کی سیر اکیلے بھی کی جا سکتی ہے لیکن اگر ایک ساتھی ہمراہ ہو تو سیر کرتے ہوئے زیادہ لطف رہتا ہے۔ اسی لئے میں اور میرا ایک دوست حمید دونوں اکٹھے ہی سیر کو نکلتے ہیں۔ ہم دونوں سحر خیز ہیں۔ رات کو چاہے کتنی دیر سے سوئیں صبح اذان سے پہلے ہی بیدار ہو جاتے ہیں۔ ہم دونوں ہی نماز کے عادی ہیں۔ صبح کی نماز مسجد میں پڑھ کر وہیں سے اکٹھے سیر کو چلے جاتے ہیں۔ اکٹھے سیر بھی ہوتی رہتی ہے اور مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات بھی ہوتا رہتا ہے۔

ہمارے ساتھ ساتھ اکثر کسان بھی کسب معاش کے لئے زمین کا سینہ چیرنے نکل پڑتے ہیں۔ مرغان چمن بھی اپنے خالق کی حمد و ثناء کے ترانے الاپنے لگ جاتے ہیں۔ ہمارے راستے میں ایک باغ پڑتا ہے۔ باغ کا نظارہ صبح کو دیدکے

قابل ہوتا ہے۔ پھولوں اور پتوں پر شبنم کے موتی چمک رہے ہوتے ہیں اور خوب بہار دکھاتے ہیں بادنسیم کے جھونکے ٹہنیوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ گلہائے چمن ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے ہوتے ہیں۔ کلیاں چٹک رہی ہوتی ہیں۔ پرندے چہچہا رہے ہوتے ہیں۔ کیا سہانا سماں ہوتا ہے۔ ہرطرف تروتازگی اور خوشبو پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس طرح کے مناظر ہوں تو سیر کرنے والوں کی صحت کیوں بہتر نہ رہے اور دن بھر ان کی طبیعت شگفتہ نہ رہے۔ اسی لئے تو صبح کی سیر پر اتنا زور دیا جاتا ہے اور ڈاکٹر اور حکیم بھی بار بار سیر کی تلقین کرتے ہیں۔

صبح ہوتے ہی پرندے روزی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ چڑیاں پھدک پھدک کر ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر چھلانگیں لگاتی بہت پیاری لگتی ہیں۔ ان کی چوں چوں کی آواز کانوں کو لبھاتی ہے۔ بلبل بھی نغمہ سرا ہوتی ہے۔ آسمان پر کوے مشرق سے مغرب کی طرف غولوں کے غول اس طرح جا رہے ہوتے ہیں جس طرح ایک مل کے مزدور ایک ہی سمت میں مقررہ وقت پر جوق در جوق ڈیوٹی پر چلے جا رہے ہوں۔

چلتے چلتے نہر آ جاتی ہے۔ پھر ہم نہر کے کنارے ہو لیتے ہیں۔ نہر کا نظارہ عجیب ہی کیفیت پیش کرتا ہے۔ نہر کے کنارے سرکنڈوں کی دیواریں چاندی کی طرح چمک رہی ہوتی ہیں۔ جس موسم میں ان کے اوپر پھول کھلے ہوئے ہوں تو وہ نرم نازک چمکدار نقرئی بہت ہی پیارے لگتے ہیں۔ نہر کے کنارے درخت اور دوسرے پودے دوسری جگہوں کی نسبت زیادہ ہی تروتازہ اور سبز ہوتے ہیں۔ نہر

کے کنارے ہونے کی وجہ سے ان کو نمی کی کمی نہیں رہتی ۔نہر کے کنارے پر سڑک تو کچی ہوتی ہے مگر صاف ستھری اور ہموار ہوتی ہے جس پر چل کر بہت مزہ آتا ہے۔ اس سے زیادہ نہر کے کنارے اگی ہوئی گھاس پر چل کر دل و دماغ کو تازگی اور ٹھنڈک ملتی ہے ۔نہر کے پانی سے دھلی ہوئی صاف شفاف ہوا جب اندر داخل ہوتی ہے تو آنکھیں کھلتی چلی جاتی ہیں ۔

جلد ہی سورج کی کرنیں بھی نکلنا شروع ہو جاتی ہیں ۔اس وقت کوئی گوڈی کر رہا ہوتا ہے۔کوئی سہاگہ پھیر رہا ہوتا ہے۔کبھی کوئی دھان کی پنیری پانی میں کھڑا لگا رہا ہوتا ہے ۔کوئی بو رہا ہوتا ہے ۔کوئی کاٹ رہا ہوتا ہے ۔کارخانہ قدرت میں ہر آدمی اپنے اپنے کام پر لگ جاتا ہے ۔کسان اپنی جہد پیہم سے یہ ثابت کر رہا ہے کہ دنیا میں عمل مسلسل ہی انسان کو کامیاب و کامران کر سکتا ہے ۔اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ۔محض خیال آرائی اور تقدیر کی جھوٹی امید پر بیٹھ رہنے سے کبھی کوئی ترقی نہیں کر سکتا ۔جس قدر کوئی کوشش کرتا ہے اسی قدر اسے ملتا ہے ۔ارشاد الٰہی بھی یہی ہے ''انسان کے لئے کچھ نہیں ہے سوائے اس کے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے''۔کسان اگر گندم بوتا ہے تو گندم ہی کاٹتا ہے اگر جو بوتا ہے تو جو ہی کاٹتا ہے اور اگر کچھ نہیں بوتا تو کچھ نہیں کاٹ سکتا ۔لہٰذا کسان کی زندگی ہمارے لئے لمحہ فکریہ پیش کرتی ہے ۔

صبح کی سیر سے انسان کو ایک خاص قسم کا لطف و سرور ملتا ہے ۔کاہلی اور سستی سارا دن پاس نہیں پھٹکتی ۔سبز مخملی کھیتوں کو دیکھنے سے آنکھوں کو تازگی اور ٹھنڈک

ملتی ہے۔ دماغی تھکان دور ہو جاتی ہے۔ سحر خیزی بہت ہی اچھی عادت ہے۔ دیر سے اٹھنے کے عادی لوگ اپنی صحت خراب کر کے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تکلیف بھی اٹھاتے ہیں اور خون پسینے کی کمائی ہوئی کثیر رقم ڈاکٹروں کی نذر کرتے ہیں اور کاروبار کے فرائض صحیح طور پر سرانجام نہیں دے سکتے۔

اسی طرح سیر کرنے کا ہمارا روزانہ کا معمول ہے۔ ہم روزانہ کم از کم چار میل کی سیر کرتے ہیں۔ کسی دن اس سے زیادہ بھی ہو جاتی ہے مگر کم نہیں ہوتی۔ ہماری طبیعت سارا دن ہشاش بشاش رہتی ہے اور ہم سارا دن پوری مستعدی سے کام کرتے ہیں۔ ماشاءاللہ ہماری صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔

ایک سیر

تعطیلات موسم گرما کے شروع ہوتے ہی ہم نے سیر کا پروگرام بنالیا تھا لیکن ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ کہاں چلنا ہے۔ گرمی بہت تھی۔ تمام دوستوں نے فیصلہ کیا کہ اس دفعہ کوہ مری کی سیر کریں گے۔ لہٰذا ہم نے یکم جولائی کو کوہ مری جانے کا پروگرام بنالیا۔ طے یہ پایا کہ سب دوست یکم کی صبح کو ہمارے گھر سے روانہ ہوں گے۔ حسب پروگرام سعید، نعیم اور شمیم تینوں سات بجے صبح ہمارے گھر پہنچ گئے۔ ان سب نے ناشتہ بھی ہمارے گھر ہی کیا۔ ہم چاروں نے ایک ٹیکسی لی اور اس پر بستر اور سامان رکھا اور جی ٹی ایس کے سٹینڈ پر پہنچ گئے۔ میں اور سعید سامان اتروانے لگے اور نعیم اور شمیم ٹکٹیں خریدنے چلے گئے۔ ہم راولپنڈی کی بس میں سوار ہو گئے۔ بس میں ہمیں مناسب جگہ پر سیٹیں مل گئیں۔ ہمیں بیٹھے ہوئے ابھی پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ بس روانہ ہوگئی۔ بس آہستہ آہستہ چلنا شروع ہو گئی۔ اندرون شہر ٹریفک کی وجہ سے کہیں کہیں بس کو رکنا پڑتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم دریائے راوی کے پل پر پہنچ گئے۔ دریا میں بارشوں کا پانی خوب چل رہا تھا۔ موسم بھی صبح کی وجہ سے اتنا گرم نہیں تھا۔ دریا کے قرب و جوار کی ہوا ٹھنڈی ہی تھی۔ ڈرائیور نے پل سے گزرتے ہوئے ٹول ٹیکس ادا کیا۔ ٹول ٹیکس ادا کرنے کا انداز بھی بڑا عجیب ہوتا ہے جس کا نظارہ سواریوں کو مزا دیتا ہے۔ ڈرائیور ایک ہاتھ سے ایک لمحے میں پیسے پکڑاتا ہے اور رسید بھی وصول کرتا ہے اور گاڑی رکنے بھی نہیں دیتا۔ سو ڈرائیور نے اس دلچسپ انداز سے ٹول ٹیکس ادا کیا۔ اب ہم شاہدرہ سے

گزر کر لاہور کی حدود سے نکل گئے تھے۔ یہاں سے دو رویہ سڑکیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ہماری بس سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

لاہور سے گوجرانوالہ تک سڑک دوہری ہے۔ اس لئے یہاں تک حادثات کا امکان کم ہو گیا ہے۔ اس حصے میں لوگ ایک دوسرے سے گاڑی آگے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری بس کو بھی ایک پرائیویٹ بس نے اوورٹیک کیا۔ مگر تھوڑی دور جا کر ہماری بس نے اسے پیچھے چھوڑ دیا۔ جب ہماری بس دوسرے بس کو پاس کر رہی تھی تو سب مسکرا رہے تھے کہ ہماری بس آگے نکل رہی ہے۔ اس طرح اور بہت سی بسوں اور ویگنوں میں بھی مقابلہ ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا ڈرائیور تقریباً ایک ہی رفتار سے چلتا رہا۔ کوئی آگے نکل جائے یا پیچھے رہ جائے اسے کوئی غرض نہیں تھی۔ گیارہ بجے کے قریب ہم جہلم پہنچ گئے۔ جہلم کے بس سٹینڈ میں بس داخل ہوئی تو کنڈکٹر نے اعلان کیا کہ کسی نے چائے وغیرہ پینا ہو تو پی لیں یہاں بس پندرہ بیس منٹ ٹھہرے گی۔

ہم بس سے باہر نکلے اور کینٹین میں پہنچے۔ چائے کا آرڈر دیا۔ چائے پی کر بس کے پاس جا کھڑے ہوئے اسی اثناء میں ڈرائیور آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سب سواریاں بس میں سوار ہوئیں تو عازم پنڈی ہوئے۔ وہاں سے دس میل کے فاصلے پر دینہ آ گیا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے منگلا ڈیم اور میر پور کو راستہ نکلتا ہے۔ ہماری بس یہاں کھڑے ہوئے بغیر آگے نکل گئی۔ سوا بارہ کے قریب ہم گوجر خاں پہنچ گئے۔ بس ایک منٹ کے لئے کھڑی ہوئی دو سواریاں اتریں اور دو سوار ہو

گئیں۔ٹھیک ایک بجے ہم پنڈی صدر پہنچ گئے تھے۔یہیں سے ہمیں مری کے لئے بس مل گئی جس نے ایک بج کر چالیس منٹ پر روانہ ہونا تھا۔ہم نے سامان قلی کے سپرد کیا اور خود سامنے والے ہوٹل میں کھانا کھانے چلے گئے۔وہاں ہم نے کھانا کھایا اور ڈیڑھ بجے کے قریب بس میں آ کر بیٹھ گئے۔بس اپنے وقت مقررہ پر چل پڑی۔بس مری روڈ پر چل رہی تھی۔یہ علاقہ راولپنڈی کا کاروباری مرکز بھی ہے۔رونق بھی بہت زیادہ ہے۔اسی پر سینما وغیرہ ہیں۔ہوٹل بھی ہیں۔اسی پر جنرل ہسپتال بھی ہے۔آگے چل کر فیض آباد کا علاقہ آ جاتا ہے۔اس کے بائیں طرف اسلام آباد رہ جاتا ہے اور سیدھی سڑک مری چلی جاتی ہے۔یہاں سے مری تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم چھرہ پانی پہنچ گئے۔یہ جگہ پنڈی اور مری کے درمیان واقع ہے۔یہاں پر بس کھڑی ہوتی ہے۔جو بس مری جانے والی ہوتی ہے وہ چڑھائی کی وجہ سے گرم ہو جاتی ہے۔لہٰذا اس کا انجن ٹھنڈا کرنے کے لئے یا انجن میں پانی ڈالنے کے لئے آدھ پون گھنٹہ یہاں ٹھہرنا پڑتا ہے اور جو بسیں یا کاریں مری سے پنڈی کی طرف آتی ہیں ان کو بھی بریک کا زیادہ استعمال کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے بریکیں گرم ہو جاتی ہیں انہیں بھی ٹھنڈا کرنے کے لئے یہاں قیام کرنا لازمی ہوتا ہے۔یہاں سے ٹھنڈ بھی شروع ہو جاتی ہے اور یہیں سے زیادہ تر پہاڑوں کی پیچ دار سڑکیں بھی شروع ہو جاتی ہیں۔پہاڑوں کے گرد سڑکیں چکر کھاتی ہوئی اوپر چڑھتی ہیں جو بہت پر کیف نظارہ پیش کرتی ہیں۔اوپر پہاڑ ہوتا

ہے۔ نیچے نظر ڈالیں تو سڑک نظر آتی ہے جس سے گزر کر ہم اوپر آتے ہیں۔ ایک طرف اونچے پہاڑ ہیں دوسری طرف گہرے کھڈ۔ سڑک کے کنارے سفیدے کے درخت اور سبزہ کیا لطف دیتا ہے۔ چار بجے کے قریب ہم مری پہنچ گئے۔ مری پہنچ کر ہم نے ایک کمرہ کرایہ پر لیا اور آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ اب ہم بالکل ٹھنڈی جگہ پر تھے اور موسم بھی نہایت خوشگوار تھا۔ یہ طے پایا کہ سیر کا آغاز کل صبح سے کریں گے۔ دوسرے روز ہم سیر کے لئے نکلے۔ سب سے پہلے ہم مال روڈ پر گئے۔ یہاں ہر قسم کی دکانیں ہیں۔ یہ سڑک ڈھلوانی ہے۔ ڈاک خانے کی طرف سے سڑک اونچی ہے۔ اس طرف جانے کے لئے ذرا زور لگانا پڑتا ہے۔ لیکن واپسی پر انسان خود بخود ہی چلا آتا ہے۔ اس سڑک پر بہت ہی رونق ہوتی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں سے لوگ آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ تقریباً سب لوگ کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مال روڈ کے علاوہ اور بھی بہت سی سڑکیں ہیں جو سرسبز درختوں اور پودوں اور گھاس سے لدی پڑی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادل آ جاتے ہیں۔ یہ بادل دھوئیں کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ بارش برسنے لگ جاتی ہے۔ اتنی جلدی جلدی موسم میں فرق محسوس ہوتا ہے کہ بڑا مزا آتا ہے۔ عجیب لطف آتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی بارش ہو رہی تھی ابھی مطلع صاف ہو گیا۔ دھوپ بھی نکل آئی ہے نہ کہیں پانی ہے نہ کیچڑ ہے۔ سڑکیں بالکل صاف ہیں۔ گویا کبھی بارش ہوئی ہی نہیں تھی۔ پانی فوراً کھڈوں میں اتر جاتا ہے۔ پنڈی پوائنٹ اور کشمیر پوائنٹ تفریح کے لئے بہت ہی اچھی جگہیں ہیں۔ پنڈی

پوائنٹ سے پنڈی کی طرف نظارے دکھائی دیتے ہیں۔اور کشمیر پوائنٹ سے کشمیر کی طرف سے پہاڑ اور دوسرے مناظر بہت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ہم نے مری میں تین دن قیام کیا اور خوب گھوم پھر کر تمام جگہیں دیکھیں جی بھر کے سیر کرنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ایک یادگار سفر

یوں تو مجھے سفر کرنے کا کئی بار اتفاق ہوا ہے مگر ایک سفر جو ہم نے پچھلی چھٹیوں میں کیا خاصا دلچسپ تھا اور ہمیں اب تک یاد ہے۔ ہوا یوں کہ چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے ہی صلاح مشورے ہونے لگے۔ کوئی کچھ تجویز پیش کر رہا تھا، کوئی کچھ۔ ابو نے تجویز پیش کی کہ اگر تم لوگ ماہ اگست میں کوہ مری چلو تو چودہ اگست بھی دیکھیں گے اور صحت افزا مقام کی سیر بھی کریں گے۔ چودہ اگست کو مری میں بہت ہی رونق ہوتی ہے کیونکہ وہاں پر ملک کے ہر حصے سے لوگ آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ برسات کے جبس کے دن بھی وہیں گزار لیں گے۔ ہم سب نے ابو کی تجویز سے اتفاق کیا اور چھٹیاں ہوتے ہی اپنا اپنا سکول کا کام کرنا شروع کر دیا تاکہ مری جانے سے پہلے اس ذمہ داری سے فارغ ہو جائیں۔ ذہن سے یہ بوجھ اترا ہوا ہوگا۔ بے فکر ہو کر سیر کریں گے۔

سفر کا آغاز کرنے کے لئے یکم اگست کی تاریخ مقرر ہوئی۔ خیر یکم اگست بھی آ گیا ہم اس دن بہت ہی خوش تھے کیونکہ ہم سب گھر والے مل کر جا رہے تھے۔ مری دیکھنے کا یہ ہمارا پہلا موقعہ تھا۔ اس لئے یہ سفر ہمارے لئے بالکل ہی نیا تھا۔ کوہ مری کا تصور ہی ہمارے لئے خوشی کا باعث بن رہا تھا۔ اس دن ہم معمول سے بھی جلدی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم نے بستر وغیرہ ایک دن پہلے ہی باندھ کر رکھے ہوئے تھے ناشتہ کرتے ہی چل پڑے۔ ابو نے گیراج سے کار نکالی بستر وغیرہ اور دو اٹیچی اس کی چھت پر باندھ لئے۔ باقی سامان ڈگی میں رکھا اور روانہ ہو گئے۔

آج ہم اس قدر خوش تھے کہ کبھی کہیں جاتے ہوئے اتنے خوش نہیں ہوتے تھے۔ گاڑی ملتان روڈ پر چل رہی تھی۔ چوبرجی سے گزر کر ہم راوی روڈ پہنچے اور وہاں سے گزرتے ہوئے دریائے راوی کے پل پر منٹوں میں پہنچ گئے۔ راوی دریا پر بہت سے لوگ سیر کرنے آئے ہوئے تھے۔ کوئی اپنے دوستوں کے ساتھ کوئی اپنی فیملی کے ساتھ۔ کوئی بوٹنگ کر رہے تھے کوئی ساتھ والے پارک میں گھاس پر بیٹھے تھے۔ کوئی آم چوس رہے تھے گویا یہاں پر بھی اچھی خاصی رونق تھی۔ لوگ اپنے غم غلط کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ پل پر ابو نے دس روپیہ ٹول ٹیکس کے دیئے اور آگے نکل گئے۔ اب ہم جی ٹی روڈ پر پہنچ چکے تھے۔ شاہدرہ سے گزر کر لاہور کی حدود بھی پار کر گئے تھے۔ سڑک دو رویہ تھی۔ ہم اپنی سائیڈ والی سڑک پر جا رہے تھے۔ سامنے سے لاہور کی طرف جانے والی لاریاں بس ویگنیں ٹرک اور کاریں برابر والی سڑک پر دوڑتی آ رہی تھیں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ کاروں، بسوں، ویگنوں وغیرہ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ اتنی ہی لاہور سے باہر نکل رہی تھیں اور اتنی ہی اندر آ رہی تھیں۔ سڑک پر اب ہماری کار فراٹے بھرتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ اس سڑک پر اتنا ٹریفک ہوتا ہے کہ آگے دیکھو تو دور دور تک ٹرک ویگنیں بسیں کاریں نظر آ رہی ہیں۔ پیچھے دیکھو تو یہی حالت ہے۔ کوئی تیز رفتاری سے آگے نکل رہا ہے۔ کوئی بڑے آرام سے چل رہا ہے۔ ہمارے ابو شروع ہی سے اعتدال پسند ہیں۔ وہ ہمیشہ پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زیادہ تجاوز نہیں کرتے، کوئی آگے نکل جائے یا پیچھے رہ جائے وہ اپنی سپیڈ پر ہی چلتے ہیں۔ ابھی ایک گھنٹہ ہی ہوا

ہو گا کہ گوجرانوالہ کا صنعتی شہر آ گیا۔ اس کے ریلوے اسٹیشن سے گزرتے ہوئے آگے نکل رہے تھے۔ اس کے اوپر پل بھی بہت ہی بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ چند منٹوں میں یہاں سے بھی گزر کر گوجرانوالہ کی حدود پار کر گئے۔ ابھی مشکل سے آدھ گھنٹہ ہی ہوا ہو گا کہ وزیر آباد کا ریلوے پل آ گیا۔ وہاں سے دو تین میل کے فاصلے پر دریائے چناب کا پل آ گیا۔ وہاں پر بھی دریائے راوی کے پل کی طرح ٹول ٹیکس ادا کر کے آگے نکل گئے۔ اب ہم ضلع گجرات کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ وہاں سے گجرات شہر بمشکل چھ سات میل ہو گا۔ ابھی کوئی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہم گجرات سے گزر رہے تھے اسی طرح گیارہ بجے کے قریب ہم جہلم پہنچ گئے تھے۔ یہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرے اور ایک ریسٹورنٹ میں چلے گئے وہاں ہم نے کوک پی۔ ابو اور امی نے چائے پی۔ اسی طرح وہاں سے بھی خوشی خوشی آگے چل دیئے۔ کوئی ساڑھے بارہ کا ٹائم ہو گا کہ ہم راولپنڈی پہنچ گئے۔ راولپنڈی اور اسلام آباد آج کل ایک ہی شہر بن گیا ہے۔ مری کو جانے کے لئے تو شارٹ کٹ ہے جو اسلام آباد کے باہر باہر سے ہی سیدھا مری کو جاتا ہے لیکن ہمارے اصرار پر کہ آئے ہیں تو پنڈی کا نظارہ بھی کرتے ہیں براستہ مری روڈ گئے۔ مری روڈ بہت ہی خوبصورت روڈ ہے جو پنڈی کا سب سے زیادہ خوبصورت علاقہ ہے۔ یہاں پر سینما گھر، بڑی بڑی عمارتیں، ڈیپارٹمنٹل سٹورز، صرافہ مارکیٹ، جدید سامان آرائش و آسائش کی خوبصورت دکانیں ہیں۔ اسی روڈ پر ہسپتال بھی ہے جو راولپنڈی کا بڑا ہسپتال کہلاتا ہے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا بھی

مری روڈ پر ہی کھایا۔

جب ہم پنڈی سے روانہ ہوئے تو ڈیڑھ بج چکا تھا۔ پنڈی سے باہر نکلے تو ہمارے بائیں طرف اسلام آباد نظر آ رہا تھا۔ سرسبز و شاداب درختوں پودوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم یہ علاقہ بھی نکل گئے۔ اب تھوڑی دور گئے تھے کہ چڑھائی شروع ہوگئی۔ یہاں پر کہیں کہیں کار کو خاصا زور لگانا پڑتا ہے۔ تقریباً پنڈی اور مری کے درمیان میں ایک جگہ آتی ہے جس کو چھرہ پانی کہتے ہیں۔ یہاں سے موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہاں کا پانی بھی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یہاں پر اکثر بسوں اور کاروں کو ٹھہرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کے انجن گرم ہو جاتے ہیں اور ان کو آرام کرانا اور ٹھنڈا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں پر چند ایک چھوٹی دوکانیں بھی ہیں۔ یہاں پر لوگ چائے وغیرہ بھی پینے کے لئے ٹھہر جاتے ہیں۔ ٹھنڈے پانی کے چشمے بھی یہیں سے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تقریباً آدھ گھنٹہ قیام کیا جاتا ہے۔ اس علاقے کے لوگ بہت زیادہ غریب ہوتے ہیں۔ جب کوئی بس یا کار آتی ہے تو بھاگ کر اس میں پانی ڈالنا شروع کر دیتے ہیں بس کو دھونا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح سے کاروں والوں کی بھی خدمت کرتے ہیں۔ مری سے پنڈی آنے والی بسیں کاریں بھی گرم ہو جاتی ہیں کیونکہ اترائی میں بریک کا استعمال زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ بریکیں بہت گرم ہو جاتی ہیں۔ ان کو بھی ٹھنڈا کرنے کے لئے یہاں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ جب کوئی کار یا بس آ کر ٹھہرتی ہے تو وہ اس کے پہیوں پر پانی ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ اس قدر گرم ہوئے ہوتے ہیں کہ ان میں سے

بھاپ نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ کافی پانی ڈالنے کے بعد پہیے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

جب ہم وہاں سے چلے تو پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ پیچ دار سڑکیں ایک عجیب نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ پہاڑ کے اوپر چڑھنے کے لئے سڑکیں بنائی ہوئی ہیں۔ ایک طرف بلند و بالا پہاڑ اور دوسری طرف گہرے کھڈ۔ جوں جوں پہاڑ کے اوپر چڑھتے اوپر سے نیچے والی سڑک بھی نظر آتی تھی۔ دور دور تک کی نیچے والی سڑکیں اسی طرح سے نظر آتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبزہ زار میں لکیریں سی لگائی ہوئی ہوں اردگرد سفیدے کے درخت، کہیں چیل کے درختوں کے جنگل نظر آ رہے ہیں جو بالکل تیر کی طرح سیدھے آسمان کی طرف سر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح پیچ دار راستوں سے گزرتے ہوئے ہم مری پہنچ گئے۔

چودہ اگست چونکہ نزدیک آ رہا تھا مری کی رونق روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ چودہ اگست کو اتنا رش ہو گیا کہ مال روڈ پر چلنا مشکل نظر آتا تھا۔ لوگ خوش خوش ادھر ادھر سیر کرتے پھر رہے تھے۔ لڑکوں کی ٹولیاں سیر و تفریح کرتی نظر آتی تھیں۔ کبھی بادل آ جاتے تو یوں معلوم ہوتا کہ دھواں سا سر پر منڈلانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش ہونے لگتی اور تھوڑی دیر بعد مطلع بالکل صاف جیسے بارش ہوئی ہی نہیں۔ اس طرح سے ہم وہاں ایک تک رہے۔ ہم سارا سارا دن قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہ سفر اس قدر دلچسپ تھا کہ اس کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے آج بھی اسی طرح پھر رہے ہیں۔

ریل کا سفر

ویسے تو سفر کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں لیکن ریل کو ہمارے بزرگ شاہی سواری کہتے ہیں۔ ایک دن میں نے اپنے ابو سے دریافت کیا کہ ابو یہ جو آپ لوگ ریل کو شاہی سواری کہتے ہیں کیا اس میں بادشاہ سواری کیا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا ''بیٹے نہیں بادشاہ تو اس میں سواری نہیں کرتے۔ عام لوگ ہی کرتے ہیں۔'' میں نے کہا کہ سواری عام لوگ کریں تو اس کا نام شاہی سواری کیوں رکھا گیا۔ کہنے لگے ''بیٹے تم سمجھے نہیں بات اصل میں یہ ہے کہ جب متحدہ ہندوستان تھا تو پاکستان کے قیام سے تقریباً سو سال پہلے ہمارے ملک میں انگریزوں نے ریل چلائی تھی اس وقت سے لے کر اب تک سوائے ہوائی جہاز کے ریل کا سفر لاری بس اور ویگن تمام ذرائع آمدورفت میں سے سب سے زیادہ آرام دہ ہے۔ اس میں بہت سی سہولتیں ہیں جو دوسری سواریوں میں نہیں ملتیں۔ مثلاً پانی مل جاتا ہے۔ کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ پھل اور بہت سی دیگر کھانے پینے کی اشیا مل جاتی ہیں۔ پنکھے بھی لگے ہوتے ہیں جو اور سواریوں میں نہیں ہوتے۔ پیشاب کرنے اور رفع حاجت کے لئے بھی انتظام ہوتا ہے اس لئے اسے شاہی سواری کہتے ہیں۔ مرد عورتیں بچے بڑے آرام سے سفر کر سکتے ہیں۔ عورتوں کے لئے الگ ڈبے ہوتے ہیں۔'' اس طرح میری سمجھ میں آیا کہ ریل کو شاہی سواری کس وجہ سے کہتے ہیں۔ واقعی ان کی بات بالکل درست ہے۔ جتنا آرام ریل میں ملتا ہے اتنا کسی اور سواری میں نہیں ملتا۔ خاص طور پر لمبے سفر میں ریل میں

بہت مزہ رہتا ہے۔ لوگ اس طرح گھل مل کر بیٹھے رہتے ہیں جس طرح ایک خاندان کے لوگ ایک کمرے میں بیٹھے ہوں۔

پچھلے سال کی موسم گرما کی چھٹیوں میں مجھے بھی کراچی کا سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ویسے مجھے تو کئی بار ریل کا سفر کرنے کا اتفاق ہوا مگر جو مزا کراچی کے لمبے سفر میں آیا وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ کراچی میں ہمارے چچا رہتے ہیں۔ پہلے وہ دہلی میں رہا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے کراچی میں ہی مستقل رہائش اختیار کرنے کا پروگرام بنالیا تھا۔ دہلی سے ان کی ٹرین تھرپارکر کے اسٹیشن کراچی پہنچ گئی تھی۔ وہیں ان کو مکان مل گیا۔ انہوں نے وہیں کاروبار بھی شروع کر دیا اور وہیں رہائش پذیر ہو گئے۔ وہ چھٹیوں سے تین ماہ پہلے ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے اور تقریباً دو ہفتے رہ کر گئے۔ وہ جاتے ہوئے ہمیں بھی کراچی آنے کی دعوت بہت زوردار الفاظ میں دے گئے۔ انہوں نے شکوہ بھی کیا کہ ہم تو کئی دفعہ آپ کے پاس آئے ہیں مگر آپ نہیں آتے اگر اب آپ نہ آئے تو ہم آئندہ آپ کے پاس نہیں آئیں گے۔ چنانچہ ابو اور امی نے پروگرام بنایا کہ تعطیلات میں امی سمیت سب بہن بھائی کراچی ہو آئیں۔

ان دنوں پنجاب میں شدت کی گرمی ہوتی ہے لیکن کراچی میں گرمی اتنی نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے بھی کراچی کا سفر اچھا لگا۔ ہم نے کراچی جانے کا پروگرام بنالیا اور تیار ہو گئے۔

کراچی جانے کے لئے سیٹیں اور برتھ ریزرو کروانے ضروری ہوتے ہیں۔

لہٰذا ہم نے پندرہ دن پہلے اپنی، امی اور دو بہنوں کے لئے چار سیٹیں اور چار برتھیں ریزرو کروالیں۔ جس دن ہم نے سفر کا آغاز کرنا تھا اس سے ایک دن پہلے ہم نے جو سامان ساتھ لے جانا تھا خرید لیا سفر کے لئے بستر وغیرہ تیار کر لئے۔ جس دن ہم نے کراچی جانے کا ارادہ کیا تھا اس دن اتفاق سے میری باجی جو لاہور میں بیاہی ہوئی ہیں آ گئیں۔ ان کا بھی پروگرام بن گیا۔ وہ بھی تیار ہو گئیں کہنے لگیں کہ جس دن کے ٹکٹ آپ بک کرائیں مجھے فون پر اطلاع کر دیں۔ میں بھی اسی دن کا ٹکٹ خرید لوں گی۔ برتھ اگر نہ بھی ملی تو ہمارے پاس چار برتھیں ہیں گزارہ ہو جائے گا۔ ہمیں سپر کی ٹکٹیں ملیں۔ سپر چونکہ لاہور سے چلتی ہے اس لئے ہمیں بذریعہ بس گوجرانوالہ سے لاہور تک جانا پڑا۔ ایک دن پہلے ہم لاہور باجی کے ہاں پہنچ گئے۔ ان کی بھی تیاری کروائی۔ وہیں کھانے پینے کا سامان بھی تیار کیا اور گاڑی کے چلنے سے آدھ گھنٹہ قبل ہم لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔

سپر ایکسپریس شام کو چار بجے چلتی ہے اور دوسرے دن تقریباً دس بجے کراچی پہنچ جاتی ہے۔ راستے میں اس کے سٹاپ بہت کم ہیں اس لئے پہنچتی بھی جلدی ہے۔ اس میں بھیڑ زیادہ ہوتی ہے مگر ہمارے پاس تو سیٹیں اور برتھ ریزرو تھیں۔ اس لئے ہمیں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ گاڑی چلنے سے آدھ گھنٹہ پہلے تک دھکم پیل ہوتی رہی۔ گاڑی روانہ ہوئی تو خدا کا شکر ادا کیا۔ لوگوں کو کچھ سکون ملا۔ اب آرام سے سب لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ جن کے پاس اوپر والی برتھیں تھیں وہ اوپر چڑھ گئے۔ کوئی لیٹ گیا کوئی بیٹھ گیا۔ جوں جوں سفر طے ہوتا گیا مسافر ایک

دوسرے سے گھل مل گئے۔ آپس میں باتیں شروع ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد کچھ چائے والا آ جاتا اور آواز لگا کر چلا جاتا۔ جس کو ضرورت ہوتی وہ چائے منگوا لیتا۔ شام پڑتے ہی کھانے والے آنا شروع ہو گئے۔ کھانا۔ صاحب۔ کھانا۔ جن مسافروں کے پاس کھانے کا انتظام نہیں تھا انہوں نے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ شام کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ ہمارے پاس کھانے کا انتظام تھا اور ہم نے پانی کا بندوبست بھی کرلیا تھا۔ اس لئے ہم نے کھانا نکالا۔ کھانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ساتھ والوں نے بھی اسی طرح سے اپنے اپنے کھانے نکال لئے۔ یوں معلوم ہونے لگا کہ ایک گلی کے لوگ اپنے اپنے گھروں سے کھانے لا کر ایک جگہ اکٹھے بیٹھ کر کھا رہے ہیں۔ نزدیک بیٹھے ہوئے مسافر ایک دوسرے کو کھانے میں شمولیت کی دعوت بھی دے رہے تھے۔ اس طرح کئی لوگ کھانا اکٹھا رکھ کر کھانے لگے۔ اس دن کھانے میں وہ مزہ آیا کہ پہلے کبھی نہیں آیا۔ سب اکٹھے ہو کر پیار محبت سے ایک کنبے کی طرح کھا رہے تھے۔ کھانے کے تھوڑی دیر بعد سونے کی باری آئی۔ سب نے اپنی اپنی برتھیں سنبھال لیں اور بستر بچھا لئے۔ رات گئے تک خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد سو گئے۔

سچی بات ہے میں تو آرام سے رات بھر سویا رہا۔ صبح جب اٹھا ہوں تو ہم روہڑی گزر چلے تھے۔ حیدر آباد وہاں سے پچاس میل تھا۔ صبح ہاتھ منہ دھویا۔ چائے منگوائی اور ناشتہ کیا۔ اس وقت سے لے کر گیارہ بجے تک لوگ آپس میں ہنستے کھیلتے رہے اور میں تو حیران ہوا کہ کئی لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے بھی

لئے اور انہیں اپنے پتے دیئے اور کراچی دوبارہ ملنے کے پکے وعدے کئے جیسے وہ آپس میں پکے دوست بن گئے ہوں۔ میرے ساتھ میرا ہم عمر ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ اس نے بھی ہمارے ہاں آنے کا وعدہ کیا اور وہ آیا اور ہم دونوں اکٹھے کراچی کی سیر بھی کرتے رہے۔ وہ لاہور کا رہنے والا ہے۔ وہ میرا پکا دوست بن گیا اور ہے بھی واقعی مخلص۔ اس طرح ہمارا کراچی کا سفر بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا جو بہت ہی دلچسپ تھا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بس کا سفر

ویسے تو بس کا سفر کرنے کا اکثر اتفاق ہوتا رہتا ہے مگر سفر وہ یاد رہتا ہے جس میں کوئی ایسی دلچسپی ہو جو یاد رہے یا کوئی ایسا تکلیف دہ واقعہ پیش آیا ہو جو نہ بھولنے والا ہو۔ مجھے بھی ایک ایسا واقعہ یاد ہے، جو دلچسپ زیادہ تھا اور تکلیف دہ کم۔

پچھلے سال میں نے اور میرے ایک دوست نے مری کی سیر کا پروگرام بنایا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے والدین سے اجازت لے لی۔ ہم دونوں لاہور شادباغ کے رہنے والے ہیں۔ ہم لاہور کی تمازت سے بہت گھبرا گئے تھے۔ کہ اس لئے ہمارا مری جانے کو دل چاہا۔ ویسے بھی ہم نے اس سے پہلے مری نہیں دیکھی تھی۔ اس دفعہ پکا ارادہ ہو گیا کہ اب ضرور دیکھیں گے۔

جون کا مہینہ تھا۔ گرمی پورے جوبن پر تھی۔ پروگرام بنا کر ہم نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ چونکہ مری میں جون کے مہینے میں بھی ٹھنڈ ہوتی ہے اس لئے ہم نے موسم کے مطابق کپڑے لئے بستر باندھ کر جانے کو تیار ہو گئے۔ بسوں کے اڈے تک والد صاحب ہمارے ساتھ گئے۔ ان کی نظر میں ہم ابھی بچے تھے۔ وہ آخر تک ہمیں ہدایت دیتے رہے۔ ساتھ ہی انہوں نے ہمیں ایک رقعہ بھی دیا۔ وہاں کے ایک بارسوخ آدمی ان کے دوست ہیں۔ ان کے نام رقعہ تھا تا کہ ہمیں کسی ناگہانی تکلیف کی صورت میں ان سے کوئی مدد لینا پڑے تو لے سکیں۔ ویسے بھی انہوں نے کہا کہ اگر تم ان کے پاس ٹھہرنا چاہو تو ٹھہر سکتے ہو۔ لیکن اس کے

لئے ہم نے ان سے معذرت چاہی کہ ہم سیر کی غرض سے جا رہے ہیں ہم کوئی اپنے مطلب کی جگہ لے لیں گے جہاں ہمیں مری کے نظارے خوب نظر آتے ہوں تا کہ ہماری سیر کا مقصد پورا ہو جائے۔

ہم راولپنڈی کی بس میں سوار ہو گئے۔تھوڑی دیر کے بعد بس چل پڑی اور تقریباً پندرہ منٹ کے بعد راوی کے پل پر پہنچی۔ چونکہ اتوار کا دن تھا اس لئے راوی پر بہت رونق تھی۔لوگ شہر سے آئے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ بوٹ میں بیٹھے تھے اور کشتی رانی کر رہے تھے۔راوی کے پل پر جہاں ٹول ٹیکس والے ہیں ڈرائیور نے تیس روپے دے کر رسید لے لی لیکن یہ کام ڈرائیور نے ایسی ہوشیاری اور پھرتی سے کیا کہ عام آدمی نہیں کر سکتا۔بس بالکل کھڑی نہیں ہوئی۔البتہ آہستہ ضرور ہوئی تھی۔اسی ہاتھ سے اس نے پیسے دیے اور اسی ہاتھ سے اور اسی وقت پرچی یعنی اس کی رسید بھی تھام لی۔ پل پر جو آدمی کھڑا تھا اس نے دور سے بس کو دیکھتے ہی پرچی دو انگلیوں کے درمیان پکڑ لی۔ اس نے ایک ہی ہاتھ سے تیس روپے بھی پکڑ لئے اور پرچی بھی ڈرائیور کو پکڑا دی۔اس کے بعد بس شہر سے باہر نکلی۔ لاہور سے لے کر گوجرانوالہ تک چونکہ سڑک ڈبل ہے اس لئے بس اپنی سائیڈ پر فراٹے بھرتی ہوئی چلنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد کالا شاہ کاکو آ گیا اور کارخانے ہی کارخانے نظر آنے لگے۔ تقریباً پینتیس منٹ بعد مرید کے آ گیا اور وہاں پر چیک پوسٹ پر چیکنگ اور اندراج کے لئے بس پانچ منٹ کھڑی ہوئی اور چل دی۔ٹھیک ڈیڑھ گھنٹہ بعد

گوجرانوالہ پہنچ گئے۔ چونکہ یہ بس جی ٹی ایس والوں کی تھی وہ شہر میں اسٹیشن کے قریب اپنے بس سٹینڈ پر جا کھڑی ہوئی۔ یہاں زیادہ سے زیادہ پانچ سات منٹ ٹھہری اور چل پڑی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ بعد وزیر آباد آ گیا۔ وہاں پر کچھ سواریوں نے اترنا تھا لہٰذا ان کو اتارنے کے لئے ڈرائیور کو بس کھڑی کرنا پڑی۔ بس میں فالتو سواری کوئی نہ تھی۔ جتنی سواریاں وزیر آباد میں اتریں اتنی ہی اور سوار ہو گئیں۔ بس وزیر آباد کا پل عبور کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ وزیر آباد سے دو تین میل کے فاصلے پر دریائے چناب کا پل آ گیا۔ وہاں پر بھی ڈرائیور نے لاہور راوی پل کی طرح ٹول ٹیکس اسی انداز سے دیا۔ اب گجرات یہاں سے تقریباً چھ سات میل کے فاصلے پر ہے۔ پل سے گزرتے ہوئے اردگرد کی فضا بہت کھلی تھی اور قدرے خوشگوار تھی۔ گجرات پہنچے وہاں پر بھی چند منٹ ٹھہرنے کے بعد بس آگے روانہ ہو گئی۔ بس اب لالہ موسیٰ سے آگے نکل کر کھاریاں کے علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ سفر بہت دلچسپ تھا۔ چونکہ ہماری بس بھی اچھی حالت کی تھی اور ڈرائیور بھی بہت ہوشیار تھا وہ بہت سی بسوں کو پیچھے چھوڑتا چلا جا رہا تھا۔ جب وہ کسی دوسری بس کو پاس کرنے لگتا تو اس وقت بہت لطف آتا۔ پہلے تو وہ کوشش کرتا کہ ہماری بس کو آگے نہ نکلنے دے۔ مگر جب دیکھتا کہ یہ بات اس کے بس کے باہر ہے تو وہ سپیڈ نارمل کر لیتا اور ہمیں گزرنے دیتا۔ اس وقت جو مزہ آتا تھا وہ عجیب ہی طرح کا خوش کن ہوتا۔ ایک دم پٹاخے کی آواز آئی۔ یہ ٹائر پھٹنے کی آواز تھی۔ بس کھڑی ہو گئی۔ سب سواریاں پریشان ہو کر نیچے اتر آئیں کہ اب کیا ہو گا۔ مگر ڈرائیور نے

کہا کہ کوئی فکر کی بات نہیں ہمارے پاس فالتو ٹائر ہے، ابھی تبدیل کر لیتے ہیں۔ ٹائر تبدیل کر کے بیس منٹ کے بعد پھر چل دیئے مگر گرمی اس قدر تھی کہ سواریاں نہ اندر بیٹھ سکتی تھیں نہ باہر دھوپ میں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ وہ بیس منٹ سخت پریشانی اور اضطراب کی حالت میں گزرے۔

راولپنڈی پہنچ کر ہم مری جانے والی بس میں سوار ہوئے اور مری کی طرف چل دیئے۔ راستے میں ایک جگہ آئی جس کو چھرہ پانی کہتے ہیں۔ یہاں سے ٹھنڈک شروع ہو جاتی ہے۔ صاف اور ٹھنڈے پانی کے چشمے بھی یہیں سے شروع ہو جاتے ہیں۔ چونکہ چڑھائی کی وجہ سے بس کے انجن کو زیادہ زور لگانا پڑتا ہے اس لئے وہاں تک جاتے جاتے پانی ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں پر پانی ڈالنے کے لئے ضرور رکنا پڑتا ہے۔ آگے چل کر پہاڑی راستہ شروع ہو جاتا ہے جو پہاڑیوں کے گرد پیچ کھاتا ہوا اوپر چڑھتا جاتا ہے۔ ارد گرد چیل اور سفیدے کے درخت خوبصورت سماں باندھتے ہیں۔ بس اسی قسم کے نظارے دیکھتے دیکھتے مری آ گئی اور ہمارا یہ بس کا سفر بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

ہوائی جہاز اور اس کا سفر

تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ صدیوں سے انسان کسی نہ کسی شکل میں ہوا کے دوش پر اڑتا چلا آیا ہے۔ اکثر پرانی حکایات میں اڑن کھٹولے یا اڑنے والے قالین کا ذکر ملتا ہے جس سے انسان کی اڑان کی خواہش کا پتا چلتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم سے انسان کی خواہش ہے کہ جہاں جانا ہو اڑ کر چلا جائے۔ مذہبی کتابوں میں اچانک ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دینے والے ذرائع کا ذکر ملتا ہے۔ مہابھارت ہندوؤں کی مقدس کتاب ہے۔ اس میں بھی اڑن کھٹولے کا ذکر ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے پاس ایک ایسے تخت کا بھی ذکر ملتا ہے جو اڑتا تھا اور چشم زدن میں ہزاروں اور سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کرتا تھا۔ گو اس کی شکل آج کل کے جہاز جیسی نہیں تھی مگر یہ تخت خوبی کے اعتبار سے اس وقت کے جہاز کی حیثیت ہی رکھتا تھا۔ انسانوں کو ایک جگہ سے ہوا میں اڑا کر تیزی سے لے جاتا تھا اور انہی شواہد نے آج سے چند صدیاں پہلے کے انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ جب وہ لوگ ہوا میں اڑ سکتے تھے تو ہم کیوں نہیں اڑ سکتے۔

سب سے پہلے اٹھارویں صدی میں ڈاکٹر بلیک نے یہ دریافت کیا کہ ہائیڈروجن گیس عام ہوا سے ہلکی ہوتی ہے۔ اس نے ایک غبارہ تیار کیا اور اسے ہائیڈروجن کی مدد سے ہوا میں چھوڑا۔ اس کام کو فرانسیسی سائنسدانوں نے آگے بڑھایا اور یہ ثابت کر دیا کہ یہ غبارہ ایک آدمی کا وزن لے کر اڑ سکتا ہے۔ اس کے بعد یہ دریافت ہوا کہ گرم ہوا عام ہوا سے ہلکی ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے غبارہ بنایا

گیا جو نصف میل تک چل سکا اور پھر گر گیا۔ اس کے بعد تھوڑا سا وزن باندھ کر اس غبارے کو ہوا میں اڑانے کا تجربہ کیا گیا۔

۱۷۴۸ء میں انگلستان کے سائنسدانوں نے غباروں پر بہت سے تجربات کئے۔ ایک اطالوی سفیر نے ایک غبارہ چھوڑا۔ اس میں وہ خود بھی بیٹھا جس کے ساتھ ایک کتا بلی اور کبوتر بھی تھے۔ ۱۷۵۸ء میں ایک فرانسیسی نے غبارے میں بیٹھ کر رود بار انگلستان پار کی۔ اس وقت تک یہ کامیابی محض غبارے کی حد تک ہی ہوئی تھی غبارے میں ابھی ایسی کوئی کل نہیں لگ سکی تھی جو اس غبارے کو اپنی مرضی کے مطابق سمت میں چلا سکے یا جدھر جی چاہے اس کا رخ تبدیل کیا جا سکے۔

۱۸۸۹ء میں جرمنی کے ایک سائنسدان نے پتنگ کی شکل کا ایلومینیم کا جہاز تیار کیا۔ ایلومینیم ہلکی دھات ہوتی ہے اس لئے اس پر بھی بہت سے تجربات ہوئے لیکن صحیح معنوں میں ۱۹۰۲ء میں ہوا بازی میں کامیابی ہوئی۔ ۱۹۰۲ء میں دو بھائیوں نے جن کو رائٹ برادرز کے نام سے پکارا جاتا تھا کامیاب تجربہ کیا۔ یہ ابتدائی تجربہ تھا۔ اس کی کامیابی کی حد بھی بہت کم تھی یعنی انہوں نے انسٹھ سیکنڈ میں نوے فٹ کا فاصلہ طے کیا۔ گو یہ بہت ہی چھوٹی سی کامیابی تھی مگر اس نے ان کے حوصلے بلند کر دیئے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ تقریباً اڑتیس منٹ میں پچیس میل کا فاصلہ طے کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہیں سے جہاز سازی کی بنیادیں صحیح معنوں میں استوار ہوئیں۔ جہاز سازی اور جہاز رانی میں سائنسدان رائٹ برادرز کو اپنا رہنمائے اول تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد کامیاب سے کامیاب تر تجربات

ہوتے رہے اور آج ایسے ایسے ہوائی جہاز تیار ہو چکے ہیں جو سینکڑوں مسافر اور ہزاروں من بوجھ اٹھا کر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ انسان کو بے شمار سہولتیں پہنچا رہے ہیں۔ ساتھ ہی انسان ان سے انسانیت کی بربادی کے لئے بمباری کا کام بھی لے رہا ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے لوگ ہوائی جہاز میں بہت کم سفر کیا کرتے تھے مگر آج اس کا سفر عام ہو گیا ہے۔ کاروباری لوگ تو خاص طور پر اپنے وقت کی بچت کے لئے ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے بھی ہوائی جہاز کا سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ہوا یوں کہ میرے بڑے بھائی ایک تاجر ہیں۔ انہیں ایک پارٹی نے فون کیا کہ آج شام تک پہنچ جائیں تا کہ جاپان کے ایک بیوپاری سے آپ کا معاہدہ کرا دیا جائے جس نے کل جاپان چلے جانا ہے۔ یہ فون ہمیں دن کے دس بجے ملا تھا۔ اس سے پہلے بھائی جان نے وعدہ کیا تھا کہ اب جس دن میں کراچی جاؤں گا تو تمہیں ساتھ ضرور لے جاؤں گا طے ہوا تھا کہ ہم بذریعہ ٹرین چلیں گے۔ راستے میں شغل رہے گا اور کراچی کی سیر بھی خوب کریں گے۔ مگر اب انہیں جلدی کی وجہ سے بذریعہ جہاز جانا پڑا۔ بھائی جان بہت ہی شاہ دل واقع ہوئے ہیں۔ کہنے لگے کہ تم بھی میرے ساتھ ہی چلو۔ میں نے ہر حال میں جہاز میں جانا ہی ہے۔ جہاں میرا خرچہ ہو گا تمہارا بھی ہو جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔ اس لئے ہم نے پی آئی اے کے ایجنٹ کو فون کیا اور کہا کہ ہمیں دو سیٹیں ایسی فلائٹ میں چاہئیں جو ہمیں چار بجے کے قریب کراچی پہنچا دے۔ انہوں نے کہا کہ آپ آ

جائیں آپ کو ایک بجے کی فلائٹ میں بھیج دیتے ہیں۔ ہم نے ہلکا سا سامان ایک اٹیچی اور ایک بریف کیس لیا۔ مال روڈ پر چیئرنگ کراس کے سامنے ان کا دفتر ہے وہاں پہنچے۔ وہاں سے ٹکٹ لئے اور ایئرپورٹ چلے گئے۔ ہم ٹھیک بارہ بجے ائیر پورٹ پہنچ گئے تھے۔ جاتے ہی ہم کاؤنٹر پر پہنچے، اٹیچی ان کے سپرد کیا اور ٹوکن لگوایا۔ اتنے میں ائیر پورٹ والوں نے اعلان کیا کہ کراچی جانے والا جہاز PK-۳۰۳ تیار کھڑا ہے۔ مسافر حضرات اندر آ جائیں۔ ہم اندر چلے گئے سیکورٹی والوں نے ہمارا بریف کیس چیک کیا۔ اس کے بعد کہا کہ آپ اس دروازے سے اندر داخل ہوں۔ وہاں پر ایسی مشینیں لگی ہوئی ہیں جو بتاتی ہیں کہ مسافر کے پاس کوئی اسلحہ یا کوئی خطرناک آلہ تو نہیں ہے۔ ہم بخیریت وہاں سے گزر گئے اور جہاز کی طرف چل دیئے سیڑھیوں کے ذریعے جہاز پر سوار ہو گئے۔ دو بجے سے چند منٹ پہلے جہاز کے دروازے بند کر دیئے گئے اور جہاز کا انجن اتنے زور سے چلنے لگا کہ دہشت آ رہی تھی۔ جہاز پہیوں پر آہستہ آہستہ چلنا شروع ہوا۔ جہاز جوں جوں رفتار پکڑتا جا رہا تھا اونچا ہوتا جاتا تھا۔ بھائی جان نے مجھے سیٹ پر لگی ہوئی بیلٹ باندھنے کو کہا ہم دونوں سیٹوں پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے بیلٹ باندھ لی۔ میں نے نیچے دیکھا تو بڑی بڑی عمارتیں یوں لگیں جیسے بچوں کے گھروندے ہوں۔ راستے میں جو دریا آئے وہ ایسے لگتے تھے جیسے باریک باریک لکیریں لگی ہوئی ہوں۔ جاتے ہی انہوں نے ہمیں کھانا پیش کیا۔ یہ کھانا بہت ہی مزیدار تھا۔ اس کے بعد ہمیں چائے پیش کی گئی۔ اتنی دیر میں اعلان ہوا کہ ہم ملتان کی حدود

گزر آئے ہیں۔ جب حیدر آباد کے نزدیک پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ اب حیدر آباد آنے والا ہے۔ ابھی بمشکل ڈیڑھ گھنٹہ ہوا ہو گا کہ اعلان ہوا کہ ہم بفضل خدا بخیریت کراچی کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں اور چند منٹ بعد کراچی ائیر پورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں۔ اس طرح ہمارا ہوائی جہاز کا سفر بخیریت ختم ہوا۔ میرے لئے یہ پہلا تجربہ تھا جو بہت ہی دلچسپ لگا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ہمارے ذرائع آمدورفت

قدیم زمانے میں ذرائع آمدورفت بہت ہی سست رفتار اور سیدھے سادے ہوا کرتے تھے۔ سواری اور باربرداری کا کام اونٹوں، گھوڑوں، خچروں اور گدھوں سے لیا جاتا تھا۔ اس میں وقت بھی بہت خرچ ہوتا تھا اور جان و مال بھی محفوظ نہیں ہوتے تھے۔ سفر کرنے کے لئے قافلوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ راستے میں ڈاکو مال و اسباب لوٹ لیتے تھے راستے بھی کچے اور خطرناک ہوا کرتے تھے۔ جنگلوں، ریگستانوں اور دریاؤں سے گزرنا بہت مشکل کام تھا۔ مہینوں سفر میں گزر جاتے تھے۔ اس کے بعد ذرا لوگوں نے ترقی کی تو رتھ، یکے، چھکڑے چلنے لگے۔ اس کے بعد مشینی دور شروع ہوا۔ سائنسی ایجادات نے انسان کے لئے سبک رفتار اور آرام دہ وسائل مہیا کر دیئے۔ ریلیں، بسیں، کاریں اور ٹرک سواری اور باربرداری کا کام کرنے لگے۔ اس دور کو ہم مشینی دور کا نام دے سکتے ہیں۔

یہ انیسویں صدی کا زمانہ تھا۔ اب سائنس کے ارتقاء کی رفتار بہت تیز ہو چکی تھی اور اس امر کی ضرورت بھی زیادہ ہو گئی تھی کہ زندگی کی رفتار کو اور تیز کیا جائے۔ سائنس دانوں نے کاوش جاری رکھی اور بیسویں صدی کے شروع میں انسان ہوا کے دوش پر اڑنے لگا۔ یہ ہوائی جہاز تھا پہلے جہاز صرف بیس پچیس مسافروں کی تھوڑی سی تعداد لے کر اڑ سکتا تھا اور اس کی رفتار بھی اتنی زیادہ نہ تھی لیکن اب ایسے ایسے جہاز تیار ہو چکے ہیں جو سینکڑوں مسافروں اور ہزاروں من مال لے کر گھنٹوں میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتے ہیں۔ سات آٹھ سو میل فی

گھنٹہ کی رفتار والے جہاز تو عام ہیں اور خاص قسم کے جہاز اس سے بھی زیادہ تیز رفتار اور بڑے ہیں۔

عام آدمی کے لئے ریل اور بس کا سفر بہت موزوں رہتا ہے۔ اس میں خرچ بھی بہت کم ہوتا ہے۔ ریلوں کے جال سارے ملک کے کونے کونے میں بچھے ہوئے ہیں جن سے شہروں اور دیہات کے لوگ بھی یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔ ریلیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تیز رفتار ہوتی ہیں۔ مثلاً خیبر میل، تیز گام، تیز رو، عوام ایکسپریس، چناب ایکسپریس، سپر ایکسپریس، وغیرہ۔ یہ مین لائن پر بڑے بڑے شہروں کے لئے اور لمبے سفر کرنے والے مسافروں کے لئے موزوں ہیں۔ کراچی سے پشاور مین لائن کہلاتی ہے۔ ان میں سے کوئی ٹرین پشاور سے کراچی جاتی ہے اور وہاں سے واپس پشاور آتی ہے۔ کوئی راولپنڈی سے کراچی کے لئے چلتی ہے اور واپس آتی ہے۔ کوئی لاہور سے کراچی جاتی ہیں اور کراچی سے لاہور آتی ہیں۔ لاہور سے کراچی کا درمیانی ساڑھے سات سو میل کا فاصلہ تقریباً سترہ گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ پسنجر ٹرینیں ہیں جو عموماً برانچ لائنوں پر چلتی ہیں۔ یہ پسنجر ٹرینیں مین لائن پر بھی چلتی ہیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہات والے اسٹیشنوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ ٹرینیں ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر ٹھہرتی ہیں۔ یہ لمبا سفر کرنے والے کے لئے موزوں نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ان کی رفتار بھی ایکسپریس ٹرینوں کی نسبت بہت کم ہوتی ہے۔ دوسرے یہ ہر اسٹیشن پر رکتی ہیں اس

لئے سفر میں ایکسپریس ٹرینوں کے مقابلے میں دگنا وقت لگتا ہے۔ اس میں زیادہ تر دیہات اور قصبوں کے لوگ سفر کرتے ہیں جنہوں نے نزدیک نزدیک جگہوں پر جانا ہوتا ہے۔

باربرداری کے لئے ریلوے نے مال گاڑیاں چلانے کا انتظام کیا ہوا ہے۔ ایک مال گاڑی ساٹھ ستر اور اس سے بھی زیادہ ڈبوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک ڈبے میں بیس پچیس ٹن مال جا سکتا ہے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ ایک مال گاڑی کتنا مال ادھر سے ادھر لے جا سکتی ہے۔ اس پر کیا موقوف ہے۔ سمندری جہاز اتنے بڑے بڑے ہوتے ہیں کہ اس کے اندر ایک شہر بس رہا ہوتا ہے۔ ان کی کئی منزلیں ہوتی ہیں۔ لاکھوں من مال کی باربرداری اور ہزاروں مسافروں کی آمدورفت کا یہ سب سے بڑا سمندری ذریعہ ہیں۔

اس کے علاوہ بسیں اور ویگنیں بھی ذریعہ آمدورفت ہیں۔ بسوں میں پچاس ساٹھ مسافروں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ویگنوں میں بھی بارہ یا سولہ مسافر بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ بھی ایک اچھا ذریعہ آمدورفت ہے۔ ان میں آسانی یہ ہے کہ ریل کی طرح ان کا انتظام نہیں کرنا پڑتا۔ جس وقت جانا چاہو بس پکڑو اور پہنچ جاؤ۔ ٹرین کے لئے مقررہ وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے بعض اوقات ٹرین وقت مقررہ سے بھی لیٹ آتی ہیں۔ اور بہت زیادہ کوفت کا باعث بنتی ہے مگر اس کا سفر بس کی نسبت زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ بسوں میں اکثر تیز رفتاری کی وجہ سے حادثات ہوتے رہتے ہیں جو انسانی ضیاع کا باعث بنتے ہیں۔

سڑکوں کے ذریعے باربرداری کا کام ٹرکوں، ٹرالیوں اور لوڈروں سے بھی لیا جاتا ہے۔ مال دو تین سو من ہو تو پورا ٹرک بہتر رہتا ہے۔ جہاں جی چاہے ٹرک لے جاؤ جا سکتا ہے۔ صرف پکی سڑک درکار ہے۔ اچھی قسم کی کچی سڑک بھی ہو تو وہاں بھی ٹرک چل جاتا ہے۔ اگر مال کم ہو تو ٹرکوں کے اڈوں سے مال بک کروا کر بھیجا جا سکتا ہے۔

آج کل آمدورفت کا مسئلہ تسلی بخش حد تک حل ہو چکا ہے۔ یہ سب تجسس اور تحقیق کی بدولت ہوا ہے۔ علم کی روشنی جس قدر بڑھتی جا رہی ہے دنیا اسی قدر ترقی کرتی چلی جا رہی ہے۔ علم بڑی دولت ہے۔ علم حاصل کرنے کے بعد اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو تمام انسانی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

ورزش کے فائدے

تنگدستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

تندرستی یا صحت بہت بڑی دولت ہے۔ اگر تندرستی نہ ہوتو انسان کی زندگی اجیرن ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس دولت کی زیادہ سے زیادہ قدر کی جائے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی حفاظت کی جائے۔ اگر ایک بار تندرستی متاثر ہوجائے تو ساری انسانی زندگی متاثر ہوجاتی ہے اور نہ تو انسان صحیح طرح سے حقوق اللہ ادا کرنے کے قابل رہتا ہے اور نہ حقوق العباد۔ تندرستی قائم رکھنے کے لئے ورزش بہت ضروری ہے۔ غذا کو ہضم کرنے کے لئے ورزش مدد ثابت ہوتی ہے۔ ورزش سے جسم کی صحیح نشوونما ہوتی ہے۔ بدن چست اور مضبوط ہوجاتا ہے۔ انسان ہشاش بشاش رہتا ہے۔ جسمانی اعضا اور پٹھے طاقتور ہو جاتے ہیں۔ اگر صحت ہے تو کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے کام کرنے اور دوڑنے کودنے اور عمل میں آسانی ہوگی اور خوش خوش ہر کام انجام پاسکے گا لیکن اگر خدانخواستہ صحت ہی ٹھیک نہیں تو کسی چیز میں لطف نہیں ہوگا۔ سونا چاندی، مال واسباب، وراثت و جاگیر سب بیکار ہیں۔ صحت کی قدر و قیمت کا اندازی اس وقت ہوتا ہے جب انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔

ورزش کرنا بھی اک فن ہے۔ اس کے لئے بھی کسی استاد کا شاگرد بن کر سیکھنا ضروری ہے۔ اس کے لئے ہدایات لینا پڑتی ہیں۔ ورزش کے لئے وقت بھی مقرر

کرنا ہوتا ہے۔ ہر ورزش کی خاصیت الگ الگ ہوتی ہے۔ ورزشیں کئی قسموں کی ہوتی ہیں۔ ایک ہلکی قسم کی ہوتی ہیں جن کے لئے کسی استاد یا خاص ہدایات کی ضرورت نہیں ہوتی مثلاً صبح کی سیر، چہل قدمی، دوڑنا، کودنا، اپنے آپ کو سست نہ ہونے دینا، ہر وقت کام میں لگائے رکھنا۔ اس کے علاوہ کشتی لڑنا، کشتی چلانا، مگدر چلانا، ڈنڈ پیلنا، تیرنا ان کا شمار ذرا سخت قسم کی ورزشوں میں ہے۔ ان کے لئے ماہر استادوں کی ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کھیل مثلاً کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، والی بال، ٹینس وغیرہ ہیں۔ یہ کھیل بھی محنت طلب ہیں اور ماہرین کی نگرانی میں کھیلے جاتے ہیں۔

مختلف ورزشوں کے مختلف فوائد ہوتے ہیں۔ کچھ ایسی ورزشیں ہوتی ہیں جو خاص اعضاء کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ مثلاً ڈنڈ پیلنا، یہ بازو، گردن اور سینے کے پٹھوں کو مضبوط کرنے کے لئے مفید ہے۔ سینے کو چوڑا کرنے میں مفید ہے۔ ٹانگوں کو مضبوط بنانے کے لئے بیٹھکیں لگانا اور دوڑنا مفید ہے۔ اسی طرح سے جو کھیلنے والی ورزشیں ہیں وہ عملاً سارے جسم کو چاق و چوبند رکھتی ہیں۔ کشتی لڑنا واقعی بہت سخت اور مہنگی ورزش ہے۔ یہ پہلوان قسم کے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ عام لوگوں کے لئے تو صبح کی سیر یا پیدل چلنا، دوڑنا، کودنا صحت کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ تیرنا بھی بہت ہی اچھی ورزش ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ بہترین ورزش ہے۔ اس میں جسم گرم ہونے نہیں پاتا اور طاقت قائم رہتی ہے۔

بازوؤں کو مضبوط بنانے کے لئے مگدر، سپرنگ اور ڈمبل سے ورزش کرنا

چاہیے۔ ڈنٹر پیلنے سے بھی بازو مضبوط ہو جاتے ہیں۔ پیٹ بڑھ جائے تو صبح کی سیر زیادہ سے زیادہ کی جائے۔ پیٹ بڑھنا عام نظر میں تو اتنا نقصان دہ نہیں معلوم ہوتا مگر پیٹ بڑھنے سے بہت سی بیماریوں کا آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی طرف خاص توجہ دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ موٹاپا بھی تو بیماری کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس قدر انسان موٹا ہوتا چلا جاتا ہے اسی قدر سست و کاہل ہو جاتا ہے اور ورزش اور محنت سے کتراتا ہے۔ یہی کاہلی اور سستی اس کے لئے وبال جان بن جاتی ہے۔ موٹا آدمی بہت سی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ موٹے لوگوں کو اکثر بلڈ پریشر، دل کی بیماریاں اور شوگر ہو جاتی ہیں۔

ورزش کرنے والے کو خیال رکھنا چاہیے کہ اس کی خوراک بھی ورزش کے مطابق ہو۔ اگر کسی کو محنت اور مشقت سے کام کرنا پڑتا ہے تو بے شک مرغن غذا بھی کھائی جا سکتی ہے جو ہضم بھی ہو سکتی ہے لیکن اگر کام اس قسم کا ہے جس میں محنت ہے ہی نہیں تو پھر غذا بہت ہی سادہ اور ہلکی ہونا چاہیے۔ ایسے آدمیوں کو ورزش کی طرف خاص توجہ دینی چاہیے۔ اگر ایسے آدمی ورزش یا صبح کی سیر نہ کریں گے تو کبھی تندرست نہیں رہ سکیں گے۔

ورزش کے اعتدال کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ورزش اپنی ضرورت اپنی قوت اور عمر کے مطابق ہونا چاہیے۔ ورزش کا وقت صبح شام موزوں رہتا ہے۔ موسم کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ سردی کے موسم میں ٹھنڈ لگ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا خاطر خواہ انتظام رکھنا چاہیے۔ کھانا کھانے کے بعد ورزش

نہیں کرنا چاہیے۔ ورزش کے فوراً بعد کسی ٹھنڈی چیز مثلاً سوڈا، آئس کریم یا ٹھنڈے شربت کا استعمال معدے کو خراب کر دیتا ہے۔

بہر حال ورزش جسم کو سڈول، مضبوط اور چاق و چوبند رکھتی ہے۔ جس طرح خوراک زندگی کو چلانے کے لئے ضروری ہے اسی طرح ورزش بھی صحت قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم ورزش کو روزمرہ کا معمول بنا لیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

کھیلوں کی اہمیت

کھیل تفریح کا ایک ایسا طریقہ ہے جس سے نظم وضبط برقرار رکھنے کا درس ملتا ہے۔اس سے احترام قانون بھی سیکھا جاتا ہے۔اطاعت امیر کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اتحاد و اتفاق کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

آج کا دور اضطراب اور پریشانیوں کا دور ہے۔اس میں کسب معاش کے لئے بہت ہی دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے۔سارے دن کی محنت اور مشقت سے انسان تھک جاتا ہے اور اگر اس کے لئے تفریح کا سامان نہ ہو تو صحت گرنے لگتی ہے۔طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے۔کام سے دلچسپی نہیں رہتی۔ورزشی تفریح انسان کی کسالت دور کر کے اسے پھر سے تازہ دم کر دیتی ہے۔ورزشیں کئی قسم کی ہیں اور جس ورزش میں انسان فطری طور پر زیادہ دلچسپی رکھتا ہے وہ کھیل ہے۔دوڑنا کودنا، چھلانگ لگانا، کشتی چلانا، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور اسی قسم کے دوسرے کھیلوں میں ورزش خود بخود ہی ہو جاتی ہے اور انسان چست اور ہشاش بشاش رہتا ہے۔

کھیل انسان کو نظم وضبط سکھاتا ہے۔قوت برداشت، ضبط نفس، اتفاق اور اطاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔کھیل مقررہ وقت پر شروع ہوتا ہے اور مقررہ وقت پر ختم ہوتا ہے۔اسی میں کھلاڑیوں نے ہار جیت کا فیصلہ بھی کرنا ہوتا ہے۔اس کھیل سے وقت کی اہمیت کا احساس پیدا ہوتا ہے، وقت کی پابندی کی عادت پڑ جاتی ہے اور کام کو اپنے وقت پر کرنے اور اس میں کوتاہی نہ کرنے کا احساس پیدا ہو جاتا

ہے۔ یہ عادت آگے چل کر کھلاڑیوں کے لئے کامیابی کا باعث بنتی ہے۔

قوت ہر دور میں کامیاب رہی ہے۔ اتفاق قوموں کی بہت بڑی قوت ہوتی ہے۔ کھیل سے کھلاڑیوں میں اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ٹیم میں اگر اتفاق نہ ہو تو کامیاب نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا کھلاڑیوں کو ایک دوسرے سے اتفاق اور ہمدردی کا سلوک کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اس طرح ان میں اتحاد و اتفاق کی اہمیت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

چونکہ کھیلوں کے کچھ مقررہ ضابطے ہوتے ہیں اس لئے ان ضابطوں سے ہٹ کر کوئی بھی کھلاڑی نہیں کھیل سکتا۔ ذرا بھی بے ضابطگی ہونے سے ٹیم کا بہت نقصان ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹیم کی ہار جیت کا انحصار بھی مقررہ قوانین کی پابندی کرنے یا نہ کرنے پر ہوتا ہے۔ کھیل کا میدان کھلاڑیوں کو احترام قانون سکھاتا ہے۔ جو قوم قانون کا احترام کرنا سیکھ لے وہ ترقی کے زینے طے کرتی چلی جاتی ہے اور اپنے ملک کو امن و امان سے جنت نظیر بنا سکتی ہے اور معاشرے کی تمام خرابیاں دور ہوسکتی ہیں۔

ٹیم ایک کپتان کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس کی اطاعت ہر کھلاڑی پر فرض ہوتی ہے۔ اگر کوئی کھلاڑی اپنے کپتان کی مرضی کے خلاف چلے تو اسے فوراً ٹیم سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ وہ اپنے امیر کی فرمانبرداری کرے۔ اس طرح کھلاڑیوں میں اطاعت امیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جو قومیں اپنے امیر کے تابع رہ کر نہیں چلتیں وہ انتشار کا شکار ہو کر ختم ہو جاتی ہیں اور صفحۂ ہستی سے ان کا نام

مٹ جاتا ہے۔کھیل کا میدان کھلاڑیوں کے لئے اپنے امیر کی اطاعت کرنے کی بہترین مشق گاہ ہے۔کھیل کا رجحان اگر عام ہو جائے تو لوگوں میں بھی احترام امیر پیدا ہو جائے گا۔اس طرح قوم نا اتفاقی اور انتشار کا شکار ہونے سے بچ جاتی ہے۔

کھیل آج کل صرف اندرون ملک ہی نہیں کھیلے جاتے بلکہ بین الاقوامی طور پر بھی کھیلے جاتے ہیں۔ایک ملک کے دوسرے ملک سے مقابلے ہوتے ہیں۔اس کے بعد جو جیتتا ہے اس کا مقابلہ دوسرے ملک سے ہوتا ہے۔اسی طرح سے سلسلہ چلتا ہے اور آخر میں دو ملکوں کے درمیان فائنل میچ ہوتا ہے۔اس فائنل میں جو ٹیم جیت جاتی ہے وہ دنیا کی سب ٹیموں پر فاتح قرار پاتی ہے۔جس ملک کی وہ ٹیم ہوتی ہے اس کا وقار دنیا میں بہت بلند ہو جاتا ہے۔وہ اپنے ملک کے لئے نام پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔اس ملک کا نام روشن ہوتا ہے اور اس ملک کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ہمارے ملک کی ہاکی ٹیم نے بارہا اپنے ملک کا نام روشن کیا۔اس طرح ہمارے ملک کی شہرت اور عزت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے اور جذبہ مسابقت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

پاکستان کے ہر گلی کوچے میں کھیلوں کا رجحان بڑھ رہا ہے۔حکومت بھی اس کی طرف خاص توجہ دے رہی ہے۔جس جگہ جاؤ لڑکے ہاتھوں میں بلا لئے پھر رہے ہیں۔وہ نہ وقت دیکھتے ہیں اور نہ میدان دیکھتے ہیں نہ گلی کوچے، اس طرح بے ضابطگی کا رجحان بڑھتا ہے۔جو بچے یہ نہیں سمجھتے کہ کھیل وقت پر کھیلا جانا چاہیے وہ وقت کی پابندی کیا کریں گے اگر کھیل میں بچے پابندی وقت کا خیال نہیں رکھتے یا

اپنی پڑھائی پر توجہ نہیں دیتے تو ایسا کھیل تو ان کی بربادی کا باعث بن جائے گا۔ اس طرح کھیل کا اصل مقصد مفقود ہو کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کھیل بطور ورزش کھیلا جائے اور اس کے اصول وضوابط کی پابندی کی جائے اور حوصلہ مندی کے ساتھ بہتر سے بہتر کھیل کا مظاہرہ کیا جائے۔ اس سے کھلاڑیوں کے اندر پابندی وقت، اتحاد و اتفاق اور اطاعت امیر کے جذبات مہیا ہوں گے جس سے ملک کی نیک نامی ہوگی۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ایک کرکٹ میچ کا آنکھوں دیکھا حال

پچھلے بدھ کو میرا ہم جماعت حمید ہمارے گھر آیا اور بتایا کہ آج گورنمنٹ ہائی سکول اور گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول کے درمیان کرکٹ کا میچ ہو رہا ہے۔ یہ سن کر ہم نے دوسرے دوستوں کو ساتھ لیا اور یونیورسٹی گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔ ہمارے جانے سے پہلے گراؤنڈ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی مگر اب بھی طلباء اور دوسرے تماشائی جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ ہمیں اپنے سکول کے طلباء کو ڈھونڈنے میں ذرا دقت ہوئی کیونکہ طلباء ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ ایک سکول کے طلباء ایک ہی جگہ اکٹھے ہو کر بیٹھیں۔ اکٹھے ہی شور مچانا ہوتا ہے۔ اکٹھے ہی تالیاں بجانی ہوتی ہیں۔ ایسے موقع پر اکٹھے بیٹھنے میں بہت مزا آتا ہے۔

وقت مقررہ پر امپائر گراؤنڈ میں نکلے جو اپنے زمانے کے بہترین کھلاڑی رہ چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دونوں ٹیموں کے کپتان گراؤنڈ میں آ گئے۔ کھیل کا آغاز کرنے کے لئے ٹاس کیا گیا۔ ٹاس گورنمنٹ ہائی سکول نے جیت لیا۔ لہٰذا انہوں نے دو اوپننگ بیٹسمین کھیل کے میدان میں بھیج دیے۔ ان کے باہر نکلنے پر تماشائیوں نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور کھیل شروع ہو گیا۔ شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد گورنمنٹ سکول کے دو کھلاڑی دس رنز بنا کر آؤٹ ہو گئے اور اس کے بعد کے تین کھلاڑی بھی بڑی مشکل سے پندرہ رنز بنا سکے۔ یہ کھلاڑی کھیلنے کے اعتبار سے اچھے ریکارڈ کے مالک تھے مگر چانس کی بات ہے گورنمنٹ سکول کی ٹیم پر کچھ مایوسی سی چھا گئی۔ اسلامیہ ہائی سکول کے باؤلر بہت مستعدی

سے باؤلنگ کر رہے تھے۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گورنمنٹ سکول کی فتح بہت مشکل ہے اور اسلامیہ سکول کی ٹیم گورنمنٹ سکول کو بری طرح سے شکست دے گی۔ ان کے بعد گورنمنٹ سکول نے اپنے کپتان کو بھیجا۔ کپتان نے آ کر مخالف باؤلر کا خوب مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک سینچری بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے کھلاڑی کھیلتے تو رہے لیکن بہت زیادہ کامیابی سے نہیں۔ تھوڑی تھوڑی رنز بنا کر آؤٹ ہوتے گئے اور کپتان آخر تک آؤٹ نہ ہوا تھا۔ پہلی اننگ میں ان کا صرف ایک سو پینتالیس رنز کا سکور تھا۔

اس کے بعد اسلامیہ سکول نے کھیلنا شروع کیا۔ ان کے کھلاڑی گورنمنٹ سکول کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ لیکن گورنمنٹ سکول کی فیلڈنگ بہتر تھی۔ وہ بڑے صبر و استقلال کے ساتھ باؤلنگ اور فیلڈنگ کرتے رہے۔ اسلامیہ سکول کے مقابلے میں گورنمنٹ سکول کی باؤلنگ بھی اچھی تھی۔ پہلے تین کھلاڑیوں نے اچھا خاصا سکور کر لیا جو نوے تک پہنچ گیا تھا۔ مگر اس کے بعد سمجھ نہیں آئی کہ ہوا کیا وہ صرف ستر رنز اور بنا سکے اور اس طرح وہ صرف ایک سو ساٹھ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئے۔ تاہم اسلامیہ سکول کو گورنمنٹ سکول پر پندرہ رنز کی برتری حاصل ہو گئی۔

اب پہلی اننگ ختم ہو چکی تھی اور دوسری اننگ شروع ہونے والی تھی۔ اس وقت گورنمنٹ سکول کے مینیجر نے اپنے کھلاڑیوں کو ایک جگہ کر کے ایک تقریر کے ذریعے حوصلے بلند کر کے ان میں نئی روح پھونک دی اور انہیں یقین دلا دیا کہ اب فتح ہماری ہی ہو گی۔ اس کے بعد دوسری اننگ کا آغاز ہوا۔ گورنمنٹ سکول کے

کھلاڑیوں نے اس دفعہ خوب حوصلہ مندی اور تحمل سے کھیلنا شروع کیا۔ دوسری طرف کے باؤلر بھی بہت ہنرمندی سے باؤلنگ کر رہے تھے۔ کئی بار باؤلر تبدیل کیے گئے مگر گورنمنٹ سکول کے کھلاڑی جم کر کھیلتے رہے۔ پہلے دو کھلاڑیوں نے ستر رنز بنائے۔ اس کے بعد بھی جو کھلاڑی آئے انہوں نے بھی اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ باقی آٹھ کھلاڑیوں نے ایک سو پانچ رنز بنائے۔ اس طرح اس اننگ میں گورنمنٹ سکول نے ایک سو پچھتر رنز بنائیں۔ اب ان کی کل تین صد بیس رنز ہو گئی تھیں۔ اس دفعہ بھی دونوں ٹیموں نے بڑی مہارت اور مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ اب اسلامیہ سکول کو میچ جیتنے کے لئے ایک سو اکسٹھ رنز کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد اسلامیہ سکول نے کھیلنا شروع کیا۔ یہ بھی بہت پر امید دکھائی دیتے تھے اور شاید اسی لئے انہوں نے احتیاط سے کام کیا۔ ان کے دو کھلاڑی جاتے ہی کیچ آؤٹ ہو گئے اور اسکور بھی صرف اٹھارہ تک پہنچا۔ پھر انہوں نے زیادہ مستعدی سے کھیلنا شروع کیا لیکن دو کھلاڑی پھر رن آؤٹ ہو گئے جو صرف ابھی تک پینتیس رنز بنا سکے تھے۔ اب یہ کھلاڑی کچھ گھبرائے ہوئے سے دکھائی دینے لگے کیونکہ چار کھلاڑی آؤٹ ہو گئے تھے اور ان کا سکول صرف دو صد تیرہ تک پہنچا تھا اور انہیں جیتنے کے لیے ایک سو آٹھ رنز درکار تھے لیکن آنے والے کھلاڑی بھی اتنے اچھے نہیں تھے۔ زیادہ امید پہلے کھلاڑیوں پر تھی۔ بہر حال گورنمنٹ سکول کے باؤلروں نے اور دوسرے کھلاڑیوں نے بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ بایں ہمہ اسلامیہ سکول تین سو گیارہ تک پہنچ گیا تھا اور ان کا ایک

کھلاڑی ابھی باقی تھا۔مگر شومئی قسمت دیکھئے کہ صرف پانچ رنز اور بنانے کے بعد سب کھلاڑی آؤٹ ہو گئے۔ اس طرح گورنمنٹ سکول کی ٹیم صرف چار رنز کی برتری سے میچ جیت گئی۔

ویسے تو ہی میچ ہر مرحلے میں دلچسپ رہا مگر آخر میں جا کر جب جیتنے کے لئے دس رنز درکار تھے تو اس وقت چاروں طرف بہت ہی امید و نا امیدی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت میچ بہت ہی دلچسپ مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس وقت ہا رجیت کے لئے بہت تھوڑی سی رنز کا فرق رہ گیا تھا۔بہر کیف میچ بہت دلچسپ رہا اور ہم خوشی خوشی گھر لوٹ آئے۔

فٹ بال میچ

پچھلی اتوار کو ابھی میں ناشتہ سے بھی فارغ نہیں ہوا تھا کہ میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ آج میچ ہے۔ مجھے پتا تو پہلے سے ہی تھا مگر میرا جانے کا ارادہ نہ تھا۔ اتفاق سے میرے ساتھ میرے ایک عزیز تھے۔ جب انہوں نے سنا کہ آج میچ ہے تو وہ تو مچل گئے۔ خیر ہم جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ فٹ بال کا میچ ہمارے سکول اور اقبال ہائی سکول کے درمیان تھا۔ ہم سے پہلے بھی تماشائی بہت بڑی تعداد میں پہنچے ہوئے تھے اور اب تک بہت سے لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ غرض خوب گہما گہمی تھی۔ خوب رونق تھی ایک میلے کا سا سماں تھا۔

سب سے پہلے ریفری نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی دونوں ٹیموں کے کھلاڑی اچھلتے کودتے میدان میں نکل آئے۔ تماشائیوں نے تالیاں اس قدر بجائیں کہ ساری گراؤنڈ گونج اٹھی۔ دونوں کپتانوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ کھیل کا آغاز کرنے کے لئے ٹاس کیا گیا۔ ٹاس نے ہماری ٹیم کے حق میں فیصلہ دیا۔ جھٹ دونوں ٹیموں نے اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ ہماری ٹیم کے کپتان نے فٹ بال کو کک لگا کر میچ کا آغاز کیا۔ دونوں ٹیمیں پوری تیاری میں تھیں اور مقابلہ بہت سخت تھا۔ اقبال سکول کا رائٹ آؤٹ Right Out بہت ہی چست اور ہوشیار کھلاڑی تھا۔ وہ کئی دفعہ ہماری ٹیم کے گول کے بالکل قریب چلا گیا لیکن ایک بھی گول نہ کر سکا ادھر ہمارا سنٹر ہاف Centre Half بھی بہت پھرتیلا تھا۔ اس نے گول پر کئی حملے کئے مگر گول کرنے میں ناکام رہا۔ ابھی وقفے

میں پانچ منٹ باقی تھے کہ اقبال سکول کو ایک ہینڈ بال شاٹ مل گئی۔ ان کے فل بیک Full Back نے ہٹ لگائی اور بال کو رائٹ آؤٹ کے پاس پہنچا دیا۔ اس نے پھرتی سے بال سنٹر فارورڈ Centre Forward کو پاس کر دیا۔ اس نے ڈی میں جا کر اتنی شاندار کک لگائی کہ گول کیپر منہ تکتا رہ گیا۔ اس طرح اقبال سکول نے ہمارے سکول پر ایک گول کر دیا۔

اس کے بعد ہمارے سکول کے کھلاڑیوں نے بڑے جوش سے کھیلنا شروع کیا کھلاڑی گول اتارنے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگے مگر اقبال سکول کا فل بیک ان کی ایک نہیں چلنے دیتا تھا۔ اقبال سکول کے کھلاڑی اب بال کو مخالف گول کی طرف لے جانے کی بجائے وقت ضائع کر رہے تھے۔ اس طرح کھیل بالکل بے جان ہو کر رہ گیا اور تماشائی کھلاڑیوں پر آوازے کسنے لگ گئے۔ اتنے میں ریفری نے وقفے کی سیٹی بجا دی۔ اقبال سکول کے حامیوں نے خوشی کے نعرے لگانے شروع کر دیئے اور اپنی ٹیم کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

وقفہ ختم ہوتے ہی دونوں ٹیمیں پھر کھیلنے لگیں۔ اقبال سکول کے رائٹ ہاف نے ڈی کے اندر فٹ بال کو ہاتھ لگا دیا۔ ریفری نے ہمارے حق میں پینلٹی کک لگانے کا فیصلہ دے دیا۔ ہماری ٹیم کے طلباء گول کے نزدیک جمع ہو گئے اور ہمارے سکول کے سنٹر ہاف نے ایک بھرپور کک لگا کر گول کر دیا اور برابر ہو گیا۔ اس پر خوب تالیاں بجیں اور بہت نعرے لگائے۔ اتنے میں گیند اچانک ہمارے رائٹ آؤٹ تک پہنچ گیا۔ وہ بڑا پھرتیلا تھا بال کو لے کر ڈی میں پہنچ گیا مگر گول کیپر نے

اس کی کک کو ناکام بنا دیا۔ بال ہاتھ میں پکڑا اور شاٹ لگا دی۔ اس طرح گول کیپر کی جرات اور مہارت سے ایک یقینی گول بچ گیا۔ خصوصاً اقبال سکول کے حامیوں نے بڑی داد دی۔

اس کے بعد جلد ہی اقبال سکول کو ایک شاٹ کارنر مل گئی۔ ان کے فل بیک نے ایسی کک لگائی کہ سب کھلاڑیوں کو پار کر گئی۔ لفٹ آؤٹ نے بال سنٹر فارورڈ کو پاس کر دیا اور اس نے اسے رائٹ آؤٹ تک پہنچا دیا۔ رائٹ آؤٹ نے بڑی شاندار کک لگائی۔ مگر گول کیپر بڑا پھرتیلا تھا۔ اس نے بال کو ہیڈ سے ضرب لگائی اور اسے گول سے باہر پہنچا دیا۔

کھیل ختم ہونے میں اب صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ کھیل میں بڑی جان پیدا ہو گئی تھی۔ اقبال سکول کے ایک کھلاڑی نے ڈی میں پہنچ کر اونچی کک لگائی اور ہمارے سکول کی ٹیم کے ایک کھلاڑی نے اسے پریس کرنے کی کوشش کی مگر بال اچھلا اور اس کے ہاتھوں سے جا ٹکرایا۔ ریفری نے اقبال سکول کو ایک آزادانہ کک لگانے کی اجازت دے دی۔ ٹیم کے کپتان نے کک لگائی اور گیند گول کیپر کے ہاتھوں سے چھوٹتی ہوئی گول سے گزر گئی۔ اقبال سکول کے حامیوں نے گول گول کا شور مچا دیا۔ کھیل ختم ہونے میں صرف ایک منٹ باقی تھا۔ وہ بھی چشم زدن میں گزر گیا اور ریفری نے کھیل ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اقبال سکول ایک گول سے جیت گیا۔ اس کے حامیوں نے کھلاڑیوں کو کندھوں پر اٹھا لیا اور نعرے لگاتے ہوئے شہر کی طرف روانہ ہوئے اور ہم بھی تھوڑی دیر بعد گھر لوٹ آئے۔

یہ میچ اتنا دلچسپ تھا اور اردگرد کا ماحول اور سماں اس قدر خوشگوار تھا کہ اگرچہ کئی سال گزر چکے ہیں پھر بھی میں اسے فراموش نہیں کر سکا۔ خاص طور پر جب کبھی فٹ بال کی بات چل نکلے۔ اس میچ کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

میرا پسندیدہ کھیل

میں ویسے تو ہر کھیل کو اچھا سمجھتا ہوں لیکن ہاکی میرا بہت ہی زیادہ پسندیدہ کھیل ہے۔ کرکٹ اور فٹ بال کی طرح یہ بھی بہت دلچسپ کھیل ہے۔ سب سے پہلے یہ انگلینڈ میں شروع ہوا تھا۔ اس وقت یہ ساری دنیا میں مقبول ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پاکستان میں تو یہ کھیل زیادہ مقبولیت اس لئے حاصل کر رہا ہے کہ ہماری ٹیم نے کئی دفعہ اپنے ملک کا نام روشن کیا ہے۔ ہاکی، کرکٹ اور فٹ بال کی طرح ٹیموں میں دونوں طرف گیارہ گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ دونوں مقابل کی ٹیموں کے کل کھلاڑیوں کی تعداد بائیس ہوتی ہے۔ ہر کھلاڑی کے پاس ایک لکڑی کی سٹک (Stick) ہوتی ہے جسے ہاکی بھی کہتے ہیں۔

ہاکی کے لئے بالکل ہموار میدان کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ گیند کے دوڑنے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ ہاکی کا میدان (گراؤنڈ) تین سو فٹ لمبا اور ایک سو بیس فٹ چوڑا ہوتا ہے۔ دونوں طرف آمنے سامنے دو گول (Goal) ہوتے ہیں جن کے پیچھے جال ہوتا ہے۔ گولوں کے آگے ایک ایک نیم دائرہ یعنی ڈی (D) ہوتی ہے۔ جو کھلاڑی اس گول میں ہوتا ہے اسے گول کیپر (Goal Keeper) کہتے ہیں۔ گول کی حفاظت اس کے ذمے ہوتی ہے۔ وہ گول ہونے سے بچاتا ہے۔ اسے اجازت ہوتی ہے کہ گیند کو روکنے میں اپنے ہاتھ یا پاؤں بھی استعمال کر لے۔ ٹیم کے دو کھلاڑی جنہیں فل بیک (Full Back) کہا جاتا ہے ڈی کے باہر گول کیپر کو سپورٹ (Support) کرتے ہیں۔ فل بیک کھلاڑیوں سے آگے تین

کھلاڑی اور ہوتے ہیں جن کو ''ہاف بیک'' (Half Back) کا نام دیا جاتا ہے اور جو گیند کو آگے پہنچاتے ہیں ان کو سنٹر فارورڈ (Centre Forward) کہتے ہیں۔ یہ تعداد میں پانچ ہوتے ہیں۔ ویسے تو سب اپنی اپنی جگہ پر اہم فرائض انجام دیتے ہیں لیکن سنٹر لائن والے کھلاڑی گیند کو آگے لے جاتے ہیں اور گول کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

میچ کے دوران اس کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک جج مقرر ہوتا ہے جو انہیں کھلاتا بھی ہے۔ وہ فریقین سے ہاکی کے قواعد وضوابط کے تحت عمل کرواتا ہے۔ اس جج کو کھیلوں کی زبان میں ''ریفری'' (Referee) کہتے ہیں۔ اس کو کھیل شروع کرانے اور بند کرانے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی کھلاڑی غلطی کرے تو اس کے لئے بھی وہی فیصلہ دیتا ہے۔ کھیل کی ہار جیت کا فیصلہ بھی ریفری ہی دیتا ہے جو آخری اور قطعی ہوتا ہے۔ اس کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل قابل شنوائی نہیں ہوتی۔ منصف مزاج ریفری غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ کبھی فیصلہ غلط نہیں دیتے۔ اس وقت تو جو فیصلہ ریفری دے دیتا ہے وہ فریقین کو قبول کرنا پڑتا ہے لیکن اگر وہ جانبداری سے کام لے کر غلط فیصلہ دے تو اس کی شہرت کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ ویسے بھی کھلاڑی کی Sports Manship کے ماتھے پر بدنما داغ ہے۔ تاہم اکثر ریفری غیر جانبدار ہی ہوتے ہیں۔

ہاکی اس طرح کھیلی جاتی ہے کہ دونوں فریقوں کے فارورڈ ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے ہو کر پہلے اپنی سٹک زمین پر ایک دوسرے کی سٹک پر مارتے ہیں

اور اس طرح وہ تین دفعہ کرتے ہیں۔ کھیل کی زبان میں اسے ''بلی'' کہا جاتا ہے اور ''بلی'' سے کھیل کا آغاز ہو جاتا ہے۔

کھیل کے قواعد وضوابط اس طرح سے ہیں کہ اگر کھیل کے دوران سٹک کندھے سے اوپر اٹھ جائے تو فاؤل (Foul) ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ ایک قسم کی غلطی تصور ہوتی ہے جس کے بدلے میں مخالف ٹیم کو ایک ہٹ مل جاتی ہے۔ گول کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ڈی کی حدود کے اندر سے ہٹ لگائی جائے اور یہ گیند اگر گول میں داخل ہو جائے تو آؤٹ ہو جاتا ہے۔ مگر گول نہیں ہوتا چاہے گیند گول کے اندر ہی کیوں نہ داخل ہو جائے۔

ہمارے ملک کی ہاکی ٹیم دنیا بھر میں مشہور ہے اور بہت نام پیدا کر چکی ہے۔ گو یہ ٹیم بہت مضبوط ہے مگر شومئی قسمت یہ ہے کہ ان میں کرکٹ کے کھلاڑیوں کی طرح کا اتحاد مفقود ہے اور ان میں یک جہتی بھی نہیں پائی جاتی ہے۔ پاکستان کی ہاکی ٹیم کا شمار دنیا کی بہترین ٹیموں میں ہوتا ہے۔

اگر بورڈ کے ممبر تعصب اور جانبداری سے بالاتر ہو کر خلوص سے کام کریں تو ہماری ٹیم دنیا کی بہترین ٹیم ہو گی۔

دوسرے کھیلوں کی طرح ہاکی کھیلنے کے فوائد بھی ہیں۔ ہاکی کھیلنے کے دوران جسم کی بہت ورزش ہوتی ہے۔ کھلاڑی جب کھیل رہے ہوتے ہیں تو ان کو پورے زور سے دوڑنا پڑتا ہے۔ پسینے سے ان کا جسم شرابور ہو جاتا ہے۔ اس سے جسم مضبوط اور سمارٹ ہو جاتا ہے۔ موٹاپا کبھی ان کے پاس تک نہیں پھٹک سکتا۔ ہاکی

میں خاص طور پر ٹانگوں کی ورزش ہوتی ہے۔اس کھیل میں نظم وضبط قائم رکھنے کی عادت بھی پڑ جاتی ہے اور اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔اس سے انسان اطاعت امیر کا عادی ہو جاتا ہے۔ بین الاقوامی طور پر ہاکی ملک وقوم کی شہرت کا باعث بنتی ہے۔اور دوسرے ملکوں سے ثقافتی تعلقات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ کھلاڑیوں میں Sportsman Spirit پیدا ہوتی ہے جو عملی زندگی میں قدم قدم پر ان کے کام آتی ہے اور انہیں ملک کا قابل فخر شہری بنا دیتی ہے۔

کبڈی

قیام پاکستان سے پہلے کبڈی دیہات کا سب سے بڑا کھیل سمجھا جاتا تھا۔ ویسے تو آج بھی کبڈی کو دیہات میں خاصی اہمیت حاصل ہے لیکن اس کی جگہ تھوڑی بہت دوسرے کھیلوں نے بھی لے لی ہے۔ دیہات میں کبڈی کی اہمیت اس لئے زیادہ ہوتی ہے کہ وہاں پر کرکٹ، ہاکی اور دوسرے اسی قسم کی کھیلوں کے انتظامات نہیں ہوتے۔ نہ وہاں گراؤنڈیں ہوتی ہیں نہ دوسرا سامان میسر آ سکتا ہے۔ البتہ والی بال بہت سے دیہات کے سکولوں میں اکثر کھیلا جاتا ہے کیونکہ اس کے لئے لمبی چوڑی گراؤنڈ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ کھیل ہر موسم میں کھیلا جاتا ہے۔ موسم گرما میں اکثر دیہات والے کبڈی کھیلتے ہیں۔ اس کے لئے شام کا وقت مناسب سمجھا جتا ہے۔ اس وقت دیہات کے اکثر نوجوان کام کاج سے فارغ ہو جاتے ہیں اور تماشائی بھی آسانی سے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کبڈی جوانمردوں کا کھیل ہے۔ اس میں زور آزمائی بہت ہوتی ہے۔ شام کو سورج کی تمازت کم ہو جاتی ہے اور ننگے جسم پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگتی ہے۔ اس کھیل میں دوڑنے کے علاوہ سانس کو لمبا کھینچنے کی مشق بھی ہوتی ہے۔ کمزور آدمی کبڈی نہیں کھیل سکتا کیونکہ اس میں کسی وقت ایک دوسرے ساتھ تھوڑی سی کشتی بھی لگانا پڑتی ہے۔ جب ایک طرف کا کھلاڑی دوسری طرف جاتا ہے تو اسے دوسرا کھلاڑی مضبوطی سے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چھڑانے کی کوشش کرتا ہے تو ایسے میں اکثر اوقات دونوں کھلاڑی گتھم گتھا بھی ہو جاتے ہیں اور جو کھلاڑی زور آور ہوتا

ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

کبڈی دیہات کے حالات اور ماحول کے مطابق نہایت ہی موزوں کھیل ہے۔ اس میں نہ گراؤنڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ کسی سامان کی۔ کوئی کھیت جس میں کانٹے وغیرہ یا پاؤں اور جسم کو نقصان دینے والی کوئی چیز نہ ہو کبڈی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس میں نہ وقت کی پابندی ہے اور نہ ہی کھلاڑیوں کی تعداد کی قید، لڑکے تھوڑے ہوں تب بھی کھیل سکتے ہیں اور اگر زیادہ ہوں تو بھی کھیل سکتے ہیں۔

کھیت کے درمیان میں مٹی کا ایک نشان بنالیا جاتا ہے یعنی وہاں سے مٹی اونچی کر دیتے ہیں۔ یہ نشان کھیت کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اس نشان کو پالا کہتے ہیں۔ آدھے کھلاڑی اس طرف کھڑے ہو جاتے ہیں اور آدھے کھلاڑی اس طرف۔ دونوں طرف کے کھلاڑی ٹیم بلکہ پارٹی کہلاتے ہیں۔ ایک پارٹی کا ایک کھلاڑی دوسری پارٹی کی طرف کبڈی کبڈی اس طرح کہتا ہوا جاتا ہے کہ دوسرے سن سکیں۔ کبڈی کبڈی منہ میں کہنا قابل قبول نہیں ہوتا۔

کبڈی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک لمبی اور دوسری چھوٹی۔

لمبی کبڈی:

اس کھیل میں کبڈی کبڈی کہنے والا کھلاڑی پالا عبور کر کے دوسری پارٹی کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی ایک کھلاڑی کو جس کو وہ چاہے

چھو لے۔ ایسا کرنے میں اسے دوڑ کر چکر بھی لگانا پڑے تو لگاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ سانس نہ ٹوٹنے پائے۔ وہ چھونے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرے بچنے کی۔ کبڈی کبڈی کہتا ہوا دوسری حدود میں داخل ہونے والا کھلاڑی جسے چھو لیتا ہے تو کہتے ہیں کہ وہ مر گیا ہے۔ یعنی اب وہ کھیلنا بند کر دیتا ہے اور پارٹی میں سے نکل کر بیٹھ جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ پارٹی میں سے ایک آدمی کم ہو گیا۔ اسی طرح سے دوسری طرف سے ایک کھلاڑی کبڈی کبڈی کہتا ہوا پالا پار کر کے مخالف گروپ کی حدود میں داخل ہوتا ہے اور کسی ایک کھلاڑی کو چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر چھو لیتا ہے تو مر جاتا ہے یعنی اس میں یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف کی پارٹی کا ایک کھلاڑی دوسری پارٹی کی حدود میں پالا پار کر کے داخل ہوتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح کبڈی کبڈی کہتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک آدمی کو چھو لیتا ہے۔ اب جس آدمی کو اس نے چھوا ہے اس سے بغیر کسی مدافعت کے صحیح سلامت پالے تک کبڈی کبڈی کہتا ہوا بغیر سانس توڑے واپس پہنچ جاتا ہے تو جس آدمی کو اس نے چھوا تھا وہ مر گیا۔ اور اگر وہ جس کو چھوا ہے آنے والے کو پکڑ کر قابو کر لے اور اسے واپس پالے تک اس وقت تک پہنچنے نہ دے جب تک اس کا سانس نہ ٹوٹ جائے تو آنے والا کھلاڑی مر جاتا ہے۔ اور اگر آنے والے کو مخالف کھلاڑی نے پکڑ لیا ہے اور وہ گھسیٹتا ہوا پالے تک لے آیا ہے یا اس نے پالے کو چھو لیا ہے اور ابھی سانس بھی نہیں ٹوٹا تو جس آدمی کو چھوا تھا وہ مر جاتا ہے۔ اس طرح سے ایک دوسرے پارٹی کے کھلاڑی مرتے رہتے ہیں اور آخر میں جس

پارٹی کے کھلاڑی پہلے ختم ہو جائیں وہ ہار جاتی ہے اور جس کا چا ہے ایک بھی باقی ہو وہ پارٹی جیت جاتی ہے۔

کبڈی بہت سیدھا سادہ کھیل ہے لیکن ورزش کے لحاظ سے دوسرے کھیلوں کے مقابلے میں اس کی افادیت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ خاص طور پر دیہات کے اچھے کھیلوں میں شمار ہوتا ہے اور اب تو شہروں میں بھی اس کا رواج ہوتا جا رہا ہے اور باقاعدہ اس کے قوانین وضع ہو گئے ہیں تا کہ ایک نظم وضبط کے تحت کھیلا جا سکے۔

www.iqbalcyberlibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006

تعطیلات موسم گرما

سکولوں اور کالجوں میں ہر سال موسم گرما کی چھٹیاں ہو جاتی ہیں۔ چھٹیاں تقریباً ڈھائی ماہ کی ہوا کرتی ہیں۔ ان دنوں گرمی کا موسم پورے زوروں پر ہوتا ہے۔ گرمی اس قدر پڑتی ہے کہ پڑھائی نہیں ہوسکتی۔ موسم برسات بھی آ جاتا ہے۔ بارشوں میں بھی سکول جانے میں دقت ہی ہوتی ہے۔ برسات کا موسم ویسے بھی سیر و تفریح کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فطرت انسانی بھی ہے کہ مسلسل کام کرنے سے جب طبیعت اکتا جاتی ہے تو دل چاہتا ہے کہ کچھ فرصت ہو تو آرام کریں یا سیر و تفریح کریں۔ اس لئے سکولوں میں چھٹیاں دی جاتی ہیں۔

حسب معمول اس سال بھی ہمیں موسم گرما کی چھٹیاں جون کے ابتدائی ہفتے میں ہوگئی تھیں۔ چھٹیاں ہونے سے قبل ہی میں نے اور میرے خالہ زاد بھائی منیر نے جو گوجرانوالہ میں میری طرح دسویں جماعت کا طالب علم ہے چھٹیاں گزارنے کا پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں گوجرانوالہ چلا جاؤں۔ لیکن میں نے کہا کہ مجھے گوجرانوالہ آنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن گوجرانوالہ میں کوئی تفریح گاہ نہیں۔ لہٰذا ہمیں کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے جہاں پر آسانی سے تفریح بھی ہو سکے اور پڑھائی کا نقصان بھی نہ ہو۔ پڑھائی کے لئے ہمیں کافی وقت مل جائے۔ میں نے تجویز کیا کہ منیر لاہور آ جائے۔ یہاں پر ہمیں تین سہولتیں میسر آ سکیں گی۔ ایک تو یہ کہ یہاں پر بہت سی تفریح گاہیں ہیں۔ یہاں پر ہر تفریح کے لئے جانا ہمارے لئے آسان ہوگا۔ خرچ بھی دوسری جگہ کی

نسبت کم اٹھے گا۔ دوسرے ہم نے بورڈ کا امتحان دینا ہے جس کے لئے ہم نے پوری تیاری کرنا ہے۔ لاہور میں رہ کر ہمیں کافی وقت مل سکے گا اور تیسری وجہ جو سب سے زیادہ اہم تھی وہ یہ تھی کہ انگریزی ایک ایسا مضمون ہے جس کے لئے ہمیں ٹیوشن رکھنے کی ضرورت تھی اور ہم اگر کسی دوسری شہر میں چلے جاتے تو وہاں پر تو ٹیوشن رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ہماری وہاں کوئی واقفیت نہیں تھی۔ بھلا اجنبی کو کون جانتا ہے۔ انگریزی کی کمی رات کو والد صاحب سے پوری کرلیا کریں گے۔ وہ چونکہ انگریزی میں ایم۔اے ہیں ان سے زیادہ ہمدردی سے اور کون پڑھا سکتا تھا۔ لہٰذا میری تجویز متفقہ طور پر منظور ہوگئی۔

چھٹیاں ہوتے ہی دوسرے روز منیر میرے پاس لاہور آ گیا۔ ہم نے چھٹیاں مندرجہ ذیل پروگرام کے مطابق گزاریں۔ یہ پروگرام ہم دونوں نے صلاح مشورے سے تیار کیا تھا تاکہ پڑھائی بھی ہوتی رہے۔ سکول کا کام بھی ہو جائے اور تفریح بھی۔

ہفتہ میں سات دن ہوتے ہیں۔ ہم نے دو دن جمعہ اور سوموار تفریح کے لئے رکھے۔ اس دن ہم پڑھائی سے مکمل چھٹی کرتے تھے۔ باقی پانچ دن ہم پوری محنت اور یکسوئی سے پڑھتے تھے۔ ہم صبح سویرے اٹھتے اور نماز سے فارغ ہو کر گراؤنڈ میں چلے جاتے۔ یہ گراؤنڈ بھی ہمارے نزدیک ہی ہے چونکہ سمن آباد این ٹائپ میں رہتے ہیں وہاں ہم خوب پھرتے گھومتے اور ہلکی سی ورزش بھی کرتے۔ زیادہ سے زیادہ وہاں ایک گھنٹہ لگتا۔ اس کے بعد ناشتہ کر کے پڑھائی شروع کر دیتے۔

پڑھائی کا ٹائیم ٹیبل بھی ہم نے اس طرح ترتیب دے رکھا تھا کہ ہم آٹھ بجے سے لے کر ایک بجے تک پڑھتے ۔ درمیان میں تقریباً ساڑھے دس بجے امی ہمیں چائے یا کوئی پھل دے دیا کرتی تھیں ۔ اس کے ساتھ ہی تھوڑی سی گپ شپ لگ جاتی تھی ۔ اس طرح ہم آدھ گھنٹہ توقف کیا کرتے تھے ۔ ایک بجے ہم کھانے کے لئے اٹھ بیٹھتے ۔ کھانا کھانے کے بعد ہم ڈھائی بجے تک سو جاتے تھے ۔ ڈھائی سے پانچ بجے تک ہم پھر پڑھتے رہتے اور ساڑھے پانچ بجے نہا دھو کر کھیلنے کے لئے گراؤنڈ میں چلے جاتے ۔ وہاں سے ہم تقریباً سات بجے گھر لوٹتے تھے ۔ گھر آ کر بہن بھائیوں یا امی ابا سے باتیں کرتے رہتے ۔ اتنے میں کھانا تیار ہو جاتا ۔ کھانے سے ہم ساڑے آٹھ بجے فارغ ہو جایا کرتے تھے ۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ گھر میں ادھر ادھر گزارتے اور نو بجے والد صاحب ہمیں لے کر بیٹھ جاتے اور وہ ہمیں دو ڈھائی گھنٹے تک انگلش پڑھاتے رہتے ۔ اس کے بعد ہم سو جاتے ۔ ہم نے سکول کے کام کے لئے وقت مخصوص کر رکھا تھا ۔ ڈھائی بجے سے لے کر پانچ بجے تک ہم سکول کا کام کیا کرتے تھے ۔ ہم اس طرح کام کرتے تھے کہ جو کام مجھے ملا تھا وہ بھی اور جو کام منیر کا تھا وہ بھی ہم اکٹھے ہی کرتے تھے ۔ جب میں اپنا کام کرتا وہ میری طرف متوجہ ہو جاتا کہ میرے سوالات کی مشق اسے بھی ہو جائے اور جب وہ کام کرتا تو میری توجہ بھی اس کی طرف ہوتی ۔ اس طرح اس کے سوالات کی مجھے مشق ہو جاتی ۔ وہ اپنی کاپی استعمال کرتا تھا میں اپنی الگ کاپی استعمال کرتا تھا ۔ باقی مطالعہ ہم مل کر کرتے تھے ۔ یہ تھا ہمارا پڑھائی کا پروگرام ۔

چونکہ جمعہ اور سوموار کا مکمل دن ہم نے تفریح کے لئے رکھا ہوا تھا۔ دس ہفتوں میں سے ہمارے پاس تفریح کے لئے بیس دن نکلتے تھے۔ یہ بیس دن ہم نے اس طرح گزارے۔

ہم نے زیادہ تر لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کی۔ ہم نے سب سے پہلے شاہی مسجد کا پرشکوہ منظر دیکھا۔ خاندان مغلیہ کی شان وشوکت کا زندہ گواہ شاہی قلعہ دیکھا۔ شالامار باغ کا روح پرور شاہکار جو مسلمانوں کا تعمیر کردہ ہے دیکھا۔ ملکہ نور جہاں جو کبھی عہد جہانگیری میں پورے ہندوستان کی ملکہ کہلاتی تھی کا عبرت ناک مزار دیکھا۔ جہانگیر کا مقبرہ جو فن تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہے دیکھا۔ ساتھ ہی آصف جاہ کا مزار دیکھا۔ مینار پاکستان تو مسجد اور قلعہ کے ساتھ ہی دیکھ لیا تھا۔ دوسری عمارتیں یونیورسٹی کیمپس، واپڈا ہاؤس، اسمبلی ہال، الفلاح بلڈنگ، ہائی کورٹ، عجائب گھر اور چڑیا گھر بھی دیکھا۔ اس طرح ہم نے موسم گرما کی چھٹیاں گزاریں۔

سائنس کے کرشمے

عالم کی تخلیق خالق کل نے کی۔ اس میں بے شمار مخلوقات پیدا کیں اور عالم کو خوبصورت بنانے اور انسانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے طرح طرح کی نباتات اور جمادات پیدا کیں۔ اس کی موجودات میں تحقیق و تجسس کے ذریعے ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے انجن، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سامان حرب ایٹم بم وغیرہ ایجاد کرنا اور سیارگان افلاک تک رسائی کرنا یہ سب سائنس کے کرشمے ہیں۔

سائنس کے ذریعے ایسی ایسی ایجادات ہوئی ہیں کہ اگر پندرھویں صدی کا انسان آج زندہ ہو جائے تو دنیا کو پہچان نہیں سکے گا۔ اس نے اپنے زمانے میں بیل گاڑیاں دیکھی تھیں اب ہوائی جہاز ایجاد ہو چکے ہیں۔ وہ چقماق کے ذریعے آگ جلاتا تھا۔ آج بٹن دبانے سے آگ جل جاتی ہے۔ وہ روغن کے دیئے سے روشنی حاصل کرتا تھا۔ آج برقی قمقموں سے دنیا روشن ہوئی پڑی ہے۔ اندرون ملک ہی جانا ہوتا تھا تو بھی مہینوں لگ جاتے تھے۔ آج چند گھنٹوں میں دنیا کے دوسرے سرے تک پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ کر حیران ہوگا کہ انسان چاند پر کس طرح پہنچ گیا ہے۔ وہ تلوار سے لڑتا تھا مگر آج ایسے ایسے بم ایجاد ہو چکے ہیں جو چشم زدن میں دنیا کو تباہ کر سکتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں ہے جو کچھ آج ہے آنے والا انسان ان موجودہ ایجادات کو پرانی اور دقیانوسی سمجھے گا۔ وہ جو جو کچھ ایجاد کرے گا ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔

سائنس کی بدولت ہمارا انداز فکر اور طرز عمل بھی بدل گیا ہے۔ زمانہ قدیم میں انسان جن چیزوں کی پرستش کرتا تھا آج انہیں پیروں تلے روند رہا ہے۔ چاند پر پہنچنے تک اکتفا نہیں کر رہا بلکہ وہ اسے سے بھی آگے نکل کر تسخیر آفتاب کے لئے منصوبے بنا رہا ہے۔ سائنس کے ذریعے انسان دنیا کے ہر حصے تک پہنچ گیا ہے۔ سائنس نے ہر شعبے میں ترقی کی ہے۔ ایسی ایسی مشینری ایجاد ہو چکی ہے جو مہینوں کا کام منٹوں میں سرانجام دے سکتی ہے۔ آج کی نئی اور بڑی دلچسپ ایجاد کمپیوٹر ہے۔ کمپیوٹر سسٹم کے ذریعے گویا مصنوعی انسان بھی بنا لیا گیا ہے جو ایک ملازم کی جگہ کام کرتا ہے۔ حساب کتاب کے معاملے میں بھی کمپیوٹر سسٹم سے بہت سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ اب خودکار مشینیں تیار ہو گئی ہیں جن میں افرادی قوت کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔

شعبہ طب میں بھی سائنس بہت آگے نکل گئی ہے۔ پہلے تپ دق کا علاج کامیاب نہیں تھا اور اسے لاعلاج مرض سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب کہا جاتا ہے کہ تپ دق لاعلاج مرض نہیں بلکہ قابل علاج مرض ہے۔ سائنس کے ذریعے لاعلاج کو شفا مل رہی ہے۔ اندھوں کو آنکھیں بہروں کو کان لنگڑے لولوں کو ٹانگیں مل رہی ہیں۔ سرجری نے حیرت انگیز حد تک ترقی کر لی ہے۔ آج دماغ کا آپریشن بھی ہو سکتا ہے اور دل بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اب سائنس موت کو ختم کرنے کے لئے سوچ رہی ہے۔ خوراک کا مسئلہ بھی زیر غور ہے اور مسلسل تحقیق ہو رہی ہے کہ کوئی ایسی شے ایجاد کر لی جائے کہ انسان خوراک کا محتاج ہی نہ رہے اور کبھی کبھار ایک گولی

کھا لینے سے زندہ رہ سکے۔ یہاں تک سوچا جا رہا ہے کہ آبادی بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ ایسا آلہ ایجاد کیا جائے جسے انسان بغلوں میں لے کر ہوا میں اڑ سکے۔ پہلے زمانے میں سفر کو ایک مصیبت خیال کیا جاتا تھا۔ آج دوری نزدیکی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ آج قافلوں کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس ٹکٹ لو اور گھنٹوں میں امریکہ پہنچ جاؤ۔ کوئی دشواری نہیں۔

سائنس نے ہر جہت میں ترقی کی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بجلی کو ایک مہلک قوت تصور کیا جاتا تھا۔ آج انسان اسی سے مشینری چلا رہا ہے، روشنی حاصل کر رہا ہے اور تفریح کا سامان پیدا کر رہا ہے۔ اس کے ذریعے معلومات عامہ کا حصول بہت آسان ہو گیا ہے۔ اب آپ گھر بیٹھے لندن کی خبر سن سکتے ہیں۔ روزانہ اخبارات کے لئے بیرونی ممالک سے خبریں آتی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر آپ جرمنی میں ہونے والے میچ گھر بیٹھے سکتے ہیں۔ ٹیلیفون کے ذریعے آپ لندن میں بیٹھے اپنے عزیز و اقارب سے یوں بے تکلف گفتگو کر سکتے ہیں جیسے وہ آپ کے سامنے بیٹھے ہوں۔ جس تیزی سے آبادی بڑھ رہی ہے اگر سائنس کے ذریعے زرعی پیداوار میں ترقی نہ ہوتی تو یقیناً خوراک حسب ضرورت میسر نہ آ سکتی۔ زرعی آلات اور کھاد کے ذریعے کاشتکار ایک فصل کی بجائے تین چار فصلیں لینے لگا ہے اور فی ایکڑ پیداوار میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

سائنس بذات خود بری نہیں مگر سائنس دانوں نے ایسی چیزیں بھی تیار کر لی ہیں جو انسان کے لئے مہلک ہیں۔ انہوں نے ایسے ایسے بم ایجاد کر لئے ہیں جو

س قدر تباہ کن ہیں کہ جہاں گرتے ہیں زندگی نام کو نہیں رہتی اور زمین تانبے کی طرح سرخ ہو کر صدیوں تک کے لئے بیکار ہو جاتی ہے۔ اس میں سائنس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ محض انداز فکر کا فرق ہے۔ سائنس کا استعمال کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ سائنسی ترقی کو انسانی فلاح کے لئے استعمال کرتا ہے یا بربادی کے لئے۔ ایک سائنس دان خلق خدا کی بہبود کے لئے کوئی شے ایجاد کرتا ہے۔ دوسرا دنیا کو تباہ کرنے کے لئے بم بناتا ہے۔ کوئی ایٹم سے ملک و ملت کے لئے آسانیاں پیدا کرتا ہے اور تو انائی کو مثبت اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے۔ دوسرا تباہی کے لئے۔ یہ ان لوگوں کا قصور ہے جو منفی انداز فکر رکھتے ہیں اور انسانیت سے پیار نہیں کرتے۔ ان کے دلوں میں خوف خدا نہیں۔ وہ بھول گئے ہیں کہ ایک دن انہوں نے اللہ تعالیٰ جو احکم الحاکمین ہے کے حضور پیش ہونا ہے اور ہر عمل کے لئے جواب دہ ہونا ہے۔

پاکستان میں فنی تعلیم کی ضرورت

ہر دور کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں اور مختلف ضرورتیں ہوتی ہیں۔ موجودہ دور ترقی کا دور ہے۔ اس دور کی سب سے بڑی ضرورت فنی مہارت اور صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم ہے۔ ہر ملک تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ جن ملکوں نے فنی مہارت حاصل کی وہ پہلے ترقی یافتہ ہوئے اور جنہوں نے جتنی دیر بعد اس کی طرف توجہ دی انہوں نے اتنی ہی دیر کے بعد کامیابی حاصل کی۔ کسی ملک میں فنی ماہرین کی تعداد جس قدر زیادہ وہ اسی قدر تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ اس کے برعکس جہاں پر فنی ماہرین کی کمی ہے وہ ترقی کرنے کے لئے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے محتاج ہیں اور ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے ہیں۔ اس سائنسی دور میں فنی ماہرین کے مقابلے میں آرٹس کے ماہرین کی کچھ کم قدر و قیمت نہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال لے لیجئے ایک لوہار جس کے پاس لوہے سے مختلف قسم کے پرزے یا اشیاء بنانے کا فن ہے وہ اس شخص سے کہیں بہتر ہے۔ جس سے بی اے کیا ہو۔ لوہار جہاں جائے گا اسے کام مل جائے گا۔ ہر کارخانے اور ہر صنعتی ادارے میں اس کو معقول تنخواہ پر ملازم رکھ لیا جائے گا۔ اس کے برعکس ایک گریجوایٹ مہینوں درخواستیں دیتا رہے گا۔ اگر وہ بہت ہی خوش قسمت ہے تو اسے کلرکی کی جگہ مل جائے گی۔ اس فن کار لوہار کی ایک ہفتہ کی تنخواہ گریجوایٹ کی ایک ماہ کی تنخواہ سے کہیں زیادہ ہو گئی۔ اگر وہی گریجوایٹ کسی فنی تعلیم کے ادارے سے فنی مہارت حاصل کر کے نکلتا تو اس کی قدر گریجوایشن سے بھی زیادہ ہوتی۔

فنی تعلیم سے ہماری مراد کسی فرد کو کسی خاص شعبے میں پیشہ ورانہ مہارت کی خصوصی تربیت دینا ہے۔ ہنرمند آدمی آسانی سے روزی پیدا کرسکتا ہے۔ وہ ملک وقوم کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ آج ہم مشینی دور سے گزر رہے ہیں۔ جس ملک کے پاس طاقت نہیں اور جس کا دفاع مضبوط نہیں اس کے ساتھ دوسرا ملک جو جی چاہے سلوک کرے اسے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آج کل دفاع اس ملک کا مضبوط ہے جس کے پاس ایٹم بم ہیں۔ میزائل ہیں۔ جنگی طیارے ہیں۔ یہ سب کچھ کون تیار کرتا ہے؟ اسلحہ کے کارخانے بھی انہی لوگوں کے مرہون منت ہوتے ہیں جو اس خاص شعبہ میں دسترس رکھتے ہوں۔ پھر اس اسلحہ کو استعمال بھی وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اسے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ گویا ہر ملک کا سب سے اہم مسئلہ دفاع کا مسئلہ ہے۔ اس میں شروع سے لے کر آخر تک فنی ماہرین کی ضرورت ہے۔ معیشت کا مسئلہ بھی اسی طرح سے ہے۔ زراعت اور صنعت ایسے اہم شعبے ہیں جن پر کسی ملک کا معیشت کا دارومدار ہے۔ زراعت میں وہ ملک ترقی کرتا ہے جو جدید قسم کے زرعی آلات استعمال کرکے پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرتا ہے اور نئے سے نئے سائنسی طریقوں کو اپناتا ہے، قسم قسم کی کھادوں سے فائدہ اٹھاتا ہے، فصل کو بیماریوں سے بچانے کے لئے ادویات کا استعمال کرتا ہے اور یہ صرف وہی کرسکتا ہے جو ان تمام طریقوں سے واقف ہوگا۔ گویا زراعت جو کسی ملک کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے کے لئے بھی فنی مہارت کی ضرورت ہے۔

اب رہی صنعت تو صنعت کسی بھی قسم کی ہو، ایک چھوٹی سی کشتی سے لے کر سمندر میں چلنے والے بڑے سے بڑے جہاز تک تیار کرنے کے لئے فنی ماہرین کی ضرورت ہے۔ کوئی صنعت فنی مہارت کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ملک کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی صنعت کو بڑھائے۔ صنعت کی ترقی کے معنی ہیں کہ اس کی معیشت مضبوط ہے۔ جتنے بھی ترقی یافتہ ممالک ہیں سب نے صنعت کے میدان میں ترقی کی۔ صنعت نے ہی ان کے خزانے سیم وزر سے بھر دیئے۔

یہ مشینی دور ہے۔ ایک ہنرمند آدمی کی ایک ادیب سے زیادہ اہمیت ہے۔ انفرادی طور پر بھی اس کی ترقی کے زیادہ امکانات ہیں۔ ہنرمندی بے روزگاری کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ ہمارے ہر شعبے میں ترقی کی راہ پر چلنے کے لئے فنی ماہرین کی ضرورت ہے۔ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے ہمیں اکثر و بیشتر جدید آلات غیر ممالک سے درآمد کرنا پڑتے ہیں۔ بجلی ہی کو لے لیجئے۔ یہ ہماری زندگی کی اہم ضرورت بن چلی ہے۔ اس سے متعلقہ سامان مثلاً ٹرانسفارمر، میٹر اور تاریں ہمیں باہر سے درآمد کرنا پڑتی ہیں۔ علاوہ ازیں سامان آرام و آسائش جن میں ٹیلیویژن، ریڈیو، کنڈیشنگ پلانٹس، ریفریجریٹر وغیرہ شامل ہیں، کا رواج روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ان چیزوں پر ہمارا کثیر زرمبادلہ خرچ ہوتا ہے۔ اگر ہم یہی چیزیں اپنے ملک میں تیار کریں تو ایک تو ہم اپنا زرمبادلہ بچا سکتے ہیں دوسرے ہم انہیں برآمد کر کے ملک کے لئے کثیر زرمبادلہ کما کر ملک کی معیشت کو بھی مضبوط

بنا سکتے ہیں۔

ہمارے ملک میں فنی اداروں کی بہت کمی ہے۔ جو ادارے ہیں بھی ان میں بہت ہی کم تعداد میں طلباء کو داخلہ ملتا ہے۔ ان کی ورکشاپ یا تجربہ گاہیں جدید آلات سے آراستہ نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان میں تربیت دہندگان کی بھی کمی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں متوسط درجے کا طالب علم ان اداروں کے اخراجات کے بوجھ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہمارے ہاں یہ ضروری ہے کہ فنی تربیت گاہیں بڑی تعداد میں قائم کی جائیں اور ان میں تمام ایسی سہولتیں ہوں جن کے باعث فنی تربیت آسان ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ فنی مہارت حاصل کر کے ملک و قوم کو بام عروج پر لے جائیں۔

ٹیلی ویژن

لفظ ٹیلی ویژن دو الفاظ کا مجموعہ ہے، Tele یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں دور۔ فاصلہ، Vision لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں نظارہ۔ یوں ٹیلیویژن سے مراد وہ آلہ ہوا جس کے زریعے ہم دور بیٹھے بھی نظارہ کر سکتے ہیں۔ آج کل یہ انگریزی کا لفظ بن گیا ہے اور اصطلاح عام میں اسے ٹی وی بھی کہتے ہیں جو ٹیلی ویژن کی مخفف صورت ہے۔

ٹی وی موجودہ دور کی عظیم اور حیران کن ایجاد ہے۔ یہ سائنس کی تحقیق و تجسس کا عمدہ کرشمہ ہے۔ اس کا موجد سکاٹ لینڈ کا ایک سائنسدان ہے جس کا نام جان لوئیگی بیئرڈ ہے۔ ٹی وی کے ذریعے آپ گھر بیٹھے ہی دنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ دنیا کی خبریں سن سکتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے واقعات زمانہ کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ ریڈیو بھی واقعی ایک حیران کن ایجاد ہے مگر ٹی وی اس سے بھی سبقت لے گیا ہے۔ ریڈیو میں تو صرف ہم سن سکتے تھے لیکن ٹی وی پر تصویریں بھی ساتھ آتی ہیں جس سے طبیعت زیادہ محظوظ ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ ہمارے سامنے ہی ہو رہا ہے۔

ٹی وی پر قسم قسم کے پروگرام دکھائے جاتے ہیں۔ فلمیں، خبریں، مشاعرے، گانے، نغمے، نمائشیں، ادبی علمی تقریبات اور کھیلوں کے میچ سب کچھ دکھایا جا رہا ہے۔ کرکٹ کا میچ آسٹریلیا یا انگلینڈ میں ہو رہا ہے اور آپ یہاں بیٹھے کھلاڑیوں کی ایک ایک حرکت کو اچھی طرح سے ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے آپ اسی گراؤنڈ

میں بیٹھے دیکھ رہے ہوں بلکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ٹی وی پر جس قدر صاف اور صحیح دیکھا جا سکتا ہے ویسا صاف تو ٹکٹ خرچ کر کے بھی نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ لاہور سٹیڈیم میں بین الاقوامی شہرت کے مالک جاپانی پہلوان انوکی اور پاکستان پہلوان جھارا کا کشتی کا مقابلہ ہوا تھا۔ میرا ایک دوست لاہور محض اس غرض سے گیا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے وہاں بیٹھ کر دیکھے۔ لیکن جب وہ وہاں سے آیا تو وہ ہم سے سوال کرتا تھا کہ فلاں داؤ انوکی نے کس طرح مارا تھا اور فلاں داؤ کا توڑ جھارے نے کیا کیا تھا۔ وہاں تو دور سے صرف اتنا ہی نظر آ رہا تھا کہ دو پہلوان کشتی لڑ رہے ہیں۔ ان کی حرکات کی باریکیاں دور سے نظر آتی تھیں۔ جب ٹی وی والے سین فلماتے ہیں تو وہ نزدیک ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی تصویریں زیادہ صاف اور ہر حرکت بالکل اسی طرح سے ہوتی ہے جس طرح نزدیک سے دیکھی گئی ہو۔

پاکستان میں ٹی وی کا آغاز ۱۹۶۴ء میں ہوا تھا۔ آج اس کا رواج اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ہر دوسرے گھر میں ٹی وی موجود ہے۔ اب تو رنگین ٹی وی بھی آ گئے ہیں جس رنگ کے لباس میں کوئی مقرر تقریر کر رہا ہو یا جس لباس میں کوئی گا رہا ہو اور جس طرح کے سبزہ زار یا گلستان کا کوئی سین دکھایا جا رہا ہو ٹی وی پر رنگ کی وہی شوخی وہی دمک و چمک اور وہی رعنائی ناظرین دیکھ سکتے ہیں۔ ٹی وی پر تعمیری اور اصلاحی پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں۔ آج کل بہت ڈرامے آ رہے ہیں۔ ملی نغمے جذبہ حب وطن پیدا کرتے ہیں۔ ایک معلوماتی پروگرام ''نیلام گھر'' ہے جو

طارق عزیز پیش کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی اچھا پروگرام ہے، طارق عزیز بذات خود بہت خوبیوں کے مالک ہیں۔ ان کا طرز بیان زبان کا لب ولہجہ انداز گفتگو خوش کن مزاج کا اسلوب اتنا پیارا ہے کہ دیکھنے والوں کو رشک آتا ہے۔ ان کے پروگرام میں معلومات کا خزانہ ہوتا ہے۔ دلچسپی کے لئے گانے، نغمے، لطیفے بہت کچھ ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح سے اور پروگرام بھی آتے رہتے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی حالات کا پتہ روزانہ ٹی وی پر نشر کی گئی خبروں سے چلتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ حالات حاضرہ پر تبصرے بھی ہوتے ہیں جن سے حقیقت حال عیاں ہوتی رہتی ہے۔ تنقیدی پہلو بھی بعض پروگراموں میں پایا جاتا ہے۔ ملک کی بڑی بڑی شخصیتوں کو اس لئے متعارف کرایا جاتا ہے کہ انہوں نے محنت مشقت کے کن کن مرحلوں سے گزر کر یہ مقام حاصل کیا۔ ان کی زندگی کے روشن پہلوؤں سے نوجوان طبقوں کو سبق بھی ملتا ہے۔ دوران انٹرویو ان کے اعلیٰ کردار اور ان کی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ صحت عامہ کے متعلق بھی مشورے نشر کئے جاتے ہیں۔ زراعت کی ترقی کے لئے تو اکثر پروگرام آتے رہتے ہیں۔

ٹی وی سے صرف خواندہ طبقہ ہی فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ ناخواندہ طبقہ بھی اسی طرح ہی فائدہ اٹھاتا ہے۔ بلکہ جو لوگ اخبار و رسائل نہیں پڑھ سکتے انہیں بھی بغیر پڑھے معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ آج کل لوگ میچوں کے نتائج معلوم کرنے کے لئے بہت مستعد رہتے ہیں۔ اب ان پڑھ طبقے کو اس چیز کی احتیاج نہیں رہی کہ وہ کسی پڑھے لکھے سے پوچھیں کہ فلاں میچ کس مرحلے میں ہے بلکہ وہ خود ہی ٹی

وی پر بیٹھ کر اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔

ٹی وی صرف اضافہ معلومات کے لئے ہی مفید نہیں بلکہ سارے دن کی تھکن کے بعد شام کو ہمارے لئے تفریح کا کام بھی دیتا ہے۔ شام کو جو لوگ تفریح کے لئے باہر نکل جاتے تھے آج کل گھر میں بیٹھ کر تفریح کر لیتے ہیں۔ فلم کے رسیا بھی اب اکثر ٹی وی پر ہی اپنی پیاس بجھا لیتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی فلم دیکھنا مقصود ہو جو ٹی وی پر نہیں آ رہی تو وی سی آر استعمال کر کے اپنی پسند کی فلم دیکھ سکتے ہیں۔

جہاں ٹی وی کے بے شمار فائدے ہیں وہاں بلاشبہ کچھ نقصانات بھی ہیں۔ کچے ذہن کا نوجوان طبقہ جب مار دھاڑ، تشدد اور قتل و غارت دیکھتا ہے تو اس کے ذہن پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس میں اسی قسم کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کا ذہن مسموم ہو کر ملک و قوم کے لئے معاشرتی مسئلہ کھڑا کر دیتا ہے۔ اس لئے ٹی وی پر ایسے پروگرام نشر کئے جانے چاہئیں جو اصلاحی اور تعمیری ہوں۔ اس طرح ٹی وی اور بھی زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

ٹیلیفون

لفظ ٹیلیفون دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ Tele یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں دور، فاصلہ Phone بھی یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں آواز۔ تو ٹیلیفون کا مطلب یہ ہوا کہ وہ آلہ جس کے ذریعے ہم دور بیٹھے آواز پہنچا سکتے ہیں۔ مختصراً اسے فون بھی کہتے ہیں۔

جوں جوں انسان کی ضرورتیں بڑھتی گئیں اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ آواز کو بھی دور پہنچانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ آواز کو دور تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کر کے اس سے پیغام رسانی کا کام لیا جا سکے۔ سو انسان نے سائنسی تحقیق سے کام لیا اور مسلسل محنت کی جس کے نتیجے میں ٹیلی فون ایجاد ہوا جس سے انسانوں کو کئی سہولتیں میسر آ گئیں۔ جب سے ٹیلیفون ایجاد ہوا ہے پیغام رسانی کا کام بہت ہی آسان ہو گیا ہے۔ اس سے وقت بھی بچ جاتا ہے۔ خرچ بھی کم ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو جو لاہور میں رہتا ہے کسی ایسے شخص سے بات کرنا ہے جو ملتان میں رہتا ہے۔ اس کے کچھ ایسے مسائل ہیں جو گفتگو سے بھی حل ہو سکتے ہیں تو فون پر بات کر کے اپنا مسئلہ حل کر سکتا ہے جبکہ اگر ٹیلیفون نہ ہو تو وہاں پر جا کر ہی یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے کافی خرچ کرنا پڑے گا اور کم از کم دو دن بھی ضائع ہوں گے اور اگر فون پر بات کی جائے تو کرایہ کی نسبت خرچ بہت کم ہو گا اور دو دن کی بجائے چند منٹ صرف ہوں گے۔

سب سے پہلے فون بڑے بڑے شہروں مثلاً کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور

میں لگے تھے اور اس وقت صرف مقامی طور پر ہی فون کیا جا سکتا تھا۔ اگر کسی دوسرے شہر فون کرنا مقصود ہوتا تو ایکس چینج کے ذریعے کال بک کرنا پڑتی تھی مگر اب چند سالوں سے براہ راست ڈائلنگ سسٹم قائم ہو گیا ہے جس کے ذریعے آپ بڑے بڑے شہروں کے لئے خود ہی اپنے فون پر بیٹھے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس سے ایکس چینج کی محتاجی بھی ختم ہو گئی ہے۔ فون مقامی طور پر بھی پیغام رسانی کے لئے بہت مفید ہے۔ فرض کریں آپ اپنے شہر کے ایک ایسے دوست سے بات کرنا چاہتے ہیں جو آپ سے چار میل کے فاصلے پر رہتا ہے۔ اگر اس کے ہاں بھی فون ہے تو آپ گھر بیٹھے اپنے فون سے یا کسی محلّہ یا بازار کے فون سے اس سے بات کر سکتے ہیں۔ اس طرح آپ کا وقت بھی بچ جائے گا اور پیسے بھی۔ جن لوگوں کے ہاں ٹیلیفون نہیں ہیں ان کے لئے بھی محکمہ ٹیلی فون نے سہولتیں رکھی ہوئی ہیں۔ شہر کے مختلف حصوں میں پبلک کال آفس کھلے ہوئے ہیں جنہیں پی۔ سی۔ او کہا جاتا ہے۔ ان سے آپ پیسے دے کر فون کر سکتے ہیں۔ بعض اوقات غم، خوشی کے پیغامات فوری طور پر پہنچانا ضروری ہوتے ہیں۔ وقت کی قلت بھی ہوتی ہے اس لئے ایسے موقع پر فون بہت ہی کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

کاروباری حضرات یا سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر فون سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کاروباری لوگوں کے پاس وقت بہت کم ہوتا ہے۔ وہ پیسہ خرچ کر کے وقت بچانا زیادہ فائدہ مند سمجھتے ہیں۔ فون پر بیٹھے ہی لاکھوں روپے کے مال خریدے جا رہے ہیں اور فروخت کئے جا رہے ہیں۔ وہ منڈی کے بھاؤ

اوراتار چڑھاؤ فون پر ہی معلوم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح سے افسران اپنے ماتحتوں کو فون پر احکامات اور ہدایات دے دیتے ہیں۔ دیگر حالات و معلومات سے آگاہ رہنے کے لئے بھی فون ان کی بہت مدد کرتا ہے۔

بینکوں سے بذریعہ ڈرافٹ ایک شہر سے دوسرے شہر میں رقم پہنچانے کے لئے بھی فون بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ اگر کسی بیوپاری کو آپ نے لاہور سے رقم بھیجنا ہے جو کراچی میں بیٹھا ہے تو آپ اپنے بنک کو ہدایت دیں گے کہ اتنی رقم آپ کراچی کی فلاں پارٹی کو بذریعہ فون ارسال کر دیں تو بینک والے آپ سے اپنے چارجز وصول کرنے کے علاوہ فون کا خرچہ بھی آپ کے ذمہ ڈال کر رقم بذریعہ فون متعلقہ پارٹی کو بھیج دیتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ پیغام تو بھیجا جا سکتا ہے مگر رقم کیسے چلی جاتی ہے۔ بینک والے کراچی کے کسی اپنے بنک کو جہاں آپ کہیں گے بذریعہ فون ہدایات دے دیتے ہیں کہ فلاں آدمی جس کا اکاؤنٹ نمبر فلاں فلاں ہے، کے کھاتے میں اتنی رقم جمع کر دیں یا اسے دے دیں۔ بینک والے یہ کام بڑے ہی محتاط اور محفوظ طریقے سے کرتے ہیں تاکہ کوئی اور شخص یہ رقم وصول نہ کر لے۔

متحدہ ہندوستان میں ٹیلیفون کی سہولتیں تقریباً پینسٹھ سال قبل میسر آنا شروع ہوئی تھیں۔ لیکن اس وقت صرف بڑے بڑے شہر مثلاً دہلی، لاہور، شملہ وغیرہ میں جہاں جہاں پر برطانیہ کے گورنر جنرل اور دوسرے افسران کے دفاتر یا فوجی مراکز تھے فون لگائے گئے تھے۔ اس کے بعد یہ سہولتیں تاجروں اور امراء کو مل گئیں اور

آہستہ آہستہ شہروں کے علاوہ قصبوں میں بھی جگہ جگہ ٹیلی فون کی سہولتیں مہیا ہوگئیں اور ہر جگہ اس مفید ایجاد سے فائدہ اٹھایا جانے لگا۔ چنانچہ آج یہ حالت ہے کہ شہروں کے علاوہ شاید ہی کوئی قصبہ ایسا ہوگا جہاں اب تک فون کی سہولت پہنچا نہیں دے گئی۔ ان تمام شہروں اور قصبوں کے درمیان کا فاصلہ سمٹ گیا ہے اور ہمارے لئے بے شمار آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ریڈیو

ریڈیو ایک بہت ہی مفید ایجاد ہے۔شہروں میں ٹیلی ویژن ایجاد ہونے سے پہلے اس کی بہت قدر و قیمت سمجھی جاتی تھی لیکن ایسے علاقوں میں جہاں ٹیلی ویژن نہیں پہنچے ریڈیو اب بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔شہروں کے علاوہ ایسے دیہات جہاں پر بجلی ابھی تک نہیں پہنچی، اور ٹیلی ویژن نہیں چل سکتا لوگ ریڈیو سے ہی معلومات حاصل کرتے ہیں۔ گانے سنتے ہیں۔ اسے اپنی تفریح کا سامان سمجھتے ہیں۔ دیہات میں تو اس کا اس قدر رواج ہے کہ کسان ہل بھی چلا رہا ہے اور ہل کے ساتھ ریڈیو بھی باندھ رکھا ہے۔ اسی طرح سے شہروں میں بھی اس کا استعمال بہت زیادہ ہے۔

سب سے پہلے میکس مولر نے برقی لہروں کے متعلق انکشاف کیا۔ اس کے بعد ایڈیسن نے اس پر مزید تحقیق کی اور تجربات کئے۔ اسی زمانے میں ایک اور سائنسدان مارکونی جو ریڈیو پر تجربات کر رہا تھا ریڈیو بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ ابتدائی مراحل میں اس کا دائرہ کار بہت محدود تھا۔لیکن جوں جوں تجربات اور مشاہدات ہوئے اس کے نتائج حوصلہ افزا ہوتے گئے اور وہ دور تک بھی پیغام پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔حتیٰ کہ امریکہ اور انگلینڈ جو ایک دوسرے سے بہت دور ہیں کے درمیان پیغامات پہنچائے گئے۔اس کے بعد بھی اس پر کام ہوتا رہا اور آج دنیا کے ہر گوشے میں ریڈیو ہیں اور دور دراز کے ملکوں کے درمیان پیغام رسائی کامیابی سے ہو رہی ہے۔ ہر ملک کے پروگرام نشر ہو رہے ہیں۔ یہاں بیٹھے

امریکہ کا پروگرام لگالیں۔ انگلینڈ کا لگالیں۔ صاف آواز سنائی دیتی ہے۔

ریڈیو کی ایجاد نے ملکوں کی دوری کو نزدیکی میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ پیغام رسانی کا کام بہت مشکل تھا۔ اندرون ملک پیغام بھیجنے کے لئے گھوڑوں پر سوار کر کے آدمی کو بھیجنا پڑتا تھا۔ اس میں فاصلہ کے اعتبار سے کئی مہینے بھی لگ جاتے ہیں۔ راستے میں صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ بیرونی ملک میں پیغام رسانی کے کام کا اندازہ لگالیں کہ وہ کس قدر مشکل ہوتا تھا آج ریڈیو کی بدولت انگلینڈ میں بات ہو رہی ہے اور اسی وقت آپ پاکستان میں سن سکتے ہیں۔ یہ سائنس کا کمال ہے۔

ریڈیو کے ذریعے تمام دنیا کے حالات کا علم رہتا ہے۔ خبریں سنی جاتی ہیں۔ ہر ملک کے سیاسی حالات سے آگاہی ملتی رہتی ہے۔ ہم صبح اٹھتے ہی خدا کی حمد و ثناء کا پروگرام سنتے ہیں۔ اس کے بعد نعت رسول مقبولؐ سنتے ہیں۔ ہمارا ایمان تازہ ہوتا ہے۔ ریڈیو پر بہت سے اصلاحی پروگرام بھی ہوتے ہیں جن سے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اچھے کام کرنے کی صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ خدمت خلق کا جذبہ تازہ ہوتا ہے۔ ان میں ملی نغمے بھی ہوتے ہیں جو ہمیں حب وطن کے تقاضے یاد دلاتے ہیں۔ دوسرے تفریحی پروگرام بھی لگتے ہیں۔ مزاحیہ پروگرام بھی ہوتے ہیں دوسرے تفریحی پروگرام بھی آتے ہیں۔ کراچی، لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد، کوئٹہ، ملتان، حیدر آباد، پاکستان کے مشہور ریڈیو سٹیشن ہیں۔ پاکستان میں بیٹھ کر ہم انڈیا کے گانے بھی سن سکتے ہیں اور سری نگر کا پروگرام

بھی سن سکتے ہیں۔ جہاں تک ریڈیو کے مفادات کا تعلق ہے وہ بے شمار ہیں۔ جب سے ریڈیو ایجاد ہوا ہے اس نے لوگوں کو معلومات فراہم کرنے میں بہت مدد دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ریڈیو تفریح طبع کا بہت اچھا اور ارزاں سامان بھی ہے۔ اب تو ریڈیو رکھنا بھی بہت آسان ہو گیا ہے۔ اتنے چھوٹے چھوٹے سیٹ نکل آئے ہیں کہ جیب میں ڈال کر پھرتے رہو اور پروگرام سے دل بہلاتے رہو۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

آب دوز کشتی

ملک گیری کی ہوس نے قسم قسم کے ہلاکت خیز آلے ایجاد کروائے ہیں۔ایک زمانہ تھا تلوار اور تیر وتفنگ سے جنگ ہوتی تھی۔ یہ شجاعت کا زمانہ تھا۔پھر ابتدائی مشینی دور شروع ہوا۔ بندوق ہوائی جہاز تیار ہوئے۔ ٹینک بھی ایجاد ہوئے۔ یہاں سے ترقی کر کے اب انسان نے ایٹم بم،میزائل اور اسی قسم کے عجیب و غریب ہتھیار تیار کر لیے ہیں۔

آب دوز کشتی بھی موجودہ زمانے کی عجیب وغریب ایجاد ہے۔اسے تارپیڈو بھی کہتے ہیں۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں۔اس کی شکل مچھلی کے مشابہ ہوتی ہے۔اس قسم کی کشتیاں سب سے پہلے روس نے بحیرہ بالٹک کی جنگ میں استعمال کی تھیں۔اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں جرمنی نے فرانس کے خلاف استعمال کیں۔جرمنی نے اپنی آبدوز کشتیوں کے ذریعے فرانس کی کشتیاں تباہ کی تھیں۔

یہ ایک ایسی کشتی ہے جو جنگ کے دنوں میں دشمن کے بحری جہاز غرق کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ یہ سمندر کے اندر پانی میں چلتی ہیں۔سمندری جنگ لڑنے کے لئے تمام ممالک نے ایسی کشتیاں تیار کروائی ہیں۔۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم میں جرمنی نے انہی آبدوز کشتیوں کے ذریعے اپنے دشمن ممالک کو بہت نقصان پہنچایا۔اس کے بعد ۱۹۳۹ء کی دوسری جنگ عظیم میں بھی برطانیہ نے ان کشتیوں کا خوب استعمال کیا۔ برطانیہ اور جرمنی کی آبدوز کشتیوں نے بھی ایک

دوسرے کا بہت نقصان کیا۔ ان کشتیوں میں گولہ بارود ہوتا ہے۔ یہ چونکہ پانی کے اندر رہوتی ہیں اور اوپر سے نظر نہیں آتیں اس لیے جو جہاز ان کے اوپر سے گزرتا ہے، تارپیڈو یعنی آبدوز کشتیوں کے ذریعے اسے تباہ کر کے غرق کر دیا جاتا ہے۔ لیکن آج کل ایسے انتظامات بھی ہو گئے ہیں جن سے آبدوز کشتی کا آسانی سے پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں جگہ پر ہے۔ لہٰذا آبدوز کشتی کی صنعت نے بھی بہت ترقی کر لی ہے۔ جیسا کہ جنگی ہتھیاروں کے متعلق یہ تو ہوتا ہی ہے کہ ایک ملک ایک ہتھیار بناتا ہے دوسرا اس کا توڑ ایجاد کر لیتا ہے۔ پھر وہ ملک اس ہتھیار کو اور شکل دے کر اس میں کوئی جدت پیدا کر دیتا ہے۔ گویا ایک دوڑ لگی رہتی ہے۔ اسی طرح آبدوزوں کی تیاری میں بھی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ آب دوز کشتی کی بناوٹ عجیب ہوتی ہے۔ اس کے سرے نوکدار، گاؤدم کی شکل کے ہوتے ہیں درمیانی حصہ موٹا ہوتا ہے۔ اوپر کا حصہ ہموار اور چپٹا ہوتا ہے۔ درمیان میں ایک مینار کی شکل کی اونچائی ہوتی ہے۔ اس میں روشن دان لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگلے حصے میں ایک مشین فٹ ہوتی ہے جو اسے چلاتی ہے اس کے پچھلے حصے میں ایک انجن لگا ہوا ہوتا ہے جو گیسولین سے چلتا ہے۔ اس سے الگ ایک کمرہ ہوتا ہے جس میں سامان رکھتے ہیں اور ملاح بھی بیٹھتے ہیں۔ آکسیجن کا ذخیرہ بھی اسی میں ہوتا ہے اور گندی ہوا خارج کرنے کے لیے آلات بھی اسی میں فٹ ہوتے ہیں۔ اس کے اوپری حصے میں ایلومینیم کا ڈھکن ہوتا ہے جو وزن میں بہت ہلکا ہوتا ہے۔ دوسری ایجادات کی طرح آبدوز کشتی نے بھی

خاصی ترقی کر لی ہے۔ اس میں اسے چلانے کے لیے عملہ بیٹھتا ہے جو اسے اپنی منشا کے مطابق ہر طرف موڑ سکتا ہے۔ اس میں سانس لینے کے لیے ایسے آلات نصب ہوتے ہیں جو سانس کی آمد و رفت کے لئے ہوتے ہیں۔ عام حالات میں یہ پانی کے اوپر چلتی ہیں اور جب جنگ کا زمانہ ہو اور دشمن کو نقصان پہنچانا مقصود ہو تو پانی کی سطح سے نیچے چلی جاتی ہیں اور وہاں سے دشمن کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ اس سے دشمن کے جہاز میں سوراخ کر کے غرق کر دیا جاتا ہے۔ ان کشتیوں میں بجلی کا سامان بھی ہوتا ہے۔ بجلی کے ذریعے جنگی جہاز سے ٹکراتی ہے۔ اس کے ٹکراتے ہی اس کا بارود دوسرے جہاز کو تباہ کر دیتا ہے، جس سے وہ غرق ہو جاتا ہے۔

جس وقت آب دوز کشتی پانی کی سطح کے اوپر ہوتی ہے اسے انجن چلاتا ہے اور جب یہ پانی کی سطح سے نیچے ہوتی ہے تو یہ بجلی سے چلتی ہے۔ اس کشتی میں بیس ملاحوں کے کام کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس میں ایک آلہ فٹ ہوتا ہے۔ جس کو پیری سکوپ کہتے ہیں۔ ملاح اس آلے کے ذریعے پانی کی سطح کے حالات سے باخبر رہتے ہیں۔ پیری سکوپ کا دائرہ کار تیس میل تک ہوتا ہے۔ آبدوز کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ اس کا ایک سرا پانی سے باہر رہتا ہے جہاں سے گندی ہوا خارج ہوتی رہتی ہے۔

آج کل تو ایک ایسی آبدوز کشتی بھی بن گئی ہے جو بجلی کی بجائے بھاپ سے چلتی ہے۔ یہ امریکہ نے تیار کی ہے۔ یہ کشتیاں زیادہ دیر تک پانی کے اندر رہ سکتی ہیں۔ ہر ملک نے آب دوز کشتیوں کے نئے نئے ڈیزائن نکالے ہوئے ہیں۔

نئے نئے ڈیزائنوں سے آبدوزوں کی کارکردگی میں بھی فرق پڑتا ہے۔ امن کے زمانے میں آبدوز کشتی کسی کام نہیں آتی۔ یہ صرف زمانہ جنگ ہی میں تباہی مچاتی ہیں۔ یہ بہت ہی خطرناک قسم کا آلہ ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

عید الفطر

رمضان المبارک کے مقدس مہینے کے اختتام کے بعد اگلے دن عید الفطر کا دن ہوتا ہے۔ ماہ رمضان کیا ہے؟ کس لیے آتا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لئے نیکی کرنے کا مہینہ مقرر کیا ہے۔ ویسے تو ہر لمحہ احکام الٰہی پر عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے، لیکن ماہ رمضان ایک ایسا مہینہ ہے، جس میں رحمت الٰہی کا خاص نزول ہوتا ہے۔ خود خدا کہتا ہے کہ آؤ جس کا جی چاہے جھولیاں بھر لو۔ اسے مت ضائع کرو۔ یہ مہینہ سال کے بعد آئے گا اس وقت تمہیں دوبارہ موقع ملے نہ ملے۔ سارا مہینہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے سحری سے لے کر افطار تک نہ کچھ کھانا نہ پینا اور نہ نظر سے نہ دل سے، نہ نفس سے، نہ کان سے، نہ قدم سے، نہ ہاتھ سے کوئی غلط کام کرنا۔ روزے کا مطلب محض یہ نہیں کہ مسلاام کھانا پینا بند کر دے بلکہ یہ ہے کہ وہ کوئی بھی غلط کام نہ کرے چاہے اس کا تعلق محض نظر سے ہو اور کوئی بھی برائی یا گناہ نہ کرے چاہے اس کا تعلق انسانی جسم کے کسی بھی حصے کے ساتھ ہو۔ گویا ہر برائی کا دروازہ اپنے لئے بند کر لے۔ اتنی بڑی ذمہ داری نبھانے کے بعد جو خوشی کا دن آتا ہے اسے عید الفطر کہتے ہیں۔

اسے عید کا دن یعنی خوشی کا دن کہتے ہیں۔ کیا یہ صرف ایک مسلمان کی خوشی کا دن ہے؟ نہیں، یہ سب مسلمانوں کے لیے اجتماعی خوشی کا دن ہے۔ غریب ہو یا امیر بوڑھا ہو یا جوان مرد ہو یا عورت، یتیم ہو یا مسکین اپاہج ہو یا ضرورت مند تندرست ہو یا بیمار خوشی سب نے منانی ہے۔ دریا کے کنارے دس آدمیوں کو کھڑا

کر کے کہا جائے کہ تم نے دریا پار کرنا ہے اور ضرور کرنا ہے۔ تم میں دو ایسے شخص بھی ہیں جن کے پاس کرایہ نہیں ہے۔ ایک ایسا بھی ہے جو اپاہج ہے تو اس حکم کو نبھانے کے لئے ذمہ داری سات آدمیوں پر ہوتی ہے۔ جن کے پاس پیسے ہیں اور تندرستی ہے۔ یہ ان کے ذمے ہے کہ ان تین آدمیوں کو کرایہ اپنی گرہ سے دیں اور جو اپاہج ہے اسے اپنے کندھوں پر بٹھا کر کشتی میں سوار کریں اور اگر نہیں کیا جاتا تو یقیناً نافرمانی ہوگی اور حکم کی تعمیل نہ کرنے کی صورت میں سزا ہے۔ بس یہی سمجھ لیں۔ عید کا دن ہے۔ خوشی سب نے منانی ہے۔ جن کے پاس دولت ہے یا جس کے پاس دولت نہیں ہے۔ ضرورت مند ہیں یتیم و مسکین ہیں بیوائیں ہیں، تو ان لوگوں کی خوشی کے وہ لوگ ذمہ دار ہیں جو صاحب ثروت ہیں، مالدار ہیں۔ جن کو خدا نے مال اس لیے دیا ہے کہ وہ ان پر بھی خرچ کریں جن کا ان پر حق ہے۔ تو سوچئے کہ ایک آدمی جو ایک ماہ پورا عبادت خداوندی میں مصروف رہتا ہے اور ہر قسم کے گناہ سے باز رہتا ہے اور اگلے دن خدا کے حضور پیش ہوتا ہے۔ اپنی اس محنت کا جو اس نے کی صلہ لینے کے لیے تو اس وقت رحمتیں اس پر برستی ہیں جو فرمانبرداری کے زمرے میں آئے گا اور جو نافرمان ہوگا اس کے لئے رحمتیں نہیں عذاب الٰہی ہوگا۔ اگر یہ حکم ہے کہ نماز مسجد میں پڑھنا افضل ہے تو کیوں ہے؟ گھر پر بھی اتنی رکعتیں مسجد میں بھی اتنی رکعتیں، تو اس کی افضلیت کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہاں پہنچ کر صرف تمہارے ذمہ فریضہ نماز ہی نہیں بلکہ تم نے یہ بھی دیکھنا ہے کہ فلاں نمازی روزانہ آتا تھا آج نہیں آیا، کیوں نہیں آیا یہ معلوم کرنا تمہارا ذمہ ہے

اور وجہ معلوم ہونے پر اگر کوئی ایسی وجہ ہے جس کو تم رفع کر سکتے ہو تو تم پر فرض ہو جاتا ہے کہ تم اس کی جان و مال سے مدد کرو۔ اس کی غمگساری کرو۔ خداوند تعالیٰ نے جو احکام انسانوں کو دیئے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے۔ اس کے حکم میں حکمت بھی ہوتی ہے اور فائدہ بھی ہمارا اپنا ہوتا ہے۔ اس کا نہیں۔ غنوہ ''صمد'' ہے جس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

عید کے دن صبح اٹھتے ہی لوگ نئے کپڑے پہنتے ہیں۔ سویاں یا کوئی اور میٹھی چیز تیار کر کے کھاتے ہیں۔ اس کے بعد خدا کے حضور نماز عید کے لیے حاضر ہوتے ہیں کہ خداوند ہم نے تیرے حکم کے مطابق احترام رمضان کو ملحوظ رکھا۔ تیرا شکر ہے۔ آئندہ بھی تو ہمیں نیکی کی توفیق دے۔ ہمارے گناہ معاف کر۔ ہمیں دولت دین و دنیا کی نعمتوں سے سرفراز فرما۔

بچے رنگ برنگ کے لباس زیب تن کر کے غبارے ہاتھوں میں پکڑ کر گھومنے لگ جاتے ہیں۔ کچھ عید کے میلے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ کچھ سیر و تفریح کے لئے نکل جاتے ہیں۔ گویا ہر آدمی خوش ہے۔ کوئی بوتلیں پی رہا ہے اور اپنے دوستوں کو بھی پلا رہا ہے۔ کسی نے ٹیپ لگا رکھی ہے کوئی گانے سن رہا ہے۔ کوئی فلم دیکھنے کی تیاری میں مصروف ہے۔ کوئی کباب اور کوئی تکے کھا رہا ہے۔ گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بہار آئی ہوئی ہے۔ کھانے پینے کی دوکانوں کے آگے خوش رنگ سائبان لگے ہوئے ہیں۔ لوگوں نے جھنڈیوں سے دوکانوں کو خوب سجایا ہوا ہے۔ گویا جس طرف دیکھو خوشی کا سماں ہے۔

عید الاضحیٰ

عید الفطر کے دو ماہ دس دن بعد آتی ہے۔عید الفطر ماہ رمضان کے مقدس مہینہ کے بعد آتی ہے۔رمضان میں مسلمان ایک ماہ روزے رکھتے ہیں اور شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔اسی سعادت و اطاعت کی خوشی میں وہ عید مناتے ہیں۔عید الاضحیٰ سے ہماری تاریخ کا ایک ایسا واقعہ وابستہ ہے جو اطاعت کی اعلیٰ و ارفع مثال پیش کرتا ہے۔یہ واقعہ سننے سے مسلمان کے ایمان کی پختگی کی تجدید ہو جاتی ہے۔واقعہ یوں ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور ان کے ایک لخت جگر جن کا جان حضرت اسماعیلؑ تھا بھی پیغمبر ہی تھے مگر ابھی بچپن میں ہی تھے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا جس میں انہیں کہا گیا کہ اپنی سب سے قیمتی چیز کو خدا کی راہ میں قربان کر دو۔اونٹ اس وقت مال و دولت میں شمار ہوتے تھے اور بہت قیمتی چیز تصور کئے جاتے تھے۔لہٰذا آپ نے بہت سے اونٹ قربان کر ڈالے۔پھر انہوں نے یہی خواب دیکھا جس میں ان سے کہا گیا کہ سب سے قیمتی چیز کو خدا کی راہ میں قربان کر دو۔انہوں نے پھر بہت سا مال و متاع خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔مگر پھر بھی انہیں وہی خواب آیا۔لہٰذا آپ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ میں نے اپنا مال و متاع قربان کر دیا ہے لیکن ابھی مزید قربانی مطلوب ہے۔سب سے زیادہ قیمتی اور پیاری چیز میرے پاس سوائے میرے لخت جگر حضرت اسماعیلؑ کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔اس خواب کا ذکر آپ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ سے کیا۔کہنے لگے ابا

جان خدا کے حکم اور آپ کی خواہش ک لئے میری جان بھی حاضر ہے۔آپ اللہ تعالی کے اس حکم کی تعمیل میں تاخیر نہ کریں مجھے آپ اس امتحان میں ثابت قدم پائیں گے۔

حضرت اسماعیلؑ کے دل میں شیطان نے بہت سے وسوسے ڈالنے کی کوشش بھی کی مگران کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔ بلکہ انہوں نے باپ سے عرض کیا کہ ابا جان ہم دونوں کو آنکھوں پر پٹیاں باندھ لینا چاہئیں تا کہ پدری شفقت اس فریضہ کی ادائیگی میں حائل نہ ہو جائے۔اللہ تعالی کو صرف اپنے پیغمبر ابراہیمؑ کا امتحان مقصود تھا۔حکم دیا کہ چھری چلنے سے پہلے حضرت اسماعیلؑ کی جگہ دنبہ پہنچ جائے۔ان کا ایک رونگٹا بھی نہ کٹنے پائے۔حضرت جبرائیلؑ نے حکم کی تعمیل کی اور ان کی جگہ دنبہ ذبح ہو گیا۔

یہ واقعہ فرمانبرداری اور اطاعت کا ایسا منظر پیش کرتا ہے جس کی مثال تاریخ عالم نہ اب تک پیش کرسکی ہے اور نہ کر سکے گی۔یہی وجہ ہے کہ اس عظیم قربانی کی یاد تازہ کرنے کے لئے مسلمانوں پر عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی دینا سنت ابراہیمؑ قرار دے دیا گیا ہے۔اسی لیے اس عید کو عید قربان بھی کہا جاتا ہے۔اللہ تعالی کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ اس عمل کو ہر سال دہرانے کا حکم صادر فرمایا۔لہٰذا ہر صاحب ثروت مسلمان کا فرض ہے کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی دے۔

سب سے زیادہ افضل قربانی دنبے کی ہے۔ویسے تو بکرا،اونٹ،گائے،بیل

بھی جائز ہے بلکہ لوگوں کی سہولت کے لیے گائے بیل اونٹ میں سات افراد تک شامل ہو سکتے ہیں یعنی اونٹ یا گائے کی قربانی سات افراد مل کر دے سکتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی قربانی دی جا سکتی ہے۔

قربانی میں اطاعت خداوندی کا سبق بھی ملتا ہے اور قربانی کرنے کے بعد جب اس کا ایک تہائی گوشت یتیموں، مسکینوں اور غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں تو اس میں خیرات کا پہلو بھی ہے۔ اس طرح مزید خوشنودی خداوند کریم حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح سے ایک تہائی حصہ اپنے دوستوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور بقایا اپنے لیے۔ اس طرح سے ضرورت مندوں اور عزیزوں کے حقوق کا احساس ہوتا ہے تاکہ سب عید کی خوشی میں شامل ہو جائیں۔ یوں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تکمیل ہوتی ہے۔ مگر آج مسلمان اصل مقصد سے ہٹ گئے ہیں اور قربانی بھی اکثر دکھاوے کے لیے اور ایک رسم سمجھ کر دیتے ہیں۔ وہ یہ بھول گئے ہیں کہ اس میں یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کا حق بھی شامل ہے۔ قیمتی سے قیمتی جانور لے کر ذبح کرتے ہیں اور لوگوں کو اپنی امارت دکھانے کی خاطر گوشت ایسی جگہوں پر بھیجتے ہیں جہاں سے تحسین و تعریف کی امید ہوتی ہے۔

قربانی کا اصل منشاء اطاعت خداوندی اور لوگوں سے پیار محبت کا جذبہ پیدا کرنا ہے جسے ہم یکسر بھول چکے ہیں۔ اس عمل سے ہم میں ایثار و قربانی کا جوہر پیدا کرنا مقصود تھا جس میں صرف خلوص ہی خلوص ہو، کسی بھی طرح دکھاوے کا کوئی پہلو نہ ہو۔ مگر اب تو قربانی صرف اور صرف نمائش بن کر رہ گئی ہے۔ قوموں کی

ترقی کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگر یہی مفقود ہو جائے تو قومیں تنزل پذیر ہو جاتی ہیں۔ ہر سال عید الاضحیٰ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ محض گوشت کھا لینے سے عید کا مقصد پورا نہیں ہوتا بلکہ یہ مقصد دلوں میں ایک دوسرے کے لیے خلوص اور جذبہ قربانی پیدا کرنے سے ہوتا ہے۔ گویا عید الاضحیٰ منانے کا مقصد محدود نہیں، غیر محدود ہے اور مقصود وقتی طور پر قربانی، ایثار اور خلوص کا مظاہرہ کرنا نہیں، بلکہ بعد میں سارا سال قدم قدم پر قربانی ایثار اور خلوص کا مظاہرہ کرنا ہے۔

یوم عاشورہ

یوم عاشورہ کو محرم کا دن بھی کہتے ہیں۔ محرم کا نام آتے ہی ذہن میں واقعہ کربلا آ جاتا ہے۔ غم حسینؓ دل کو تڑپانے لگ جاتا ہے اور دلوں کو مظلوم کی ہمدردی پر ابھارتا ہے۔ ہمیں وہ غریب الوطن حسینؓ یاد آ جاتے ہیں جنہوں نے حق کی خاطر سر کٹانا تو گوارا کر لیا لیکن باطل کے آگے جھکنا پسند نہ کیا اور حق کا بول بالا کیا۔ انہوں نے اپنی اور اپنے سارے خاندان کی جانوں کی پروانہ کی اور اپنے خون سے شجر اسلام کی آبیاری کر کے انسانیت کا سر فخر سے اونچا کر دیا۔

محرم الحرام کے دن فخر انسانیت اور جگر گوشہ رسولؐ کو اس لیے شہید کر دیا گیا تھا کہ اس نے باطل کے آگے حق کا پرچم نگوں نہ ہونے دیا۔ پوری انسانیت کے لیے سبق چھوڑا کہ اگر حق کی خاطر اپنے سارے کنبے سمیت سر بھی دینا پڑے تو دریغ نہ کرنا۔ داستان حسینؓ انسانی سرفرازی اور سربلندی کی داستان ہے۔ وہ ایسا چراغ ہے کہ مظلوم جب حق کی پاسبانی کے لیے باطل کے نرغے میں گھر جائے تو یہی رہنمائی کرتا ہے جب دولت و فرعونیت حق پرستوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیتی ہے، جب شیطانیت حق سے ہٹا کر باطل کی طرف رغبت دلاتی ہے اور ناکامیوں سے بوکھلا کر انسان حق پر باطل ہونے کا شبہ کرنے لگتا ہے تو اس وقت حسینؓ کی یاد اسے حوصلہ عطا کرتی ہے۔ جب سیم و زر کی جھلکیاں ایمان کو کمزور کرنے لگتی ہیں تو مثال حسینؓ ہی اسے ثابت قدم رکھتی ہے۔ جب ایک طرف دنیوی کامیابی و کامرانی ہو اور دولت و اقتدار ہو اور دوسری طرف وفائے حق ہو تو فاقہ مستی میں بھی حرص و ہوا

کابت پاش پاش کر دیا جاتا ہے اور یہی تقلید حسینؓ ہے۔

یوم عاشورا اپنے اندر ہمارے لئے ایسا علیٰ وارفع سبق لیے ہوئے ہے جس میں معراج انسانیت پنہاں ہے۔ حق پرستی کے عزائم نظر آتے ہیں۔ بردباری اور مستقل مزاجی صبر و تحمل کی اعلیٰ اقدار کا درس ملتا ہے۔ انہی اقدار کو پھر سے تازہ کرنے کے لئے یوم عاشورہ منایا جاتا ہے۔ واقعہ کربلا اس قدر کرب و بلا اور مصائب سے پر ہے جسے سن کر پتھر سے پتھر دل بھی رو پڑتا ہے۔

یزید ملعون باطل کی طاقت سے تخت اقتدار پر متمکن ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ نواسہ رسولؐ میری بیعت کر کے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دیں۔ لیکن یہ اس کی کج فہمی تھی۔ وہ حکومت کے نشہ میں چور تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح حسینؓ کی بیعت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ امام عالی مقام کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا اور کربلا کے ریگزار میں گھیر لیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ یا بیعت یزید قبول کر لو یا اپنا سر نیزے کی نوک پر چڑھوا لو۔ معصوم شیر خوار بچے کو بھی تمہاری گود میں بے دردی سے قتل کر دیا جائے گا۔ تمہارے بعد تمہارے خیمے جلا دیے جائیں گے۔ بیبیوں کی بے حرمتی کی جائے گی۔ تمہارے خاندان کا نام و نشان مٹا دیا جائے گا مگر نواسہ رسولؐ اس قدر پختہ عزم رکھتے تھے کہ انہوں نے یہ سب کچھ قبول کر لیا مگر باطل کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے عارف اجمیری نے کہا ہے۔

شاہ ہست حسینؓ پادشاہ ہست حسینؓ

دین ہست حسینؓ پناہ ہست حسینؓ

سر داد نہ داد دست در دست یزید

حقا کہ بنائے لا الا ہست حسینؓ

دسویں محرم کو یزیدی لشکر اپنی پوری طاغوتی طاقتوں کو لے کر کربلا کے میدان میں آ گیا اور اس ماہ صداقت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ آپ کے عزیز و اقارب آپ کی آنکھوں کے سامنے شہید کر دیئے مگر آپ کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔

اسی واقعہ کی یاد میں محرم منایا جاتا ہے۔ ہر مسلمان اپنے اپنے عقیدے اور طریقے سے حضرت امام حسینؓ کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ امام باڑوں میں یکم سے لے کر نویں تاریخ تک بعد از نماز عشاء روزانہ فضائل و مصائب کا ذکر کرتے ہیں۔ دسویں محرم کو صبح شبیہ روضہ امام عالی مقام (تعزیہ) نکالتے ہیں۔ ایسا اکثر بڑے شہروں اور قصبوں میں ہوتا ہے۔ دور دراز سے لوگ تعزیہ دیکھنے کے لئے آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس قدر رش ہوتا ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ لوگ سڑکوں بازاروں گلی کوچوں میں چیونٹیوں کی طرح جمع ہوئے ہوتے ہیں۔ چھتوں پر عورتیں اور بچے زیارت کے لئے بیٹھے ہوتے ہیں۔ تعزیہ امام باڑہ سے نکل کر بازار میں آ جاتا ہے۔ اس کے آگے ماتمی حلقہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ غم حسینؓ میں ماتم کرتے ہیں اور ساتھ ہی یا حسینؓ یا حسینؓ کہتے ہیں۔ کچھ لوگ زنجیروں سے ماتم کرتا ہیں۔ زنجیروں کا ایک گچھا ہوتا ہے جن کے سروں پر چھوٹے چھوٹے چاقو اور

چھریاں لگائی ہوتی ہیں۔ جب یہ چھریاں اپنے سینے یا کمر پر مارتے ہیں تو لہو کے فوارے نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سے یہ جلوس سارے شہر کا چکر لگاتا ہے۔ راستے میں لوگوں نے پانی کی سبیلیں بھی لگائی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ بہت سا کھانا پکا کر لے آتے ہیں اور لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ کچھ لوگ پیاسوں کو شربت پلاتے ہیں۔ گویا اس طرح سے مسلمان یادِ حسینؓ مناتے ہیں اور اس فخر انسانیت کے سبق کا اعادہ کرتے ہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

۶ ستمبر

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء وہ دن ہے جب بھارت نے تمام بین الاقوامی اصولوں اور اخلاقی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر بزدلانہ عیاری اور مکاری کا شرمناک مظاہرہ کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں ہمارے جیالوں اور روشنیوں کے شہر لاہور پر چوروں کی طرح حملہ کر دیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب متحدہ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوا اور سلطنت خداداد پاکستان معرض وجود میں آئی تو ہندوستانی ریاستوں کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ بھارت یا پاکستان جس کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔ اپنے اسی حق کا استعمال کرتے ہوئے ریاست جموں اور کشمیر کے عوام نے جن میں پچانوے فیصد مسلمان ہیں پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ مگر بھارتی ذہنیت اس قدر گندی اور گری ہوئی ہے کہ ضد میں دو اور دو چار ماننے کو بھی تیار نہیں ہوتی اور شرافت کی زبان نہیں سمجھتی۔ اس پر کشمیری عوام نے بھارت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ تھوڑی سی مدت میں انہوں نے موجودہ آزاد کشمیر کا علاقہ بھارت سے واپس لے لیا۔ بھارت نے نہایت چالاکی کا مظاہرہ کیا اور ہوشیاری یہ دکھائی کہ خود اقوام متحدہ کی طرف رجوع کیا۔ اس وقت کے وزیراعظم نہرو نے اس وعدے پر جنگ بند کروائی کہ رائے شماری کے ذریعے کشمیری عوام جس سے بھی الحاق کرنا پسند کریں۔ بھارت اور پاکستان دونوں کے لئے ان کا فیصلہ قابل قبول ہوگا۔ یہ ایک اصولی بات تھی کہ جب مسئلہ بغیر جنگ کے حل ہو سکتا ہے تو جنگ بند کر دینا ہی

بہتر ہے۔اس لیے انہوں نے مجاہدین کشمیر کو کہا کہ رائے شماری کے لیے جنگ کا بند کرنا ناگزیر ہے یہ قرارداد اقوام متحدہ کے اجلاس میں پاس ہوئی جس کے فیصلے کا احترام ساری دنیا کے ملکوں کے لئے لازمی ہے۔ بھارت نے لیت ولعل کرتے کرتے اٹھارہ سال گزار دیے۔کشمیری حریت پسندوں کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ۸ اگست ۱۹۶۵ء کو مجاہدین کشمیر نے اعلان جہاد کر دیا۔انہوں نے ایک خفیہ ریڈیو اسٹیشن قائم کر کے صدائے کشمیر کے نام سے آزادی کے ترانے نشر کرنے شروع کر دیئے۔انہوں نے باقاعدہ انقلابی کونسل کے قیام کا اعلان بھی کر دیا۔

۹ اگست ۱۹۶۵ء کو انقلابی کونسل نے اسی ریڈیو اسٹیشن کے ذریعے عوام کو تلقین کی کہ وہ بھارتی حکومت کو کسی قسم کا ٹیکس وغیرہ ادا نہ کریں۔یہ بھارت کے خلاف کھلم کھلا اعلان جنگ کے مترادف تھا۔مجاہدین کی سرگرمیاں زور پکڑ گئیں۔ انہوں نے ایسا بھرپور حملہ کیا کہ بھارت کا نقصان ہوا۔مجاہدین نے سری نگر جموں روڈ بھی اڑا دی جس کے نتیجہ میں ریاست کے دوسرے علاقے ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے اور بھارتی حکومت بوکھلا اٹھی۔

بھارت نے دیکھا کہ مجاہدین اگر اسی طرح سے کامیاب ہوتے رہے تو بہت جلد ریاست کا سارا مقبوضہ علاقہ آزاد کرا لیں گے۔اب تک کشمیری مجاہدین تین چوکیوں پر قبضہ کر چکے تھے۔انہوں نے صدائے کشمیر کے ذریعے پاکستان سے مجاہدین کی مدد کرنے کی اپیل کی۔بھارت نے روایتی مکارانہ اور عیارانہ چال چلنے کا منصوبہ تیار کیا اور ۶ ستمبر کی رات کو اچانک لاہور پر حملہ کر دیا۔کوئی مہذب ذہن یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ

اس دور میں بھی بغیر کسی جواز اور بغیر کسی اعلان جنگ کے کوئی ملک کسی دوسرے ملک کی بین الاقوامی سرحد پار کر سکتا ہے مگر بھارت نے بری ڈھٹائی سے ایسا کر دکھایا۔ اس نے توپوں اور ٹینکوں سے مسلح ہو کر روشنیوں کے شہر لاہور پر رات کی تاریکی میں حملہ کر دیا اور بزدل حملہ آور کی طرح بھارتی افواج نے شہر لاہور کی پشت میں خنجر گھونپ دیا۔ علاوہ ازیں اور بھی بہت سے محاذ کھول کر بھارتی فوجیں پاکستان کی حدود میں داخل ہو گئیں۔

پاکستان کے اس وقت کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں نے ۶ ستمبر کی صبح کو اعلان جہاد ان تاریخی الفاظ سے کیا "بھارت یہ بھول گیا کہ اس نے لا الہ الا اللہ پڑھنے والوں کو للکارا ہے جو انشاءاللہ اس کا دندان شکن جواب دیں گے"..... اور ایسا ہی ہوا۔ بھارتی افواج شہر لاہور کے نواح میں داخل ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ بی بی سی نے اعلان کر دیا تھا کہ بھارتی افواج نے پاکستان کے شہر لاہور پر قبضہ کر لیا ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ پاکستان فوج کے بہادر جوانوں نے اسی دن انہیں مار بھگایا۔ اور ہمارے پاکستانی شاہین ایسے بپھرے کہ پٹھان کوٹ کے ہوائی اڈے پر کھڑے بائیس بھارتی طیاروں کو تباہ کر دیا۔ اس کے بدلے بھارتی طیاروں نے وزیر آباد کے اسٹیشن پر کھڑی دو مسافر ٹرینوں پر حملہ کر کے بہت سا جانی نقصان کیا۔ اسی طرح سے بہت سی جگہوں پر بھی بزدلانہ حملے کئے لیکن ہمارے بہادر نوجوانوں نے بڑی جرات اور ہمت سے ان کے حملے پسپا کر دیئے۔

ہمارے بہت سے مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا جن میں میجر عزیز بھٹی سر فہرست ہیں۔ میجر خادم حسین اور لیفٹیننٹ افتخار نے قصور، ہڈیارہ اور واہگہ کے محاذوں پر بہادری کے جوہر دکھائے۔

جلسہ تقسیم انعامات

یوں تو ہمارے سکول میں ہر سال ہی جلسہ تقسیم انعامات منعقد ہوتا ہے مگر اس کا یہ جلسہ بڑے جوش وخروش سے اور خاص اہتمام سے منایا گیا کیونکہ اس سال جلسے کی صدارت جناب وزیر تعلیم نے فرمائی تھی۔ معززین شہر کے علاوہ محکمہ تعلیم کے بہت سے افسران اور انتظامیہ کے مقامی افسران نے بھی شرکت کی۔ جلسہ کے انعقاد کی تاریخ ایک ماہ قبل ہی مقرر ہوگئی تھی اور اسی دن جلسے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ ڈرل، رائفل پریڈ، سکاؤٹنگ اور ڈرامے کی مشق بڑی مستعدی سے ہوتی رہی۔ جمناسٹک اور اے آر پی کا مظاہرہ بھی پروگرام میں شامل تھا۔ جن طلبا نے تقریروں اور نظموں اور مکالموں میں حصہ لینا تھا وہ بھی پوری طرح سے تیاری میں مصروف رہے۔ سکول کا ہر فرد اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔

مقررہ تاریخ سے دو روز پہلے سے ہی سکول کو دلہن کی طرح سجانا شروع کر دیا تھا۔ صفائی خاص طور پر کرائی گئی تھی۔ جس روز جلسہ ہونا تھا اس روز صبح سے مختلف قسم کے ماٹو زآویزاں کر دیئے گئے تھے۔ بیرونی دروازے سے جلسہ گاہ تک دونوں طرف رنگ برنگی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ جا بجا محرابیں بنائی ہوئی تھیں۔ اس کے نیچے کرسیاں لگائی ہوئی تھیں۔ طلباء کے لئے زمین پر دریوں کا فرش بچھایا ہوا تھا۔ ہر طرف رونق ہی رونق نظر آ رہی تھی۔ سکاؤٹ بھی خاکی وردی پہلے اپنی ڈیوٹی سنبھالے ہوئے تھے۔

جلسے کی کاروائی دس بجے شروع ہونا تھی۔ پروگرام کے مطابق ٹھیک دو بجے جناب وزیر تعلیم کی کار بھی مین گیٹ پر پہنچ گئی۔ ان کے ساتھ ان کا حفاظتی عملہ بھی تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب دیگر افسران کی معیت میں گیٹ پر پہلے ہی موجود تھے جنہوں نے وزیر موصوف کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور انہیں پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ سکول کی رائفل کلب نے سب سے پہلے آپ کو سلامی دی۔ جب آپ ڈائس کے قریب پہنچے تو سب نے تالیاں بجانی شروع کر دیں اور ساتھ ہی ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔

صاحب صدر کے کرسی پر بیٹھنے کے چند منٹ بعد کاروائی کا آغاز ہو گیا۔ ایک طرف اجتماعی ڈرل ہو رہی تھی۔ دوسری طرف بینڈ اپنی سریلی دھنیں بکھیر رہا تھا۔ یہ منظر بہت ہی خوبصورت نظارہ پیش کر رہا تھا۔ اس کے بعد رائفل پریڈ ہوئی۔ اس کے بعد طلباء نے جمناسٹک کے حیرت انگیز کرتب دکھائے حاضرین کو اپنے فن سے بہت ہی محظوظ کیا۔ آخر میں اے آر پی والوں نے مصنوعی جنگ کا مظاہرہ کیا اور ساتھ ہی اس سے بچاؤ کی مشقیں بھی دکھائیں تمام حاضرین پروگرام کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور تالیوں سے ان کی حوصلہ افزائی بھی کر رہے تھے۔ کھیلوں کے مظاہرے ختم ہونے پر طلباء نظم وضبط برقرار رکھتے ہوئے اپنی اپنی نشستوں پر آ بیٹھے۔

اس کے بعد جلسے کا ادبی پروگرام شروع ہوا جس کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے کیا گیا۔ ازاں بعد ایک خوش الحان طالب علم نے ترنم سے نعت رسول مقبولؐ

سنائی ۔اس کے بعد ایک طالب علم نے حکیم الامت علامہ اقبال کی نظم پڑھی ۔ دو لڑکوں نے ایک دلچسپ مکالمہ پڑھا ہر پروگرام بڑے نظم وضبط کے ساتھ سرانجام دیا گیا اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ۔اس کے بعد ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب اٹھے اور انہوں نے اپنی سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی جس میں سکول کی کارکردگی اور کامیابیوں کا ذکر کیا جو سکول نے تعلیم اور کھیل کے میدان میں نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی ۔اس کا بھی ذکر کیا۔سکول کے لئے اور سٹاف کی ضروریات اور مشکلات کی طرف افسران کی توجہ مبذول کرائی ۔پھر آپ نے صاحب صدر سے درخواست کی کہ وہ اپنے دست مبارک سے انعامات تقسیم فرمائیں ۔

اس پر صاحب صدر تالیوں کی گونج میں انعامات تقسیم کرنے کے لئے سٹیج پر کھڑے ہو گئے ۔ساتھ والی میز پر انعام میں دی جانے والی چیزیں بھی پڑی تھیں ۔انعام پانے والے طلباء بھی قریب ہی بیٹھے تھے ۔باری باری طلباء کا نام پکارا جانے لگا وہ آ آ کر اپنا انعام لے جاتے تھے ۔جب تقسیم انعامات کا کام اختتام پذیر ہوا تو آپ سے دوبارہ درخواست کی گئی کہ حاضرین کو اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیں جس پر انہوں نے ایک مختصر سی تقریر میں فرمایا کہ میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری عزت افزائی کی اور مجھے اپنی قوم کے نونہالوں کو انعام تقسیم کرنے کا شرف بخشا ۔انہوں نے ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ کرام کی کارکردگی کو بھی سراہا ۔انہوں نے طالب علموں کو تلقین کی کہ وہ محنت کی عادت اپنائیں اور ہر امتحان میں اعلیٰ نمبر حاصل کر کے شاندار ریکارڈ قائم کریں ۔انہوں

نے طالب علموں کے اندر محنت کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے کئی مثالیں بھی دیں انہوں نے وعدہ فرمایا کہ میں آپ کی مشکلات کو دور کرنے اور سکول کی ضروریات کو پورا کرنے میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ آخر میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے صاحب صدر اور معززین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور قومی ترانے کے ساتھ یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ بعد میں چائے کے بعد معزز مہمان کو پورے احترام کے ساتھ رخصت کیا۔

All rights reserved. ©2002-2006

چڑیا گھر

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمارے گھر چھٹی کے دن کوئی نہ کوئی شغل ضرور ہوتا ہے۔ گھر کے اندر ہو یا باہر یہ میرے گھر والوں پر منحصر ہے کہ وہ کیا پروگرام بناتے ہیں۔ اگر گھر میں پروگرام ہو تو کھانے پینے کا پروگرام بن جاتا ہے۔ یہ پروگرام سب کی مرضی سے موسم کے مطابق بنتا ہے۔ گرمی کے موسم میں کبھی آموں اور کبھی خربوزوں کا پروگرام بنتا ہے۔ برسات میں جس دن موسم خوشگوار ہو کسی تفریحی مقام کا پروگرام بن جاتا ہے۔ پچھلے جمعہ کو سب نے متفقہ طور پر چڑیا گھر جانے کا پروگرام بنالیا۔

ہم سمن آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ صبح ناشتہ کرتے ہی سب بہن بھائیوں نے چڑیا گھر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ سڑک پر پہنچ کر ویگن میں بیٹھے اور مال روڈ کی طرف چل دیئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ میں ہم چڑیا گھر پہنچ گئے۔ چڑیا گھر کے باہر بہت سی کھانے پینے کی دوکانیں ہیں۔ گیٹ سے باہر کھلا میدان ہے جہاں پر کاریں سکوٹر کھڑا کرنے کا انتظام ہے۔ گیٹ کے ساتھ ہی ٹکٹ گھر ہے۔ وہاں سے ہم نے ٹکٹیں خریدیں اور چڑیا گھر میں داخل ہو گئے۔

یہ چڑیا گھر بہت ہی خوبصورت وسیع باغ کی شکل میں ہے جس میں پختہ سڑکیں بھی ہیں۔ پختہ فٹ پاتھ بھی ہیں۔ تن آور اور بہت پرانے پرانے درخت بھی ہیں۔ جب ہم چڑیا گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے ہمیں شترمرغ دکھائی دیے۔ پہلے تو ہمیں ان کا نام ہی نہیں آتا تھا۔ ابو ہمارے ساتھ تھے۔

انہوں نے بتایا کہ یہ شترمرغ ہیں۔ ویسے بھی ان کے جنگلے کے باہر لکھا ہوا تھا۔ اس کا نام کسی نے شترمرغ صحیح رکھا ہے۔ ٹانگیں اونٹ کی طرح لمبی دھڑنگی اور اوپر سے مرغ کی شکل ہے۔ اس جنگلے میں بہت سے شترمرغ تھے۔ ان میں بچے بھی تھے جو بہت ہی پیارے لگتے تھے۔ آگے چلے تو ہمیں ایک تالاب نظر آیا۔ اس میں بطخیں اور آبی پرندے نظر آئے۔ یہ کئی قسم کے پرندے تھے۔ پاس ہی ایک عمارت میں بن مانس نظر آیا۔ اگر کسی جنگلی آدمی کے بال ہوں اور پیر بھی گنواروں کی طرح ہوں تو وہ بن مانس کی طرح کا لگنے لگ جاتا ہے۔ یہ بندر سے بہت بڑا ہوتا ہے اور انسان سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور اس کی حرکتیں انسانوں سے ملتی جلتی ہیں۔

اس کے بعد ہم ہرنوں کے جنگلے کے پاس گئے۔ ہرن پتلی پتلی ٹانگوں والے تھے، سر پر سینگ اور کمر پر کسی کے سیاہ داغ اور کسی کے سیدھی لکیریں تھیں جن سے ان کی خوبصورتی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ چمکدار موٹی موٹی آنکھیں جیسے سرمہ ڈالا ہوا ہو۔ کوئی گھاس کھا رہا تھا۔ کوئی کھڑا تھا کوئی ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ ان میں ہرن بھی تھے ہرنیاں بھی تھیں۔ ہرنوں کے چھوٹے چھوٹے بچے بہت ہی پیارے لگ رہے تھے۔ ہاتھ میں کوئی کھانے پینے کی چیز لے کر اشارہ کرو تو جھٹ پاس آ جاتے تھے۔

ابھی ہم وہیں پھر رہے تھے کہ تھوڑی دیر بعد ایک گرج دار آواز آتی تھی۔ چھوٹے بھائی نے ابو سے دریافت کیا کہ یہ آواز کس چیز کی ہے۔ انہوں نے

بتایا کہ یہ آواز شیر کی ہے۔ جب شیر دھاڑتا ہے تو گرج دار آواز پیدا ہوتی ہے۔ جس پر اس نے کہا کہ چلو ہمیں شیر دکھائیں۔ ہم شیر کی طرف چل دیئے۔ یہ ایک بہت بڑی عمارت ہے جس کے مختلف حصے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے باہر جنگل سا بنا ہوا ہے۔ اس میں سبزہ وغیرہ بھی ہے۔ اس عمارت کے اردگرد دور تک مضبوط لوہے کی سلاخوں سے اونچا جنگلہ بنایا ہوا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ابو نے کہا کہ ابھی آ جائے گا۔ دوسری طرف گیا ہوا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی شیر اور شیرنی دونوں ہی آ گئے۔ یہ ایک گہرے براؤن رنگ کا شیر ہے۔ اس کی گردن پر بہت ہی گھنے بال تھے جس نے اس کے چہرے کو اور بھی ڈراؤنا بنا رکھا تھا۔ آنکھیں چمکدار اور سرخ تھیں۔ قد تقریباً ڈھائی فٹ، اور لمبائی پانچ چھ فٹ ہوگی۔ پیروں کے پنجے بہت مضبوط اور ناخن یوں معلوم ہوتے تھے جس طرح نوکدار چھریاں، دم لمبی اور اور سرے پر بالوں کا گچھا بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ بال نرم اور چمکدار تھے۔ جسم چکیلا اور مضبوط، منہ میں دانت جیسے نیزے لگے ہوئے ہوں۔ ہم سے کافی دور اندر کی طرف آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے اونچے جنگلے کے باہر ایک اور جنگلا تھا جس کے باہر لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر کوئی آدمی غلطی سے شیر کو چھیڑ بیٹھے تو شیر اسے پنجہ مار کر زخمی نہ کر دے۔ اس کے علاوہ جتنے اور جانور تھے ان کو تو لوگ خوب چھیڑ چھاڑ رہے تھے مگر شیر کو چھیڑنے کی جرات کسی کو نہیں ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ ہی ایک عمارت کے سامنے ہاتھی کھڑا تھا جو متواتر جھومتا چلا جا

رہا تھا اور اپنی سونڈ کو ہلا رہا تھا۔ کئی لوگ اسے کھانے کے لئے چیزیں پیش کر رہے تھے۔ وہ سونڈ سے پکڑ کر انہیں منہ میں ڈال لیتا تھا۔ اگر کوئی اسے روپیہ دیتا تو وہ یہ روپیہ مہابت کو دے دیتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہاتھی بہت سمجھ دار جانور ہوتا ہے۔ ہاتھی بہت ہی بڑا قد آور جانور ہے لیکن اس کے باوجود اس سے شیر کی طرح ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس کے اوپر بیٹھ کر ہم نے سواری بھی کی، چڑیا گھر کے دوسرے حصوں میں بھی گئے۔ کہیں ریچھ ہیں، کہیں بندر ہیں اور کہیں زرافے ہیں۔ بچوں کے لیے تفریح گاہ بھی ہے، جس میں جھولے لگے ہوئے ہیں۔ ٹی سٹال بھی ہیں جہاں پر کھانے پینے کا سامان اور ٹھنڈے مشروبات مل سکتے ہیں ہم بہت ہی لطف اندوز ہو کر گھر لوٹے۔

عجائب گھر

لفظ عجائب گھر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پر عجیب عجیب قسم کی چیزیں ہوں گی۔ ہمارے دل میں بھی شوق پیدا ہوا کہ عجائب گھر ضرور دیکھنا چاہیے۔ ہم جہلم کے رہنے والے ہیں اور لاہور کا عجائب گھر ہمارے شہر سے تقریباً ایک سو دس میل کے فاصلے پر ہے۔ ایک دن ہم سب دوستوں نے مل کر باہم مشورہ کیا کہ عجائب گھر دیکھنے کا پروگرام بنایا جائے۔ سب نے کہا کہ آئندہ جو چھٹی بھی ہو اس دن ضرور چلیں گے۔ اس دن اتوار تھا اور پانچویں دن جمعہ کی چھٹی تھی۔ سو جمعہ کا دن مقرر ہو گیا۔ سب نے اپنے اپنے والدین سے لاہور جانے کی اجازت لے لی۔ ہمیں ہمارے والدین نے بغیر کسی رکاوٹ کے اجازت اس لیے دے دی کہ ہمارے ساتھ ہمارے ایک استاد بھی لاہور جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ یہ استاد ہمیں ہسٹری پڑھاتے ہیں اور اکثر پران زمانے کی چیزوں کا ذکر کیا کرتے تھے اور یہ بھی بتایا کرتے تھے کہ یہ نوادرات عجائب گھر لاہور میں محفوظ ہیں۔ اس لیے ہمارے دل میں عجائب گھر دیکھنے کا شوق اور بھی زیادہ پیدا ہو گیا تھا۔

جمعہ کے دن صبح صبح ہی تمام دوست جناب سعید صاحب کے گھر پہنچ گئے اور ٹھیک سات بجے ہم لاری میں سوار ہو گئے تھے۔ ہمارے استاد ہیں تو استاد ہی اور ہمارے لیے بہت قابل احترام ہیں مگر وہ شاگردوں سے دوستوں کی طرح پیش آتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا سفر بہت ہی خوشگوار رہا۔ بس جہلم سے چل کر تھوڑی دیر کے لئے گجرات ٹھہری۔ پھر وزیر آباد ہوتی ہوئی گوجرانوالہ پہنچ گئی۔ گوجرانوالہ میں

بہت رونق ہے کیونکہ یہ پاکستان کا مشہور صنعتی شہر ہے۔ گوجرانوالہ میں بس تقریباً پانچ منٹ ٹھہر کر پھر عازم لاہور ہوئی اور اس طرح ہم سوا دس بجے لاہور کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ چند منٹ بعد بس سٹینڈ پہنچ کر ویگن میں سوار ہوئے۔ ہم گیارہ بجے عجائب گھر کے دروازے پر تھے۔

عجائب گھر ایک بہت ہی کھلی اور خوبصورت سڑک کے کنارے پر واقع ہے۔ اس کی اپنی عالیشان عمارت ہے۔ باہر باغیچہ ہے۔ سامنے ہی پنجاب یونیورسٹی ہے۔ ہم نے ٹکٹیں خریدیں اور عجائب گھر میں داخل ہو گئے۔ اس کے بہت سے مختلف حصے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن میں پرانے زمانے کے مٹی کے بنے ہوئے برتن اور کھلونے ہیں۔ مٹی کی بنی ہوئی مورتیاں ہیں جو اس زمانے کی تہذیب و تمدن کا پتہ دیتی ہیں۔ ان میں ہم نے ایسی چیزیں بھی دیکھیں جو بطور اوزار اس زمانے میں استعمال ہوتی تھیں۔ یہ دھات کے زمانے سے بھی پہلے کا زمانہ تھا۔ جب چھری اور چاقو بھی مٹی اور پتھر سے تیار کئے جاتے تھے اور برتن تو بالکل ہی مٹی کے استعمال ہوتے تھے۔

دوسرے حصے میں لکڑی کے نمونے رکھے ہوئے ہیں جن میں مہاتما بدھ کا مجسمہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہاں کی ہر چیز سے اس زمانے کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ کہیں لکڑی کے جالی دار دروازے اور کھڑکیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ہر چیز کے ساتھ اس کے مختصر کوائف لکھے ہوئے ہیں کہ یہ چیز کونسی صدی میں زیر استعمال رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ لکھا ہوا تھا کہ اسے ہاتھ نہ لگائیں جس کی دو وجوہات

ہیں ایک یہ کہ وہ چیزیں اس قدر خستہ ہو چکی ہیں کہ اگر لوگ اسے ہاتھ لگانے لگیں تو تھوڑے ہی عرصہ میں وہ ضائع ہو جائیں گی۔ اور دوسرے ان کو ایسے کیمیکلز لگے ہوئے ہوتے ہیں جن کو ہاتھ لگانے سے خود ہاتھ لگانے والے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

اس کے بعد ہم ایسے حصے میں گئے جہاں پر مسلمانوں کے دور حکومت کے نوادرات پڑے ہیں۔ جن میں سامان حرب تلوار ڈھال، زرہ بکتر، تیر، نیزے وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ کہیں ان کے لباس بھی پڑے تھے۔ یہ چیزیں دیکھ کر ہم حیران ہو رہے تھے کہ یہ اتنی بھاری بھرکم تھیں اور اتنی بڑی تھیں کہ ہم تو انہیں اٹھا کر تھوڑی دور بھی نہیں لے جا سکتے تھے لیکن اس تلوار کو وہ سارا سارا دن میدان جنگ میں چلایا کرتے تھے۔ وہ زرہ جو وہاں پر پڑی تھی اتنی بھاری تھی کہ اسے پہن کر لڑنا تو درکنار ویسے ہی اٹھانا ہمارے لئے مشکل نظر آ رہا تھا وہ لوگ کس قدر طاقت ور ہوں گے جو انہیں استعمال کرتے ہوں گے۔ ہمیں جناب سعید صاحب نے بتایا کہ یہ اس زمانہ کے لوگ تھے جو سینکڑوں میل کا سفر گھوڑے کی پیٹھ پر کر لیا کرتے تھے اور بیس تیس میل کا پیدل سفر ان کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ انہیں خوراک بالکل خالص ملتی تھی اور خوب کھاتے تھے اور محنت کی وجہ سے ہضم بھی کر لیتے تھے، پھر کیوں نہ یہ لوگ طاقتور ہوتے۔

کسی حصے میں پرانے زمانے کی مصنوعات تھیں جن میں اکثر عام پتھر اور سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھیں۔ ایسی ایسی خوبصورت جالیاں سنگ مرمر کی بنائی

ہوئی تھیں کہ آج کل نہ کوئی صبر وتحمل سے بیٹھ سکتا ہے اور نہ بنا سکتا ہے۔ اس سے اس زمانے کے کاریگروں کی فنکاری اور محنت کا پتہ چلتا ہے۔ کہیں کپڑے کے نمونے پڑے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ جو ہیں تو موٹے موٹے پر ان پر جو کام کیا ہوا ہے اس پر بہت ہی محنت کی ہوئی ہے۔ لکڑی اور مختلف دھاتوں سے تیار کئے ہوئے نمونے اپنے اپنے زمانے کے رسم ورواج کا پتہ دیتے ہیں۔ مختلف زمانے کے سکے پڑے ہیں ان پر لکھی ہوئی عبارت ہم نہیں پڑھ سکتے۔ شاید آثار قدیمہ کے ماہرین پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح سے پتھر پر کھدی ہوئی عبارتیں ہیں۔ اسی طرح سے ہم نے قرآن مجید کے قلمی نسخے بھی دیکھے، جو بہت ہی خوبصورت رسم الخط میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ رسم الخط بھی اپنے اپنے زمانے کے مختلف ہیں۔

عجائب گھر میں ہر زمانے کے نمونے موجود ہیں جو تاریخ دانوں کے لئے رہنمائی کا کام کرتے ہیں اور سیاح بھی ان سے بہت معلومات حاصل کرتے ہیں۔

ایک دیہاتی میلہ

میلہ کا لفظ میل، ملاپ سے لیا گیا ہے جس کے معنی صاف ظاہر ہیں۔ اس موقع پر لوگ کسی مقام پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ خوشیاں مناتے ہیں۔ گانے گاتے ہیں۔ وہاں پر قسم قسم کی دکانیں ہوتی ہیں۔ کھانے پینے کا سامان ہوتا ہے۔ تفریح کے لئے تھیٹر اور جھولے وغیرہ ہوتے ہیں دور دراز سے لوگ میلہ دیکھنے آتے ہیں۔

تیوہار اور میلے ہر ملک اور ہر علاقے میں لگتے ہیں۔ یہ وہاں کے لوگوں کی معاشرتی زندگی کا عکس بھی ہوتے ہیں۔ جہاں پر لوگ پوری آزادی سے اپنی معاشرت کا اظہار کرتے ہیں۔ میلوں میں غریب، امیر، بوڑھے جوان اور بچے بھی ہوتے ہیں۔ بعض میلے مذہبی قسم کے ہوتے ہیں جو مذہبی عقائد وعوامل میں شامل ہوتے ہیں۔ جیسے داتا صاحب کا عرس، پاکپٹن شریف کا عرس، عرس سلطان باہو وغیرہ وغیرہ اور کچھ موسمی جو موسموں اور فصلوں سے تعلق رکھتے ہیں جس طرح میلہ بیساکھی میلہ چراغاں، جسے ہم شالیمار کا میلہ بھی کہتے ہیں اور کئی ملے جلے ہوتے ہیں فن۔

پچھلے دنوں مجھے بھی ایک دیہاتی میلہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ موسم گرما میں ضلع گوجرانوالہ کے گاؤں بھڑی شاہ رحمان میں لگتا ہے۔ یہ گاؤں گوجرانوالہ سے حافظ آباد جانے والی سڑک سے ذرا ہٹ کر واقع ہے۔ یہ میلہ جیٹھ کی نویں تاریخ کو شروع ہوتا ہے اور تقریباً ایک ہفتہ لگا رہتا ہے۔ دو دن صرف عورتوں کا میلہ ہوتا

ہے ایک دن میرے دوست اکٹھے ہو کر آئے کہ کل میلہ دیکھنے چلنا ہے۔ لہٰذا دوسرے دن کا پروگرام طے پایا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی میرے دوست اکٹھے ہو کر ہمارے گھر آ گئے۔ ان دنوں میلے کے لئے خاص بسیں چلتی ہیں۔ یہاں پر بہت دور دراز سے لوگ میلہ دیکھنے آتے ہیں۔ لوگ کثیر تعداد میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ شہر سے نکل کر ہم گوجرانوالہ کے جنرل بس سٹینڈ پر پہنچ گئے۔ وہاں گئے تو رش بہت زیادہ تھا اور بسیں کم تھیں۔ لوگ چھتوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور بس کے اندر یہ حالت تھی کہ خدا کی پناہ، ہم بہت پریشان ہوئے کہ کیسے جائیں گے۔ بہت سی بسیں اسی طرح گزر گئیں۔ جب کوئی بس آتی لوگ دھکے مار کر اندر گھس جاتے اور کچھ چھت پر چڑھنا شروع ہو جاتے۔ آخر مجھے یاد آیا کہ یہاں بس سٹینڈ پر ابو کے ایک دوست ہیں جو اکثر گھر ملنے آیا کرتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ آج ان سے کام لیں۔ بڑی مشکل سے انہیں ڈھونڈا۔ وہ ہمارے ساتھ آئے اور ایک بس والے کو کہا کہ میں چار سیٹیں چاہئیں۔ اس نے کہا کہ بہت بہتر۔ لہٰذا جب ایک خالی بس آئی تو اس میں ہمیں آسانی سے سیٹیں مل گئیں۔ شکر ہے کہ ہمیں اگلی چار سیٹیں ملیں جہاں پر پیچھے کی نسبت رش کم تھا۔ خدا خدا کر کے بس روانہ ہوئی، بس اتنی اوورلوڈ ہو گئی تھی کہ پوری سپیڈ بھی نہیں پکڑتی تھی۔ بڑی مشکل سے پچیس میل کا سفر دو گھنٹے میں طے کیا۔

جب ہم میلے کی حدود میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں پر چاروں طرف آدمی ہی

آدمی دکھائی دے رہے ہیں۔ دور دور تک لوگ پھیلے ہوئے تھے جن میں جوان بوڑھے اور بچے بھی تھے اکثریت دیہاتی لوگوں کی تھی گو شہری لوگ بھی نظر آ رہے تھے۔

میلے میں ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ جدھر دیکھو لوگوں کا ہجوم تھا۔ بعض جگہوں پر تو اتنا دباؤ تھا کہ گزرنا مشکل ہو رہا تھا۔ دور رویہ دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ مٹھائیوں اور کھانے پینے اور مشروبات کی دکانیں بہت نظر آ رہی تھیں۔ وہاں پر جو چیز ہمیں خاص طور پر نظر آئی وہ تھا قتلمہ۔ وہ عام روٹی سے دگنا تگنا ہوتا ہے۔ اس کا قطر کم از کم دو فٹ ہوتا ہے۔ اوپر سرخ مرچ لگی ہوئی ہوتی ہے اور تیل میں تل کر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ چیز ہم نے شہروں میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ویسے بھی وہ تل کر خستہ نہیں کیا ہوا ہوتا۔ دیہاتی لوگ اسے خوب مزے سے کھا رہے تھے۔ علاوہ ازیں بوتلوں اور فالودے کی دوکانوں پر بھی بہت بھیڑ تھی۔ چاروں طرف سے دوکانداروں کی مختلف صدائیں آ رہی تھیں۔ کچھ لوگ خرید و فروخت کر رہے تھے۔ کچھ لوگ وہاں کاروبار کرنے گئے ہوئے تھے۔ کچھ اپنے اپنے کرتب دکھا رہے تھے اور لوگوں سے پیسے اکٹھے کر رہے تھے۔ کہیں قوالی ہو رہی تھی۔ لوگ نوٹوں کے ذریعے قوالوں کو داد دے رہے تھے۔ کچھ من چلے بھنگڑہ ڈال رہے تھے۔ ایک جگہ ایک آدمی الغوزے اور دوسرا چمٹے سے لوگوں کو محظوظ کر رہا تھا۔

تفریح کے لئے سامنے میدان میں تھیٹر بھی لگا ہوا تھا۔ ایک طرف سرکس تھا

اور دوسری طرف موت کا کنواں تھا۔ بچوں کی تفریح کے لئے جھولے تھے جن میں ہاتھ والے بھی تھے اور ایک جھولا ایسا بھی تھا جو انجن سے چل رہا تھا۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ پھرتے پھراتے شام ہوگئی اور ہم خوشی خوشی گھر لوٹ آئے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

حضرت داتا گنج بخشؒ

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

یہ شعر اس برگزیدہ ہستی کا ہے جنہیں لوگ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نام نامی سے یاد کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ شعر اس وقت کہا تھا جب خواجہ صاحب نے داتا صاحب کے مزار پر اعتکاف کیا۔ جب وہ انکے فیض سے مستفیض ہوئے تو زبان حال سے یہ شعر نکلا کہ آپ خداوند تعالیٰ کے نور کے مظہر ہیں۔ اپنے فیض کے خزانے لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جو لوگ شریعت وطریقت میں ناقص ہیں آپ ان کے لیے پیر کامل ہیں اور جو لوگ کامل ہو چکے ہیں آپ ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ گویا کتنا بلند مقام ہے آپ کا۔ جو ناقص ہیں ان کو بھی مستفیض فرماتے ہیں اور جو کامل ہیں آپ کا مقام ان سے بھی بلند تر ہے۔

آپ کا اصل نام علی ہجویری ہے۔ آپ ۴۰۰ھ میں سید عثمان کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ شہر غزنی کے محلّہ ہجویر میں رہائش پذیر رہے۔ اسی نسبت سے آپ کو ہجویری کہتے ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت خاتم النبیینؐ سے جاملتا ہے۔ آپ کے مرشد کا اسم گرامی ابو الفضل محمد تھا جن کے حکم سے آپ نے ۴۳۱ھ میں شہر لاہور میں پہنچ کر شمع ہدایت جلائی۔ یہ دور وہ تھا جب یہاں پر ہر طرف کفر والحاد کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔ آپ نے اس ظلمت کدہ میں شمع روحانیت روشن کی۔ لوگوں کو اسلام سے روشناس کرایا۔ ان کے دلوں میں وحدانیت کی قندیلیں جلائیں۔ سبق انسانیت دیا۔ حب رسولؐ کا دیا ان

کے دلوں میں روشن کیا۔ خیر و شر کی تمیز کرائی، بت پرست بت شکن بن گئے۔ ان کے دل و دماغ نورِ خدائے واحد سے منور ہو گئے۔ جو جھوٹے بتوں کی پوجا کرتے تھے شمع رسالت کے پروانے بن گئے۔ آج سے تقریباً ہزار سال قبل جو پرچم اسلام سرزمین لاہور میں داتا صاحب نے لہرایا تھا آج بھی اسی تمکنت اور فتح و نصرت کا امین نظر آ رہا ہے۔

آپ کی روحانی برکات و فیوض سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ سب سے پہلے جو حلقہ اسلام میں داخل ہوا وہ ''رائے راجو'' تھا۔ یہ اس وقت حاکم لاہور تھا۔ آج تک حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار مقدس کی سرپرستی اسی ''رائے راجو'' کی اولاد ہی کرتی چلی آ رہی ہے۔ حاکم لاہور نے اسلام قبول کر لیا تو اس سے دوسرے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی توقیر اور بھی زیادہ ہو گئی اور بے شمار لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔

شہزادہ دارا شکوہ کو آپ سے بہت ارادت تھی۔ چنانچہ وہ اپنی مشہور کتاب ''سفینۃ الاولیاء'' میں آپ کے متعلق ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ آپ نے ایک مسجد تعمیر کروائی جس کی محراب دوسری مساجد کی نسبت جنوبی جانب مائل تھی۔ لوگوں نے اعتراض کیا، آپ نے اپنی مسجد میں جماعت کرائی اور لوگوں سے کہا دیکھو کعبہ کس طرف ہے؟ یہ کہنا تھا کہ دلوں کے حجاب اٹھ گئے۔ قلب و نظر کے شکوک دور ہو گئے اور دل کے آئینہ میں کعبہ منعکس ہو گیا اور لوگوں نے صحیح سمت کا اعتراف کیا۔

آپ کا مزار مبارک لوگوں کے دیدہ و دل کی عقیدتوں کا مرکز ہے۔ لوگ آتے ہیں اور عقیدتوں کے پھول نذر کرتے ہیں۔ آج نو سو سال سے زائد کا عرصہ گزر

چکا ہے لیکن آپ کی عظمت و شان میں کوئی فرق نہیں آ رہا۔ آپ کی کتاب زندگی کا ہر ورق اس مصرعہ کی تفسیر نظر آتا ہے۔

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے

آپ سے ایک نوجوان نے پوچھا میں دشمنوں میں ایسے گھرا ہوں جیسے پتھروں کے درمیان مینا۔ فرمائیے میں کیا کروں۔ آپ نے جواب دیا ''تم راز حیات سے نامحرم ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب پتھر اپنے آپ کو شیشہ خیال کرے تو ٹوٹنے لگتا ہے۔ اگر تو اپنے جوہر کو پہچان لے تو دشمن بھی دوست اور ترقی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ جب سیلاب زوروں پر ہو تو ہر بلندی سے ٹکرا کر گزر جاتا ہے اور اس کی ہمت کے سامنے ہر بلندی پستی ہوتی ہے۔''

علامہ اقبال نے حضرت داتا گنج بخشؒ کے متعلق کتنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

خاک پنجاب ازدم اوزندہ گشت
صبح ما ازمہر او تابندہ گشت

آپ تیئس سال کے عرصہ تک لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرتے رہے۔ آپ لوگوں کو مسخر کرتے رہے اور انہیں گمراہی کے گڑھوں سے نکال کر نور ہدایت سے مالا مال کرتے رہے۔ ۴۶۵ھ میں آپ اس دنیا سے رحلت فرما کر حیات جاوداں پا گئے۔ آپ لاکھوں بزرگان خدا کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نو سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود آپ کے مزار پر حق پرست عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔

داتا صاحبؒ کا عرس

پاکستان میں بہت سے اولیائے کرام ہیں جن کا عرس ہر سال ہوتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ پاک و ہند کے مشہور اور بلند پایہ اولیاء میں سے ہیں۔ آپ کا نام نامی علی ہجویری ہے۔ آپ ۴۰۱ھ میں سید عثمان کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ غزنی کے ایک محلّہ ہجویر کے رہنے والے ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب پیغمبر اسلام حضرت نبی کریمؐ سے جاملتا ہے۔ آپ کے پیر طریقت ابوالفضل محمد تھے۔ آپ ۴۳۱ھ میں لاہور تشریف لائے اور اپنی روحانی برکات و فیوض سے یہاں کے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ آپ کا مزار مقدس لاہور میں بھاٹی دروازہ کے باہر ہے۔ آپ کا مزار مبارک بہت خوبصورت بنا ہوا ہے۔ اوپر سبز گنبد ہے۔ روضے کے چاروں طرف سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی بہت بڑی مسجد ہے۔ جب سے اس کا انتظام محکمہ اوقاف نے سنبھالا ہے مسجد از سر نو تعمیر ہوئی ہے روضہ مبارک کی تزئین دوبارہ کی گئی ہے چاروں طرف فقراء اور زائرین کے لئے حجرے بنے ہیں اور مستورات کے لیے حصہ علیحدہ بنایا گیا ہے۔

دربار داتا صاحب پر ہر جمعرات کو رونق ہوتی ہے اور قوالی بھی ہوتی ہے۔ ہر سال عرس مبارک ہوتا ہے۔ پاکستان کے علاوہ بھارت افغانستان اور دوسرے ممالک سے بھی آپ کے عقیدت مند اس عرس پر آتے ہیں۔ زائرین کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ کمزور آدمی تو اس میں سے گزر بھی نہیں سکتا جبکہ چار دیواری کے اندر تو تل دھرنے کے لئے بھی جگہ نہیں ملتی۔ اندر داخل ہونا بہت مشکل ہو جاتا

ہے۔

لوگ عرس شروع ہونے سے پہلے ہی یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ خاص طور پر جنہوں نے دوکانیں لگانی ہوتی ہیں۔ یا جنہوں نے تھیٹر یا سرکس وغیرہ لگانا ہوتی ہیں انہیں تو کئی روز پہلے آنا پڑتا ہے اور دربار کی انتظامیہ کو بھی کئی روز پہلے ہی انتظامات سنبھالنا پڑتے ہیں۔ کیونکہ بہت وسیع و عریض علاقہ میں عرس کا ہجوم پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ دربار کے سامنے کارپوریشن کے باغات بھی عرس کی حدود میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ادھر ٹکسالی دروازہ تک دوکانیں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔

عرس کے دنوں میں اردگرد کے شہروں سے خصوصی بسیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں جو کھچا کھچ بھری ہوئی رات دن چلتی ہیں۔ بسوں کی چھتوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ کے عقیدت مند ہر شہر ہر گاؤں سے آتے ہیں۔ عرس داتا صاحب کا شمار چوٹی کے عرسوں میں ہوتا ہے۔ کیونکہ دربار ایک ایسے شہر میں واقع ہے جو پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اس کی اپنی آبادی لاکھوں میں ہے اور سب سے بڑے صوبے پنجاب کا دارالخلافہ ہے۔ اس لیے میرے خیال میں جتنا ہجوم یہاں ہوتا ہے پاکستان میں کہیں نہیں ہوتا۔

دربار داتا صاحب دو بڑے بازاروں کے درمیان میں واقع ہے۔ یہ دوکانیں پہلے سے ہی یہاں موجود ہوتی ہیں۔ یہاں پر مختلف قسم کی دوکانیں ہیں۔ کھانے پینے کا سامان، ہار اور پھولوں اور پتیوں کی دوکانیں، مزار پر چڑھانے کے لئے چادریں بھی اسی بازار سے مل جاتی ہیں۔ نذر نیاز کا سامان، پتاشے، پھلیاں وغیرہ

یہیں سے دستیاب ہوسکتی ہیں۔عطر والوں کی دوکانیں بھی انہی بازاروں میں ہیں۔ایک طرف باورچیوں نے اپنے اڈے بنائے ہوئے ہیں جہاں سے پکی پکائی دیگیں جس قسم کی مطلوب ہوں مل سکتی ہیں۔ساتھ ہی سکول کے کھلے میدان میں قوالی کے لئے سائبان لگائے ہوئے ہوتے ہیں۔قوالوں کے لیے اونچا اور خوبصورت سٹیج بنایا ہوا ہوتا ہے۔اس قوالی کا انتظام ایک منتخبہ میر مجلس کی نگرانی میں ہوتا ہے۔اس کا انتخاب داتا صاحب کے عقیدت مندوں میں سے کیا جاتا ہے۔ میر مجلس تاحیات رہتا ہے۔یہاں ہر ملک کے بڑے بڑے نامور قوال آتے ہیں۔یہ قوالی سننے کے قابل ہوتی ہیں۔

دربار کے باہر کھلی سڑک ہے۔وہاں پر بھی بہت ہجوم ہوتا ہے۔ایک طرف دوکانیں سجی ہوئی ہوتی ہیں۔دوسری طرف کہیں تھیٹر لگے ہوئے ہوتے ہیں۔کہیں موت کا کنواں ہوتا ہے۔کہیں جھولے ہوتے ہیں۔جھولے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جانے والے بھی۔یہ بہت اونچے اونچے ہوتے ہیں۔دائرہ میں گھومنے والے بھی ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک پنگھوڑا اس قسم کا بھی تھا کہ اس میں دو سیٹیں تھیں جو ایک دائرہ میں لائن کے اوپر چلتی ہیں اور یہ بجلی یا انجن کے ذریعے چلتا ہے۔ایک چیز اور جو مجھے پسند آئی وہ تھیں ڈوجنگ کاریں۔یہ چھوٹی چھوٹی کاریں ہوتی ہیں جن کا کنکشن برقی رو کے ذریعے برقی چھت سے کیا ہوا ہوتا ہے۔انہیں بچے اور نوجوان بھی چلاتے ہیں۔بڑا مزا آتا ہے۔کاروں کی ایک دوسرے سے ٹکریں بھی لگتی ہیں مگر کاروں کے باہر ربڑ

کے پیڈ چڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔اس لیے نقصان کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔

دربار کے اندر مسجد ہے جس میں نمازی نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں بعض لوگ روضہ مبارک سے سر لگائے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہے ہوتے ہیں۔کہیں بھنڈارہ تقسیم ہو رہا ہے۔تبرک لینے والوں کی لائنوں کی لائنیں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ایک طرف قرآن خوانی ہو رہی ہوتی ہے۔الغرض وہاں خدا کی رحمت بھی خوب برستی دیکھی اور رونق بھی بہت دیکھی۔

All rights reserved. ©2002-2006

ایک سرکس کا آنکھوں دیکھا حال

ہمارے شہر کے نزدیک چار میل کے فاصلے پر میلہ بیساکھی لگتا ہے اس میلے میں بہت رونق ہوتی ہے۔ دور دراز سے لوگ میلہ دیکھنے آتے ہیں۔ اس میں دیہاتی لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ مختلف جگہوں پر سرکس کے اشتہارات لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ میں میلوں میں جانے کا شوقین نہیں مگر مجھے اور میرے دوست کو یہ اشتہارات دیکھ کر شوق چرایا کہ ہم بھی سرکس دیکھنے جائیں گے۔ لہٰذا ہم دونوں سرکس دیکھنے چلے گئے۔

ایک بہت ہی کھلے میدان میں بہت بڑا خیمہ لگا ہوا تھا جس کو موٹے موٹے اور مضبوط رسوں سے باندھا ہوا تھا اور خیمہ کے پردے پائیدار رسیوں پر سلے ہوئے تھے یعنی پردوں کے کناروں اور درمیانی حصہ کو ان رسیوں سے خوب مضبوطی سے قابو کیا ہوا تھا۔ یہ دیوہیکل سفید خیمہ دور سے نظر آ رہا تھا۔ سرکس کے گرد بہت سے چھوٹے چھوٹے خیمے بھی تھے۔ یہ شاید اس عملے اور فن کاروں کی رہائش کے لئے لگائے گئے تھے جو سرکس سے متعلق تھے سرکس کا بینڈ اپنی سریلی دھنوں سے لوگوں کو محظوظ کر رہا تھا ساتھ ہی ڈھول اور باجا اتنی بلند آواز سے بج رہا تھا کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم نے ٹکٹیں خریدیں اور سرکس میں داخل ہو گئے۔ بجلی کے قمقموں سے سارا خیمہ چمک رہا تھا۔ تماشائیوں کا جم غفیر دکھائی دے رہا تھا۔ سب سے اوپر گیلری پر لوگ بیٹھے تھے۔ اس کے بعد کرسیوں اور بینچوں پر تماشائی بیٹھے تھے اور سب سے آخر میں لوگ دریوں پر زمین کے اوپر بیٹھے تھے۔

بھیڑ اس قدر تھی کہ ہمیں بہت مشکل سے جگہ ملی۔ رنگا رنگ جھنڈیوں اور بجلی کے بلبوں سے سرکس کو سجایا ہوا تھا جس سے ایک رنگا رنگی کی فضا بن گئی تھی جس سے تماشائی لطف حاصل کرتا ہے۔ میں اور میرا دوست گیلری میں بیٹھ گئے تھوڑی دیر بعد گھنٹی بجنا شروع ہوئی جس کا مطلب تھا کہ کھیل شروع ہونے والا ہے سب سے پہلے ایک سائیکل سوار آیا سائیکل صرف ایک پہیہ والا تھا سائیکل سوار نے خوب خوب کرتب دکھائے۔ اس نے اپنے کندھوں پر دو آدمیوں کو بٹھا کر بھی سائیکل چلایا کبھی آگے کبھی پیچھے کی طرف۔ بیچ میں ایک مسخرا بھی تھا جو تماشائیوں کے لئے تفریح کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ وہ مسخرے پن میں اپنے کمالات کا خوب مظاہرہ کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک جھولا اوپر سے ظاہر ہوا۔ اس کے سرے مضبوط زنجیروں میں پھنسے ہوئے تھے۔ نیچے لوہے کا راڈ تھا۔ ایک آدمی نمودار ہوا جو چھلانگ مار کر اس جھولے پر ہاتھوں کے زور لٹکنے لگا۔ ساتھ ہی عجیب انداز میں جھولا جھول رہا تھا۔ کبھی ٹانگوں سے کبھی ایک ہاتھ سے کبھی ایک ٹانگ سے اور کبھی ایک پاؤں سے لٹک جاتا تھا اور جھولتا بھی تھا۔ پھر دوسرا آدمی آیا جو اس کے سامنے والے جھولے پر لٹک گیا اب دونوں اپنے اپنے جھولوں کا تبادلہ کر رہے تھے اس کے بعد ایک اور آدمی آ گیا ایک جھولنے والے کو اس طرح ہاتھوں سے پکڑا کہ اوپر والے کے پیر جھولے میں اٹکے ہوئے تھے۔ سر اور بازو نیچے کی طرف تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے نچلے آدمی کو پکڑے ہوئے تھا اور دونوں جھولا جھول رہے تھے۔ ہم اس وقت تو بہت ہی حیران ہوئے کہ ایک آدمی اوپر دوسرا اس کے نیچے اور تیسرا

دوسرے کے نیچے ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے سب سے اوپر والے نے پیروں سے راڈ کو پکڑا ہوا ہے اور تینوں جھولا جھول رہے ہیں اس کے بعد ایک لیڈی آئی جس کا جسم بہت سمارٹ مگر مضبوط تھا۔ چھلانگ لگا کر بندھے ہوئے درمیانی رسے کے اوپر چڑھ کر ڈانس کرنے لگی۔ اس نے اپنے کرتبوں سے تماشائیوں کو بہت حیران کیا اس کے بعد ایک جلتی شمع اس کے ہاتھ میں پکڑائی گئی وشمع سے ڈانس کرتی چلی گئی پھر دوسری شمع اس کے ہاتھ میں دی گئی دونوں شمعوں سے ڈانس کرتی رہی۔ پھر کمال یہ دکھایا کہ دونوں شمعوں کو اوپر کی طرف پھینکتی اور دائیں ہاتھ والی شمع بائیں ہاتھ سے پکڑتی اور بائیں ہاتھ والی شمع دائیں ہاتھ سے پکڑ کر حسب معمول ڈانس کرتی رہتی۔ یہ تبادلہ اس نے متعدد بار کیا۔ شمعیں اس کے ہاتھ میں اس طرح تبدیل ہو جاتیں جس طرح ایک محدود دائرہ میں کام کر رہی ہوں۔ تماشائی تالیاں بجا کر اسے خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔

اس کے بعد ایک گھوڑا آیا۔ اس پر ایک بندر سوار تھا۔ پھر دوسرا چوتھا اور پھر پانچواں۔ پانچویں پر بندر سوار تھے۔ کسی کے ہاتھ میں لگام نہیں تھی۔ جب پانچوں باقاعدی سے دوڑنے لگے تو ان کے ماسٹر نے سیٹی بجائی جس کے بجتے ہی ہر ایک بندر نے اگلے گھوڑے پر جست لگائی اور دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ یہ عمل انہوں نے کئی بار دہرایا اور ہر بندر صحیح سلامت اپنی سیٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں پر تبدیل کر لیتا تھا۔ پھر پیچھے کی طرف الٹ بازی لگائی اور گھوڑوں پر سوار ہوتے رہے۔ یہ کھیل بھی ہمیں بہت اچھا لگا۔

اس کے بعد ایک ہاتھی نے آتے ہی تماشائیوں کو سونڈ سے سلام کیا۔ اچانک ایک لیڈی نمودار ہوئی۔ ہاتھی نے آتے ہی اسے اپنی سونڈ پر اٹھالیا اور اپنے ماسٹر کے اشارے پر ڈانس کرنے لگا۔ اس طرح پورا چکر لگایا۔ اتنے بھاری بھرکم جسم والے ہاتھی کے لیے یہ بہت ہی مشکل کام تھا۔ سلام کرنے کے بعد وہ بھی چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد شیروں کا ایک جوڑا نمودار ہوا۔ ان کو خوب سدھایا ہوا تھا۔ وہ دہاڑتے بھی تھے اور کام بھی کرتے تھے۔ کسی وقت ضد کرتے تو ماسٹر ہنٹر کی آواز سے ان کو ڈرا کر کام کرنے پر مجبور کر دیتا۔ ان شیروں نے اپنے مختلف کرتبوں سے تماشائیوں کو محظوظ کیا۔ آخر میں ایک بکرا نمودار ہوا۔ یہ بکرا دونوں شیروں کے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا جنہوں نے اپنے خونخوار منہ کھولے ہوئے تھے۔ یہ ان کا آخری کرتب تھا۔

کسی شاندار جلوس کا آنکھوں دیکھا حال

عید میلاد النبیؐ کا دن وہ یوم سعید ہے جس روز حضور سرور کونین محبوب رب العالمین خاتم النبیینؐ اس دنیا میں تشریف لائے۔ اس آفتاب ہدایت نے اپنی ضیا پاشیوں سے دنیا کی ظلمت کو نور میں تبدیل کر دیا۔ جہالت کے اتھاہ سمندر کی عمیق و تاریک گہرائیاں بھی آفتاب رسالت کی کرنوں سے منور ہو گئیں۔ عید میلاد النبیؐ اسی مجسمۂ رحمت کی ولادت کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔

اس دن ہر چھوٹے بڑے شہر میں جلوس نکلتے ہیں اور لوگ جوق در جوق اپنے اپنے گلہائے عقیدت تاجدار مدینہؐ کے حضور پیش کرتے ہیں۔ ہمارا شہر گوجرانوالہ پاکستان کے اہم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ میں ہر سال دامے درمے سخنے عید میلاد النبیؐ میں حصہ لیتا ہوں۔ گوجرانوالہ صنعتی اور تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے بہت ہی بارونق شہر ہے۔ یہاں کی آبادی بھی آٹھ دس لاکھ کے قریب ہے اور لوگوں کی اکثریت اس قابل ہے کہ اس دن کو بطریق احسن منا سکیں۔

عید میلاد النبیؐ سے کئی روز قبل لوگ تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔ محرابیں تو کئی ہفتہ پہلے تیار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ محرابیں پختہ، لکڑی اور لوہے کی تیار ہوتی ہیں جن پر گلکاری اور نقاشی کی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان پر نعتیہ اشعار بھی لکھے ہوئے ہوتے ہیں کئی محرابوں پر حضورؐ کے روضہ مبارک کی تصویر ہوتی ہے جبکہ کئی محرابوں پر خانہ کعبہ بنایا ہوا ہوتا ہے۔

لوگ صبح سے ہی اپنے اپنے علاقے میں جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں یا بڑی

بڑی مساجد میں اور ان کے باہر کی جگہوں پر جمع ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے لوگ جلوس کی شکل میں چل پڑتے ہیں۔ اس دفعہ ایسا ہوا کہ سب نے یہ طے کیا کہ تمام مساجد کے لوگ اور گرجا کھ کالج روڈ گوبند گڑھ اور اس طرف کا سارے کا سارا علاقہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج گراؤنڈ میں اکٹھا ہو جائے۔ یہ سارا علاقہ کالج کے نزدیک ہے اس لئے ان کے لئے یہاں اکٹھا ہونا بھی آسان ہے۔ لہٰذا یہ تمام لوگ ٹولیوں کی شکل میں اپنے رہنماؤں کی قیادت میں اکٹھے ہو گئے اور وہاں سے سب آہستہ آہستہ نکلنے شروع ہو گئے۔ کالج کی گراؤنڈ بہت ہی طویل و عریض ہے۔ یہ بالکل کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔

جلوس میں سب سے آگے ٹرک تھے، اور بسیں تھیں، ان ٹرکوں کو دلہن کی طرح سجایا ہوا تھا۔ ٹرک کے اندر ایک سٹیج بنا کر لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور اندر ہی سے ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ باہر چاروں طرف لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے تھے۔ نعتیہ کلام کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے مثلاً نعرہ تکبیر اللہ اکبر نعرہ رسالت یا رسولؐ اللہ، نعرہ حیدری یا علیؓ پاکستان زندہ باد نعروں سے فضا گونج رہی تھی ٹرک کے اوپر بھی دوسری سٹیج بنی ہوئی تھی اس پر قائدین اور علماء بیٹھے تھے۔ وہ حصہ بھی بہت سجا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے ٹریکٹر تھے اور ٹریکٹروں کے پیچھے ٹرالیوں میں آدمی بیٹھے ہوئے تھے، ٹریکٹروں اور ٹرالیوں کو بھی خوب سجایا ہوا تھا۔ رنگ برنگ کی جھنڈیاں بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ اس پر لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے تھے اور ارد گرد لوگ پیدل بھی چل رہے تھے اس کے بعد اونٹ پر سوار تھے۔ اونٹ سوار

بالکل اس طرح معلوم ہوتے تھے جس طرح عرب لوگ ہیں۔ سر سے پاؤں تک عربی لباس، ہاتھ میں تلواریں اور اس کے آگے پیچھے بھی چھوٹے بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ نعت خواں تھے۔ جو نعتیں پڑھ رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نعرے بھی لگاتے تھے۔

اس کے بعد سکوٹر، ٹانگے، بیل گاڑیاں تھیں جن پر لوگ اچھے اچھے لباس پہن کر بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت ہی خوش باش چہرے نظر آ رہے تھے۔ کوئی نعتیں پڑھتے تھے۔ کسی نے ٹیپ لگا رکھی تھی۔ ہر بیل گاڑی پر سٹیج بنی ہوئی تھی اس پر ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ اسی طرح سے ٹانگوں پر بھی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ ایک چیز ہر جگہ پر مشترک نظر آ رہی تھی کہ ہر ٹولی کے قائدین کے گلوں میں ہار ڈالے ہوئے تھے۔ لوگ ان کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔ ان کو سٹیج کی اونچی سے اونچی جگہ پر براجمان کیا ہوا تھا اور جہاں کہیں کھڑے ہوتے یا آگے چلتے تو انہی کے اشارے سے۔

بازاروں کو محرابوں سے سجایا تھا۔ اوپر سارے راستہ کو کپڑے سے کور کیا ہوا تھا۔ دو طرفہ رنگدار بانس لگے ہوئے تھے۔ ان بانسوں سے جھنڈیاں بندھی ہوئی تھیں۔ گویا سارا راستہ جہاں جہاں سے جلوس نے گزرنا تھا خوب سجایا ہوا تھا۔ ہر چوک میں جلوس کے قائدین مختصر سی تقریر کر کے آگے بڑھتے۔ ایک چوک میں تلوار کے ماہرین اپنے کرتب کا مظاہرہ کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے عربی لباس میں بہت ہی بھلے لگتے تھے۔ یہ جلوس اسی طرح سے سرکلر روڈ سے گزرتا ہوا

کوئی پانچ چھ گھنٹے میں شیرانوالہ باغ پہنچ گیا۔

جب شام ہوئی تو محرابوں کو بجلی کے قمقموں سے سجایا گیا۔ جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ اب بجلی کی رنگ برنگ کی روشنیاں بھی عجیب خوشنما نظارہ پیش کرنے لگیں۔ بڑی بڑی عمارتوں پر چراغاں بھی کیا گیا تھا۔ رات کو چوک گھنٹہ گھر میں غلام فرید قوال اور اس کے ہمنواؤں کی قوالی کا پروگرام تھا۔ اب اس چوک کا نام ہی مصطفٰے چوک رکھ دیا گیا ہے کیونکہ یہاں پر ہر سال عید میلاد النبیؐ کے موقع پر اچھے اچھے نامور قوال قوالی کرتے ہیں۔ اسی طرح سے چوک کو قدرتی مناظر بنا کر سجایا ہوا تھا۔ ساتھ ہی پہاڑ ہیں اور ساتھ دریا بہہ رہا ہے۔ اس میں کشتی بھی چل رہی ہے۔ ایسی کاریگری سے یہ مناظر بنائے گئے تھے کہ ان پر اصل کا گمان ہونے لگتا تھا۔ اس دن جلوس واقعی قابل دید تھا اور اسے دیکھ کر ایمان بھی تازہ ہوتا تھا لوگوں کا جوش عقیدت دیکھ کر دل بہت خوش ہوتا تھا۔

ریلوے سٹیشن کا منظر

پچھلے دنوں ہمارے چچا جان کراچی سے آئے ہوئے تھے۔وہ ہمارے ہاں ایک ہفتہ تک رہے۔اس کے بعد جب وہ واپس گئے تو میں انہیں الوداع کہنے کے لئے لاہور ریلوے سٹیشن پر گیا۔ان کی سیٹ تیز گام میں ریزرو تھی اور ساتھ ہی برتھ بھی۔ہم وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے سٹیشن پر پہنچ گئے کیونکہ کچھ سامان بک کرانا تھا۔ جو ہلکا سامان تھا وہ انہوں نے اپنے ساتھ ہی رکھنا تھا سٹیشن پر پہنچتے ہی ہمیں قلیوں نے دبوچ لیا۔سامان اٹھوا کر بکنگ آفس پہنچے۔سامان تلوایا۔ان سے رسید لی پلیٹ فارم میں داخل ہونے سے پہلے گیٹ پر کھڑے ٹکٹ کلکٹر نے ہماری ٹکٹیں دیکھیں اور ان کو پنچ کیا۔ایک ٹکٹ چچا جان کی تھی اور ایک پلیٹ فارم میرا تھا۔ دونوں ہمیں واپس کر دیے۔پلیٹ فارم پر جو پہنچے تو دیکھا کہ اس قدر بھیڑ تھی جیسے سارا لاہور ہی سٹیشن پر چلا آیا ہو۔کوئی مسافر ادھر جا رہا ہے،کوئی ادھر جا رہا ہے۔ کسی نے سامان اٹھایا ہوا ہے۔کسی نے بچے اٹھائے ہوئے ہیں۔کسی نے بستر سر پر رکھا ہوا ہے۔کوئی سامان کے پاس کھڑا ہے۔گرمی کا موسم تھا پسینے چھوٹ رہے تھے۔ہم پنکھے کے نیچے کھڑے ہو گئے۔مال کی بات ہے کہ لوگ گرمی سے شرابور بھی ہوئے جا رہے ہیں اور گرم گرم چائے بھی نوش کر رہے ہیں۔گاڑی آنے میں کچھ وقت تھا۔میں چچا کو سٹال پر لے گیا اور انہیں بھی کوکا کولا کی ایک بوتل پیش کی اور خود بھی پی جس سے ہماری پیاس کچھ ہلکی ہو گئی۔دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔یہ سن کر ہمارا دل بہت کڑھا کہ گرمی شدت کی ہے اور

خواہ مخواہ انتظار کرنا پڑ رہا ہے۔ بے مقصد انتظار بہت ہی پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔

اتنے میں ہم نے سوچا کہ جو سامان ہم نے بک کرایا ہے اسے کسی سے کہہ سن کر اٹھوالائیں تاکہ وہ اسی گاڑی سے ہمارے ساتھ ہی کراچی پہنچ جائے کیونکہ اگر دوسری گاڑی میں آیا تو ہمیں بھی تکلیف ہوگی۔ لہٰذا ہم بابو کے پاس گئے۔ اس کی منت سماجت کی کہ آپ کی مہربانی ہوگی ہمارا سامان اسی گاڑی سے بھجوا دیں۔ آدمی کوئی بیچارہ شریف ہی تھا مان گیا۔ ہمارا سامان پلیٹ فارم پر بریک میں رکھنے کے لئے بھیج دیا۔ ہم نے کہا کہ یہ تو ٹھیک ہوگیا۔ ورنہ پتہ نہیں یہاں کتنے دنوں تک سامان خراب ہوتا رہتا۔ ابھی گاڑی آنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ ہم پلیٹ فارم پر ہی آ کر کھڑے ہوگئے۔

لوگ بک سٹالوں پر کھڑے اخبار کی سرخیاں پڑھ رہے تھے۔ کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔ قلی سرخ وردی زیب تن کئے اور پیتل کا بیج بازو پر باندھے، باہر سے سامان لا لا کر پلیٹ فارم پر رکھ رہے تھے۔ مختلف گیٹوں پر ٹکٹ کلکٹر صاف ستھری سفید وردیاں پہنے کھڑے تھے۔ ریلوے کا دوسرا سٹاف بھی ادھر ادھر جا رہا تھا۔ کوئی سیٹوں کی ریزرویشن کر رہا تھا۔ کچھ لوگ اپنے اپنے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ پولیس والے بھی گھوم رہے تھے۔ گویا ایک عجیب گہما گہمی تھی۔ شور اس قدر تھا کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وینڈر (ریڑھوں والے) بھی آوازیں لگا رہے تھے۔ کوئی گوشت روٹی کی آوازیں لگا رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا ٹھنڈا اور میٹھا شربت

پیو۔کوئی چائے گرم کی آوازیں نکال رہا تھا۔اسی طرح سے یہ وقت بھی گزر گیا۔

تھوڑی دیر بعد اچانک دور سے ٹرین کا انجن نمودار ہوا۔اسے دیکھتے ہی لوگ ایک دم چوکنے ہو گئے۔جو بیٹھے تھے اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے اپنا اپنا سامان اٹھانا شروع کر دیا یا کسی قلی کو بلانا شروع کر دیا۔اتنے میں شاہانہ جلال و تمکنت کے ساتھ گرجتی ہوئی تیز گام پلیٹ فارم کی حدود میں داخل ہوئی۔سارے قلی اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔گاڑی آہستہ ہوتی گئی۔حتیٰ کہ انجن پلیٹ فارم کے اگلے سرے تک پہنچ گیا۔لوگ اپنے اپنے ڈبے کا نمبر پڑھ رہے تھے۔جونہی کوئی مطلوبہ بوگی سامنے سے گزرتی مسافر آگے کو دوڑ لگا دیتے۔ہم آرام سے کھڑے رہے۔ہمیں اطمینان تھا کہ چونکہ ہماری سیٹ ریزورڈ ہے وہ ہر حال میں ہمیں مل ہی جائے گی۔گاڑی کھڑی ہوگئی تو ہم بھی اپنے ڈبے کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے لوگ آداب سے بالکل غافل ہیں اور ایسے موقعوں پر تو خاص طور سے افراتفری مچاتے ہیں۔ایسا ہی ہوا۔جونہی گاڑی کھڑی ہوئی۔مسافروں نے گاڑی پر دھاوا بول دیا۔وہ یہ بھی نہیں دیکھتے تھے کہ جن مسافروں نے اترنا ہے پہلے انہیں اتر لینے دیں۔کوئی سامان اندر کو دھکیل رہا ہے۔کوئی باہر کو نہ اس کا سامان اندر داخل ہوتا ہے نہ دوسرے کا باہر آتا ہے۔گویا اس قدر بدنظمی کا سماں پیدا ہو گیا کہ الامان۔کمزور آدمی نہ اتر سکتے ہیں نہ چڑھ سکتے ہیں۔وہ جتنی چیخیں مارتے جائیں کوئی سنتا نہیں۔کوئی دس منٹ تو خوب دھکم پیل ہوتی رہی۔اس کے بعد کچھ سکون ہو گیا۔میں نے چچا کو اشارہ کیا کہ

آیئے وہ جب اندر داخل ہوئے ساتھ میں بھی اندر چلا گیا۔ سیٹ تک پہنچنے میں اس قدر دقت کا سامنا کرنا پڑا جس کی حد نہیں۔ لوگوں نے راستے میں سامان ڈال ڈال کر گزرنا محال کر رکھا تھا۔ خدا خدا کر کے سیٹ تک پہنچے، برتھ پر بستر لگایا اور چچا کو سیٹ پر بٹھا دیا۔ سگنل ڈاؤن ہوا۔ گارڈ نے سیٹی دے کر سبز جھنڈی ہلانا شروع کی۔ میں چچا سے سلام دعا کر کے گاڑی سے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ لوگ اپنے اپنے عزیز و اقربا کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔ میں نے بھی چچا جان کو الوداعی سلام کیا اور واپس آیا۔

تندرستی ہزار نعمت ہے

تنگ دستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

مرزا غالب نے جو یہ کہہ دیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ تندرستی اسی صورت میں ہزار نعمت ہے جب انسان تنگ دست نہ ہو۔ غالب کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تنگ دستی نہ ہو بلکہ خوشحالی ہو تو تندرستی اور بھی زیادہ نعمت بن جاتی ہے۔ کیونکہ تندرستی ہو تو تنگ دستی کا عقدہ بھی محنت سے حل ہو سکتا ہے اور محنت صرف صحت سے کی جا سکتی ہے۔ بیمار انسان تو محنت سے تنگدستی دور نہیں کر سکتا۔ اس سے ثابت یہ ہوا کہ تندرستی ہر حال میں نعمت ہے۔ تنگ دستی اپنی جگہ پر اور خوشحالی اپنی جگہ پر ہے۔ تندرستی ہر حال میں تندرستی ہے۔ تنگ دست و خوشحال دونوں کے لئے ضروری ہے اور نعمت ہے۔

انسانی جسم ایک مشین کی مانند ہے۔ مشین کا ایک پرزہ خراب ہو جانے سے ساری مشین بیکار ہو جاتی ہے۔ جب انسان کا کوئی عضو کام نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو غلط کام کرتا ہے یا تکلیف کا باعث بنتا ہے تو وہ بیمار کہلاتا ہے۔ صحت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ صحت کے بغیر انسان نہ اپنے کام آ سکتا ہے نہ کسی دوسرے کا کچھ سنوار سکتا ہے۔ وہ نہ دنیاوی فرائض سرانجام دے سکتا ہے اور نہ اپنوں اور عزیزوں کی مدد کو پہنچ سکتا ہے وہ نہ خدمت خلق کر سکتا ہے اور نہ ملک و ملت کے لیے کوئی قربانی پیش کر سکتا ہے۔

تندرستی ہی میں تو کھانے، پینے اور پہننے کا مزا ہے ورنہ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ تندرستی نہ ہو تو بہار بھی انسان کے لیے خزاں ہے۔ وادی پر فضا بھی اس کے لیے بیکار ہے۔ وہ نہ تو بادِ نسیم سے اور نہ ہی پرندوں کے سریلے گانوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ دنیا کی تمام دلچسپیاں تندرستی کے بغیر کسی کام کی نہیں۔ ندی کا شور، لہروں کا رقص، آبشاروں کے نغمے، سبزہ زاروں کی لہلہاہٹ اور پھولوں کی مہک ان سب کا لطف تندرستی سے ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ دنیا کی ہر نعمت بیمار آدمی کے لیے بیکار ہے۔ قدرت نے انسان کے لیے کس قدر نعمتیں پیدا کیں ہیں۔ طرح طرح کے خوش ذائقہ پھل، گھی، دودھ مکھن، مٹھائیاں یہ تمام اس کے لیے شجرِ ممنوعہ بن جاتی ہیں۔

تندرستی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایک خاص نعمت ہے۔ جو لوگ اس نعمت سے مالا مال ہیں وہی دنیا میں کامیاب و کامران رہ سکتے ہیں۔ تندرستی سے غربت میں بھی محنت کر کے گزارہ کیا جا سکتا ہے مگر بیمار آدمی کے پاس قارون کا خزانہ بھی ہو تو اس کے لیے کسی کام کا نہیں۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر ترستا رہتا ہے۔ تندرستی دولت سے بھی بہتر ہے۔ انسان کو زندگی میں کبھی دماغ سے کام کرنا پڑتا ہے کبھی جسم سے لیکن بیمار آدمی کی دونوں طاقتیں کم ہو گئی ہوتی ہیں۔ وہ بیٹھا اپنی قسمت پر کڑھتا رہتا ہے وہ اپنی رائے اور اپنے بال بچوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔ اسے دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے اور بسا اوقات دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کا مکروہ فعل بھی کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ کئی غیرت مند لوگ ایسی

زندگی سے تنگ آ کر اپنے ہاتھوں ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح کرنے سے وہ اپنا سفر زندگی تو ختم کر لیتے ہیں مگر اپنے گھر والوں کو مزید تکلیف میں چھوڑ جاتے ہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے قومی مشاہیر، سائنس دان، فلسفی بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ڈاکٹر محقق یہ سب تندرستی سے ہی اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ ان کے دماغ بھی تندرست ہوتے ہیں اور جسم بھی اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ان کا پورا پورا ساتھ دیں۔ مشہور عالم مہم جو تندرستی کے سہارے شہرت حاصل کرتے ہیں۔ وہ تندرستی ہی کے باعث اونچی چوٹیاں سر کرتے ہیں، سمندروں کو چیرتے ہیں اور چاند اور دیگر سیاروں تک پہنچتے ہیں۔ بڑے بڑے جنگ جو صحت کے بل بوتے پر ہی تسخیر عالم کے منصوبے بناتے ہیں۔

بیمار آدمی صرف خود ہی بیزار نہیں ہوتا بلکہ اپنے گھر والوں تیمارداروں اور عزیز و اقارت کے لئے بھی وبال جان بن جاتا ہے۔ ایک شخص کی تکلیف کی وجہ سے بہت سے آدمیوں کو اس کے لئے بیکار ہونا پڑتا ہے۔ کسی کو تیمارداری کرنا پڑتی ہے۔ کوئی ہسپتال میں اس کی دیکھ بھال کے لیے تعینات ہوتا ہے۔ کوئی اس کی جگہ پر ذمہ داریاں سنبھالتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس ایک آدمی کی بیماری اسی طرح نقصان دہ ہوتی ہے جس طرح اس کی غیر موجودگی، بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ ایک تو وہ بیماری کی وجہ سے خود مجبور ہوتا ہے دوسرے اوروں کو بھی اس کی دیکھ بھال کے لیے

مصروف ہونا پڑتا ہے۔

تندرستی قائم رکھنے کے لئے حفظان صحت کے اصولوں پر پابندی سے عمل کرنا چاہیے۔کھانے پینے میں اعتدال اور احتیاط کو اپنے شعار بنانا چاہیے۔خاص طور پر برسات کے موسم میں جب گرمی بھی زیادہ ہوتی ہے،مکھی کیڑے مکوڑے بھی نکل آتے ہیں اور گندے ندی نالوں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے جراثیم کش ادویات کا استعمال ضرور کرنا چاہیے۔اس کے علاوہ صحت کو بحال رکھنے کے لئے انسان کو سادہ غذا کھانی چاہیے۔مرغن غذائیں بہت سی بیماریاں مثلاً معدہ کی بیماریاں،شوگر بلڈ پریشر دل کے عوارضات پیدا کر دیتی ہیں۔انسان کی قوت مدافعت میں کمی پیدا کر دیتی ہیں۔برنارڈ شا سے کسی نے پوچھا تھا کہ اس کی لمبی عمر کا کیا راز ہے۔اس نے جواب دیا کہ سادہ غذا،لہٰذا غذا سادہ کھانی چاہیے اور سستی اور کاہلی کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دینا چاہیے۔اگر بدن چست رہے تو بہت سی بیماریاں انسان سے دور رہتی ہیں۔

حفظان صحت

تندرستی قائم رکھنے کے لئے حفظان صحت کے اصولوں کو سمجھنا اوران پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہ ایک دائمی حقیقت ہے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ بیمار آدمی کی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے لیے کارآمد ہوتا ہے نہ کسی کا کچھ سنوار سکتا ہے۔ محض محتاجی کی زندگی ہوتی ہے۔ وہ زندگی سے بیزار ہوتا ہے۔ نہ اس کا دل لباس پہننے کو چاہتا ہے۔ نہ اسے کوئی اچھی چیز کھانے میں مزہ ملتا ہے۔ وہ دولت ہوتے ہوئے بھی نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔ وہ اپنے لیے بھی تکلیف کا موجب بنتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔ لہٰذا صحت کی حفاظت کرنا اولین فرض ہے۔

جسم کی صفائی:

صبح سویرے اٹھ کر حاجات ضروریہ سے فارغ ہوتے ہی دانتوں کی صفائی کریں۔ اس کے بعد غسل کریں۔ غسل کرنے سے انسانی جسم کے مسام جو میل اور مٹی سے بند ہو جاتے ہیں، کھل جاتے ہیں۔ غسل کسی اچھے صابن سے کریں اور جسم کو خوب ملیں۔ نہانے کے بعد جسم کو تولئے سے خوب رگڑیں تا کہ مسام کھل جائیں۔ نہانے کے بعد سر میں تیل ضرور لگائیں تا کہ بالوں کو خوراک ملتی رہے اور سر کمزور نہ ہو۔ صبح کی سیر بھی ضرور کریں۔ اس سے تمام دن جسم چست رہتا ہے اور کئی بیماریوں سے خود بخود ہی چھٹکارا مل جاتا ہے۔

لباس کی صفائی:

جسم کے ساتھ ساتھ لباس کی صفائی کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کیونکہ غلیظ لباس بیماری پیدا کرتا ہے۔

صاف ہوا اور صاف پانی:

سانس لینے سے جو ہوا پھیپھڑوں کے اندر جاتی ہے اگر صاف ہو گی تو پھیپھڑے تندرست رہیں گے اور اگر صاف نہیں ہو گی تو انسان کئی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ ہوا، گرد و غبار، دھواں اور بو وغیرہ سے پاک ہونی چاہیے۔ سانس ناک کے ذریعے لینا چاہیے۔ اس سے ہوا گرم ہو کر اندر داخل ہوتی ہے۔ دوسرے ناک کے بال اور رطوبت ہوا کو صاف کر دیتے ہیں۔ جب ہوا ناک کے بیچ سے ٹکرا کر داخل ہوتی ہے تو صاف بھی ہو جاتی ہے اور مناسب حد تک گرم بھی۔ اسی طرح پانی بھی صاف ستھرا ہونا چاہیے اس کا ذائقہ خراب نہ ہو اور اس میں اور بدبو نہ ہو۔ صاف پانی سے صاف خون اور گندے پانی سے گندہ خون پیدا ہوتا ہے۔ گندے پانی کے استعمال سے معدہ کی بیماریاں اسہال، پیچش، ہیضہ وغیرہ لاحق ہو جاتی ہیں۔ جن دنوں متعدی امراض پھیلی ہوئی ہوں پانی کو ابال کر جراثیم کو مار کر ٹھنڈا کر کے استعمال کریں۔ صاف اور معتدل غذا استعمال کریں کیونکہ صحت کا انحصار غذا پر ہے۔ غذا صاف، پاکیزہ اور تازہ ہونی چاہیے۔ جہاں پر غذا تیار ہو وہ جگہ بھی صاف ہونی چاہیے۔ جو آدمی غذا تیار کرے اس کے ہاتھ اور لباس بھی

صاف ہونے چاہئیں۔غذا زیادہ مرغن نہ ہواور نہ ہی زیادہ خشک ہو۔غذا کو پکاتے وقت اس قدر نہ پکائیں کہ وہ جل جائے اوراس قدر کچی نہ رکھیں کہ ہضم نہ ہو۔ مرچ مصالحہ ڈالتے وقت بھی اعتدال اختیار کریں۔غذا سادہ اورمقوی ہونی چاہیے۔کھانا بھوک رکھ کر کھائیں اورکھانے کے بعد کبھی نہ نہائیں۔حکماء کا قول ہے کہ ''کھانے کے بعد پھر کھانا اورکھانے کے بعد نہانا''معدے کے ساتھ اسے سے اور بڑا کوئی ظلم نہیں ہے۔غذا کو خوب چبا کر کھائیں۔دانتوں کا کام معدے سے نہ لیں۔اچھی طرح سے چبائی ہوئی غذا میں لعاب کی آمیزش ہو جاتی ہے جو غذا کو ہضم ہونے میں معاونت کرتی ہے۔

مناسب نیند:

صحت کو قائم رکھنے کے لیے سونا اورآرام کرنا بھی ضروری ہے سونے کے معامہ میں بھی میانہ روی اختیار کریں۔زیادہ سونے سے بھی طبیعت سست پڑ جاتی ہے اورنیند پوری نہ کرنے سے بھی صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔لہٰذا اعتدال کوضرور مدنظر رکھیں۔رات کوجلدی سونا اورصبح سویرے اٹھنا صحت کے لیے مفید ہے۔

صبح کی سیر اورورزش:

صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ورزش بھی اسی قدر ہی ضروری ہے جس قدر غذا۔غذا اگر زندگی کو چلاتی ہے تو ورزش اس کے اعصاب کومضبوط رکھتی ہے اور

غفلت اور سستی دور کر کے جسم کو چست بناتی ہے۔اس سے دوران خون تیز ہو جاتا ہے اور جسم کے فاسد مادے زائل ہو جاتے ہیں۔ پسینہ کے راستے جسم کے فضلات صاف ہو جاتے ہیں۔ورزش میں بھی اعتدال لازمی ہے۔صبح کی سیر بھی ہلکی ورزش کہلاتی ہے۔صبح کی سیر باقاعدگی سے کرنا چاہیے۔

عادات واخلاق بھی صحت مند ہونے چاہئیں۔ بیماریوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی انسان میں برائیاں اور بداخلاقی پیدا ہوئیں اس نے انسان کے ذہن پر برے اثرات چھوڑے اور ذہنی اثرات جسم میں منتقل ہو گئے اور بیماری کا موجب بنے۔لہٰذا بری عادات سے برے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور بیماری بڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔نشہ آور چیزوں کا استعمال بھی بری عادتوں میں شامل ہے۔نشہ انسان کی صحت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔جدید سائنسی تحقیقات نے تو یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ سگریٹ نوشی سرطان پیدا کرتی ہے۔انسانی عادات واخلاق کا بھی صحت کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔اس لئے اندازہ کریں کہ دوسری نشہ آور چیزیں کتنا نقصان کرتی ہیں۔

دانتوں کی حفاظت

قدرت نے جس طرح جسم کی مشینری میں مختلف قسم کے اعضاء فٹ کر کے ان کے ذمے الگ الگ کام سونپا ہے اسی طرح دانتوں کے حصے میں بھی بہت اہم کام آیا ہے۔ انسان کی مشینری کو چلانے کے لئے غذا اہم ترین چیز ہے اور غذا کو معدے تک پہنچانے کے لئے دانت اسے چبا کر باریک کرتے ہیں تا کہ معدے کو صرف ہضم کرنے کا کام ہی کرنا پڑے چبانے کا کام نہ کرنا پڑے۔ اس لحاظ سے دانتوں کی ڈیوٹی سب سے اہم ہے۔ لوگ دانتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور نہ ہی ان کی طرف توجہ دیتے ہیں حالانکہ صحت کا دارومدار بہت حد تک دانتوں پر ہوتا ہے۔ اگر دانت درست نہ ہوں تو تکلیف کا باعث بنتے ہیں اور خوراک کو چبانے کا اہم فرض بھی سرانجام نہیں دے سکتے۔ یہ کام معدہ کو کرنا پڑتا ہے جس سے معدہ صحیح طور پر غذا کو ہضم نہیں کر سکتا اور نہ ہی غذا صحیح طرح ہضم نہ ہونے کی وجہ سے جزو بدن بن سکتی ہے۔ دانت اس وقت خراب ہوتے ہیں جب ان کی صفائی نہ ہو۔ گندے ہوں ان میں پائیوریا وغیرہ کی بیماریاں پیدا ہو جائیں اور اگر دانت گندے ہوں اور پائیوریا میں مبتلا ہوں تو نہ صرف غذا کو صحیح طور پر چبانے میں قاصر رہتے ہیں بلکہ غذا کے ساتھ معدے میں زہریلا مادہ بھی داخل کرتے ہیں پائیوریا یا تیزابی مادہ پیدا ہونے سے منہ میں تعفن اور نا قابل برداشت بو پیدا ہو جاتی ہے۔ بیمار دانت بہت سی بیماریوں کا موجب بنتے ہیں اور اگر دانت صحت مند ہوں تو صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔ لہٰذا دانت جسم کا بہت ہی اہم حصہ ہیں۔ ان کی

طرف سے شروع سے ہی خاص توجہ دینی چاہیے کیونکہ دانت بظاہر ہڈی کے ہوتے ہیں مگر ان کی اہمیت اور قیمت ہیروں اور جواہرات سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

دانت اگر نکل گئے ہوں تو چہرہ بہت ہی بدزیب دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ساری خوبصورتی بدنمائی میں بدل جاتی ہے۔ اگر مصنوعی لگوا بھی لئے جائیں تو قدرتی دانتوں جیسا کام سرانجام نہیں دے پاتے اور چند ماہ بعد ڈھیلے ہو کر بیکار ہو جاتے ہیں قدرتی دانت مضبوط بھی خوب ہوتے ہیں کیونکہ ان کی جڑیں جبڑوں کے اندر تک گئی ہوئی ہوتی ہیں اور قدرت نے انہیں اتنی کاریگری سے فٹ کیا ہوتا ہے کہ ہلنے کا نام نہیں لیتے۔ پائیوریا ایسا ظالم مرض ہے جو مسوڑوں کے گوشت کو ڈھیلا کر دیتا ہے۔ ان میں پیپ پیدا ہو جاتی ہے۔ تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ تیزابی مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح ڈھیلے پڑ کر درد کرنے لگ جاتے ہیں۔ درد کی تکلیف ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ انسان تنگ آ کر دانت نکلوانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے پہلے کوشش کرنا چاہیے کہ دانت بچ جائے۔ کیونکہ دانت ضائع ہو جانے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں ہوتا۔ پائیوریا تعفن، کیڑا، تیزابی مادہ، گڑھا یا کھوڑا ان سب کا علاج ہو سکتا ہے جب تک یہ امراض انتہائی صورت اختیار نہ کر لیں۔ ابتدائی مراحل میں ان کا علاج بہت آسان ہے۔ دکھتے ہوئے دانت سے چند منٹوں میں اسے نکلوا کر نجات مل جاتی ہے اور اگر اس کا بذریعہ دوائی علاج کروانا ہو تو مہینوں لگتے ہیں۔ محض ذرا احتیاط اور توجہ اور وقت درکار ضرور ہوتا ہے

اس سے دانت ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔

دانتوں کی طرف شروع ہی سے توجہ دینی چاہیے۔ ان کی صفائی ہر روز کرنی چاہیے۔ ایک دفعہ نہیں بلکہ دن میں کم از کم دو بار، یعنی صبح اور رات کو سوتے وقت دانتوں کی صفائی ضرور کرنی چاہیے۔ صفائی اچھی قسم کے منجن یا پیسٹ یا مسواک سے کرنی چاہیے۔ دن کے درمیانی حصے میں جب بھی کوئی چیز کھائی جائے تو کلی کر کے دانتوں میں اٹکے ہوئے خوراک کے ذرات کو صاف کرنا لازمی ہوتا ہے۔ ورنہ یہی چھوٹے چھوٹے ذرات زہر بن جاتے ہیں اور دانتوں کی بیماری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

منجن یا پیسٹ کے لئے ایسا برش استعمال کرنا چاہیے جو بہت ہی نرم ہو۔ خاص طور پر جب پہلے پہل برش کا استعمال شروع کیا جائے تو برش کا ریشہ بہت ہی نرم ہونا چاہیے کیونکہ اس وقت مسوڑھے برش کے عادی نہیں ہوتے اور مسوڑھوں میں زخم ہو جانے سے مزید تکلیف ہو جاتی ہے۔ اس طرح کئی لوگ برش کرنے سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔ جب مسوڑھے سخت ہو جائیں یا برش کے عادی ہو جائیں تو سخت برش بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ برش دانتوں کی بناوٹ یا ان کی فٹنگ کے مطابق ہونے چاہئیں۔ بعض دانت ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ اونچے نیچے نہیں ہوتے ان کے لئے برش بھی اونچے نیچے نہیں ہونے چاہئیں۔ جو دانت گڑھے رکھتے ہیں یا بہت ہی زیادی اونچے نیچے ہیں انکے لئے برش بھی اس قسم کے استعمال کرنے چاہئیں۔ کہ ان کی پوری صفائی ہو سکے۔ برش

نرمی سے کرنا چاہیے تا کہ مسوڑوں کو تکلیف نہ پہنچے۔

دانتوں کی صفائی مسواک سے بھی ہوسکتی ہے۔ بعض مسواکیں مسوڑوں میں ریشہ پیدا نہیں ہونے دیتے جن میں کیکر یا پھلاہی کی مسواک خاص طور پر مفید ہے لیکن مسواک کا سرا اس طرح سے بنانا چاہیے کہ یہ برش کا کام کرے۔ دانتوں میں سے ذرات یا میل باہر نکال سکے۔ مسواک کرنا سنت رسولؐ ہے۔ پانچوں وقت کی نماز کے ساتھ مسواک کرنے سے دانت درست رہتے ہیں۔ ویسے بھی مسواک کے علاوہ کئی دفعہ دن میں کلی کرنا غرارے کرنا مسنون ہے تا کہ دانت صاف ہوتے رہیں اور بیماری نزدیک نہ پھٹکے۔ حضور پاکؐ کا ارشاد ہے کہ جب گھر میں داخل ہوں یا کسی محفل یا کسی پاک مجلس میں داخل ہو تو غرارے ضرور کیا کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضور پاکؐ نے دانتوں کی صفائی کو بہت اہمیت دی ہے کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اچھی صحت کا انحصار تندرست دانتوں پر ہے۔

تمباکو نوشی اور اس کے نقصانات

تمباکو نوشی بلا شبہ ایک مضر صحت عادت ہے بلکہ اگر کہا جائے کہ یہ ایک ہلکے درجے کا نشہ ہے تو غلط نہ ہو گا۔ تمباکو نوشی سے انسان کو ایک سرور سا محسوس ہوتا ہے۔ اس سرور کو حاصل کرنے کے لئے وہ بار بار کوشش کرتا ہے خاص طور پر جب اس کا اثر زائل ہو جائے۔ چونکہ یہ ایک ہلکے قسم کا نشہ ہے اس کا اثر بھی دیر پا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کے کش جلدی لگانے پڑتے ہیں۔ اس کے مضر اثرات کی مقدار فی کش کم ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے زہر کی شدت کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن کم مقدار میں بھی اگر بار بار لیا جائے تو اس کی مقدار کم نہیں رہتی اور اس کے زہریلے اثرات بھی کم نہیں رہتے۔ زہر کی تعریف بھی یہی ہے کہ وہ غنودگی پیدا کرتا ہے اور اس سے سرور ملتا ہے۔ اس کا اثر ختم ہونے پر پھر اس کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پھر اسے کھانا یا پینا پڑتا ہے۔ اس سے اس کے زہر میں صرف شدت ہی کا فرق ہے تیز زہر جلدی اثر دکھاتا ہے جبکہ ہلکی قسم کا زہر جلدی اثر نہیں دکھاتا لیکن نقصان دہ ضرور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے زہر کھا لینے یا سگریٹ نوشی کرنے میں نقصان کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سنکھیا کھا لینے سے انسان چند منٹوں میں مر جاتا ہے اور سگریٹ پینے والے کے جسم پر برسوں میں اس کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ بہر حال زہر زہر ہے اور ہر حال میں مضر صحت ہے۔ اس کا اثر تیز ہو یا اس قدر کم کہ محسوس نہ ہو۔ صحت کے لئے نقصان دہ ہے۔

تمباکو ایک چھوٹا سا چوڑے چوڑے پتوں والا پودا ہوتا ہے۔ اس کا قد اور شکل

پتوں والی گو بھی جیسی ہوتی ہے۔ اسے کاٹ کا سکھایا جاتا ہے۔ دنیا کے اکثر خطوں میں اس کی کاشت ہوتی ہے۔ غالباً پندرھویں صدی عیسوی سے اس کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے انگلستان میں سر والٹر ریلے نے اس کو استعمال کیا تھا۔ ایک روایت ہے کہ جب سر والٹر کے منہ سے اس کے ایک ملازم نے دھواں نکلتا دیکھا تو اس پر پانی کی بالٹی ڈال دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے آگ لگ گئی ہے۔ بہت سے لوگ یوں کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حکماء نے اسے بطور دوائی استعمال کیا تھا۔ معدہ کی ہوا خارج کرنے کے لئے اسے استعمال میں لایا گیا تھا۔ بعد میں یہ امراء و رؤساء کے محلوں کی زینت بن گیا اور اس طرح یہ عوام الناس میں بھی استعمال ہونے لگا۔

فی زمانہ تمباکو نوشی ایک فیشن بن گئی ہے۔ ہر نوجوان اور خوش پوش آدمی اگر اچھی قسم کے سگریٹ کی ڈبی جیب میں نہ رکھتا ہو تو اسے قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ جس قدر اونچا سگریٹ وہ استعمال کرتا ہوگا اسی قسم کی ہائی جنٹری کا آدمی متصور ہوگا۔ ان لوگوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اس کے نقصانات کس قدر ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ کسی تمباکو نوش سے آپ سوال کریں کہ آپ تمباکو پیتے ہیں ذرا ہمیں بھی اس کے فوائد سے آگاہ فرمائیں تو اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی جواب نہیں ہوگا کہ بس جی ایک بری عادت پڑ گئی ہے۔ اس کا فائدہ تو کوئی نہیں بس ایک نشہ ہے جس کا انسان عادی ہو جاتا ہے۔ نشے کے عادی انسان کی عقل و دانش پر سوائے رونے کے اور تو کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔ وہ خود مانتے بھی ہیں کہ سامنے گڑھا ہے اور چلے بھی جا رہے ہیں۔ معلوم بھی ہے کہ گڑھے میں

گریں گے مگر نشہ ترک نہیں کرتے ۔ یہ کیا منطق ہے ۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ تمبا کو نوشی نقصان دہ ہے اس کا فائدہ کوئی نہیں مگر پئے جا رہے ہیں ۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ خود فریبی میں مبتلا ہیں ۔

تمبا کو نوشی مسلمہ طور پر مضر صحت عادت ہے ۔ اس سے کھانسی، سر درد، لرزہ، مرگی، اعصاب کی کمزوری، ضعف حافظہ، سکتہ، بے خوابی، فالج، دیوانگی، ٹی بی، ضعف بصر، ضعف دل، بلڈ پریشر، جیسی نامراد بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں ۔ ستم بالائے ستم یہ کہ سگریٹ ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے اور کھانس بھی رہے ہیں ۔ دم گھٹا جا رہا ہے لیکن وہ سگریٹ والا ہاتھ سگریٹ کو پھینکنے کی بجائے پھر منہ کی طرف ہی لاتا ہے اور اس سے کھانسی اور زیادہ ہوتی ہے ۔ مگر دماغ یہ کام نہیں کرتا کہ اس کم بخت سگریٹ کو ہی پھینک دیں اس لئے کہ تمبا کو نوشی کی بری عادت پڑ گئی ہوتی ہے ۔ زہر کھانے سے سکون محسوس ہوتا ہے ۔ زندگی جاتی ہے تو جائے گھر کا چراغ بجھتا ہے تو بجھ جائے مگر سگریٹ سے پیمان وفاداری میں فرق نہ آئے ۔ سگریٹ سے وفاداری اور اپنے آپ سے اور خاندان سے دشمنی ۔ یہ انداز فکر خوب ہے ۔

جدید تحقیق نے تو یہاں تک ثابت کر دیا ہے کہ سرطان کی بیماری کا موجب بھی تمبا کو نوشی ہے ۔ روزانہ ٹی وی پر آتا ہے اور سگریٹ کی ڈبیہ پر بھی لکھا ہوا ہے کہ یہ مضر صحت ہے مگر کوئی اثر نہیں بلکہ تمبا کو نوشی کے نئے نئے طریقے ایجاد کر لئے ہیں ۔ کوئی تمبا کو کو بطور نسوار استعمال کرتا ہے ۔ کوئی ناک کے ذریعے اور کوئی منہ میں رکھ کر استعمال کرتا ہے ۔ ناک میں استعمال کرنے سے دماغ کی جھلیاں کمزور

ہو کر نزلے میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور نسوار منہ میں رکھ کر دانت ضائع کر لیتے ہیں۔ اس پر ہی کیا موقوف سگریٹ کو چرس پینے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یاد رکھئے نشہ کرنے والوں کی ابتداء سگریٹ سے ہی ہوتی ہے۔ نشہ کھانے والے لوگ یقیناً سگریٹ کے عادی ہوتے ہیں اور جو لوگ تمباکو نوشی نہیں کرتے وہ کسی قسم کا نشہ استعمال نہیں کرتے۔ تمباکو نوشی کی بری عادت انسان کو بری سے بری منشی اشیاء کھانے کا عادی بنا دیتی ہے۔

ایٹم بم اور اس کی تباہ کاریاں

ایٹم بم ایسا بم نہیں جو ایک توپ کے منہ سے نکل کر زمین پر گڑھا پیدا کر دے، اس میں سے ٹکڑے نکل کر جن آدمیوں کو لگیں انہیں زخمی کر دیں تھوڑی دیر تک گرد وغبار اٹھے اور چند انسانی زندگیوں کو تلف کر دے اور بس، آج کا ایٹم بم وہ نہیں جسے امریکہ نے جنگ عظیم دوم کے اواخر میں جاپان کے شہر ہیروشیما میں پھینک کر ہزاروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بلکہ ایٹم بم سے مراد آج کے اس ایٹم بم سے ہے یا مستقبل میں تیار ہونے والے اس ایٹم بم سے ہے جو آج کے ایٹم بم سے کئی گنا زیادہ تباہ کن ہوگا جو ساری دنیا کو پلک جھپکنے میں تباہ و برباد کر دے گا نہ کہیں زندگی کا نام ونشان باقی رہے گا نہ کہیں نباتات ہوگی۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے اور سمندروں کا پانی بھاپ بن کر اڑنے لگے گا۔ اس سے ہونے والی تباہی کا تصور ہی دل کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا اور اسے کائنات کی ہر چیز کو تسخیر کرنے کی طاقت سے نوازا۔ اسے عقل دی کہ خیر وشر میں تیز کر سکے اور صلاحیت تحقیق وتجسس بخشی کہ اپنے اور اپنے وطنوں یا دیگر انسانیت کے لئے آرام و آسائش کا سامان مہیا کرنے اور جذبہ ہمدردی سے اس دنیا کو نمونہ جنت بنا کر دکھائے۔ اسی لئے انسان اپنے علم کے زور سے قدرتی عناصر کو زیر کرتا رہتا ہے اور طاقت وقوت کے بہت سے سرچشموں کا کھوج لگاتا رہتا ہے۔ اس کے جذبہ تحقیق و تجسس نے ایسی ایسی چیزیں بھی ایجاد کیں جنہوں نے دکھی انسانیت کے زخم پر

مرہم کا کام کیا۔

زندگی آسان کر دی۔ ملکوں کے فاصلے دور کر دیئے۔ ذرائع آمدورفت میں سہولتیں پیدا کیں۔ نظام مواصلات کو اس قدر ترقی دی کہ دنیا کی ہر چیز اسی وقت یہاں سنی جا سکتی ہے۔ دنیا کے واقعات یہیں بیٹھے ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ ہوا کے دوش پر پرواز کر کے گھنٹوں میں آدمی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بحفاظت پہنچ جاتا ہے۔ انسان نے چاند تک رسائی کر لی ہے۔ یہ سب چیزیں انسان کے سکھ اور آرام کے لئے پیدا کی گئیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کی خودغرضی بھی اس حد تک بے لگام ہو گئی کہ وہ حقوق العباد کی سرحدیں پار کر کے تباہی کے کنارے پہنچ گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایٹمی توانائی اچھے مقاصد کے لئے بھی استعمال ہو رہی ہے۔ مگر یہ جو ایٹم بم کی تیاریاں ہو چکی ہیں۔ اور قسم قسم کے ایٹم بم بنانے کے منصوبے تیار ہو رہے ہیں یقیناً انسانیت کو تباہ کر کے چھوڑیں گے۔ پہلی جنگ عظیم بندوق سے شروع ہوئی تھی۔ ہوائی جہاز پر ختم ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم ہوئی جہاز اور ٹینک سے شروع ہوئی ایٹم بم پر ختم ہوئی اور اب پتہ نہیں خدانخواستہ تیسری جنگ کہاں سے شروع ہو گی اور کہاں ختم ہو گی ایک بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ یہ چیز انتہائی تباہ کن ہو گی اور جہاں جا کر ختم ہو گی۔ اس کا اندازہ لگانے کے لئے کوئی بھی انسان زندہ نہیں ہو گا۔

آج دنیا کی ہر بڑی طاقت اس کوشش میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ تباہ کن

ہتھیار تیار کرے۔ آج روس، امریکہ برطانیہ، فرانس اور چین وغیرہ کے پاس ایٹمی ہتھیار موجود ہیں آج وہ ملک اپنے آپ کو کسمپرسی کی حالت میں سمجھتا ہے جس کے پاس ایسے مہلک ہتھیار نہ ہوں۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا مہلک سے مہلک تر ہتھیار ایجاد ہوتے رہیں گے۔ جس کی کوئی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ ان تمام چیزوں کا علاج صرف اور صرف ایک ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے۔ انسانیت سے جذبہ ہمدردی بیدار ہو جائے تو خود غرضی کی دوڑ ختم ہو سکتی ہے۔ جو کچھ بھی تباہی کا سامان پیدا ہو رہا ہے اس کا سبب دوسروں کی حق تلفی اور دوسروں کا استحصال ہے۔

آج ہر انسان سوچ رہا ہے کہ کہیں دنیا چشم زدن میں نیست و نابود نہ ہو جائے اور وہی ہتھیار جو اس نے دوسروں کی تباہی کے لئے تیار کئے ہیں اس کی اپنی ہلاکت کا باعث نہ بن جائیں۔ انسان نے جدوجہد سے جس دنیا کو اپنے آرام و آرائش کا گہوارہ بنایا تباہ ہو جائے گی۔

موجودہ دور میں سائنس نے جو ترقی کی ہے وہ قابل قدر ہے۔ صدیوں سے انسان اپنی پرانی اور غیر ترقی یافتہ ڈگر پر چلا آ رہا تھا لیکن آج اس نے حیران کن حد تک ترقی کر لی ہے اور جو کچھ انسان نے اپنی سہولت کے لئے بنایا ہے اس سے یکسر محرومیت کا خیال روح کو تڑپا دیتا ہے کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو کوئی ایٹمی طاقت جذبات سے مغلوب ہو کر تباہ کن ہتھیار استعمال کرنے سے گریز نہیں کرے گی۔ یہ مہلت اسی وقت تک ہے جب تک یہ استعمال نہیں ہوتے۔ جب استعمال ہونا

شروع ہو گئے پھر یہ موقع ہاتھ سے نکل چکا ہو گا۔ لہٰذا امن پسند ذہنوں کو اس کے انسداد کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ سوچنا چاہیے مگر خود غرضی اور منافقت سے نہیں بلکہ خلوص اور ہمدردی کے ساتھ۔ دنیا کا ہر جھگڑا اور ہر مسئلہ اس وقت ختم ہو سکتا ہے جب انسان دل میں جذبہ ایثار و قربانی رکھتا ہو اور اگر پالیسی یہ ہو کہ شور تو ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی لگانے کا مچایا جا رہا ہو اور اندر ہی اندر ان کی تیاری بھی ہو رہی ہو تو یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہو سکتا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سیلاب کی تباہ کاریاں

''سیل آب''یعنی پانی کی طغیانی، اس کی دو بڑی وجوہات ہوتی ہیں۔موسم سرما میں پہاڑوں پر برف جم جاتی ہے۔جوموسم گرما میں پگھلنا شروع ہو جاتی ہے لیکن برف کے پگھلنے سے جو پانی بنتا ہے اسے دریا سنبھال لیتے ہیں۔یہ پانی کسی نقصان کا باعث نہیں ہوتا مگر جب پہاڑوں پر بہت زیادہ بارش ہوتی ہے تو پہاڑوں سے یک لخت جو پانی دریاؤں میں آ جاتا ہے۔دریا اسے نہیں سنبھال سکتے۔اور یہ پانی دریاؤں سے باہر نکل کر میدانی علاقے میں آ جاتا ہے۔اسے سیلاب کہا جاتا ہے۔یہ بہت ہی تباہ کن ہوتا ہے کیونکہ پگھلی ہوئی برف اور بارشوں کا پانی مل کر طوفان برپا کر دیتے ہیں۔

سیلاب اکثر موسم برسات میں آتے ہیں کیونکہ برسات کے دنوں میں بارشوں کی وجہ سے دریاؤں میں زیادہ پانی آ جاتا ہے۔بعض دفعہ تو کم نقصان ہوتا ہے مگر بعض دفعہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ تباہی مچا دیتا ہے۔سیلاب سے وہ علاقے یا گاؤں زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو دریاؤں کے کنارے آباد ہوتے ہیں یا وہ دیہات جو نشیبی علاقوں میں ہوتے ہیں خاص طور پر سیلاب کی زد میں آ جاتے ہیں۔جب سیلاب آتا ہے تو جو حالت اس علاقے کے لوگوں کی ہوتی ہے وہ ناقابل برداشت ہوتی ہے ان کی فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور مویشی مر جاتے ہیں۔ان کے مکان زمین بوس ہو جاتے ہیں اور پانی گھروں میں گھس جاتا ہے۔ان کے گھروں کا سامان، خوراک، مویشیوں کا چارہ اور ایندھن وغیرہ سب ضائع ہو

جاتے ہیں۔ اوپر سے اکثر بارش تباہی مچا رہی ہوتی ہے۔ اس وقت ایک دوسرے کی مدد بھی کوئی نہیں کر پاتا کیونکہ سب خود مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ سب کو اپنی اپنی ہی پڑی ہوتی ہے۔

پچھلی چھٹیوں میں مجھے بھی سیلاب کی تباہ کاریاں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جب بھی مجھے سیلاب کے واقعات یاد آتے ہیں تو دل کانپ اٹھتا ہے اور زبان پر استغفار آ جاتا ہے۔

اگست کا مہینہ تھا۔ چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ میں اپنے ماموں کے ہاں گیا ہوا تھا۔ یہ گاؤں وزیر آباد کے نزدیک واقع ہے۔ رات ہم بڑے آرام سے سو رہے تھے کہ اچانک آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ اٹھو ہوشیار ہو جاؤ سیلاب آ گیا ہے۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ابھی صبح ہونے میں تھوڑا ہی وقت باقی تھا۔ اندھیرے میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا اٹھائیں اور کیا چھوڑیں اور کہاں جائیں سب سے زیادہ مصیبت یہ تھی کہ پانی کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ سیلاب کا رخ کس طرف زیادہ ہو گا اور کس قدر ہو گا۔ لوگ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ صبح کی روشنی ہونا شروع ہو گئی۔ لوگ اپنا سامان اور مویشی نکال رہے تھے کہ پانی آنا شروع ہو گیا۔ پانی کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اونچا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس گاؤں کے نزدیک ریلوے لائن ہے اور یہ ریلوے لائن ہے بھی بہت اونچی۔ لوگ اس کی طرف چل دیئے۔ کچھ لوگ مویشیوں کے اوپر ہی سامان رکھ کر چل دیئے۔ کچھ لوگ سروں پر سامان اٹھائے ہوئے تھے۔ کچھ گھر ایسے تھے جو

پختہ اور مضبوط تھے۔انہوں نے اپنا سامان چھتوں پر چڑھانا شروع کر دیا۔عورتیں اور بچے خوف سے چیخ رہے تھے اور مدد کے لئے پکار رہے تھے مگر ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔سوائے اپنے اپنے گھر والوں کے کوئی کسی کی مدد کم ہی کرتا تھا۔پانی جلدی جلدی چڑھ رہا تھا۔لوگ جلدی جلدی کسی محفوظ جگہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔کچھ لوگ ایک نزدیک والے اونچے ٹیلے پر جا چڑھے تھے گلیوں میں چار پانچ فٹ پانی بہہ رہا تھا۔پانی کی رفتار بہت تیز تھی جس کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ایسے میں سب کچھ بہ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔اوپر سے بوندا باندی بھی شروع ہوگئی تھی۔ٹھنڈی ہوا بھی چلنے لگی۔لوگوں کے سروں پر چھتیں بھی نہیں تھیں۔بچے،عورتیں اور ضعیف العمر لوگوں کی حالت قابل رحم تھی۔لیکن خدا کا شکر ہے کہ بارش تھم گئی اور ہوا بھی بند ہوگئی ورنہ بہت سے لوگ شاید اسی طرح مر جاتے۔سب سے زیادہ مصیبت تو یہ تھی کہ وہاں پر کوئی خوراک کا انتظام تھا نہ انسانوں کے لئے اور نہ مویشیوں کے لئے۔کچھ تھوڑا بہت جو تھا وہ اس قدر نا کافی تھا کہ اس سے بچوں کا گزارہ بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔

ابھی دو چار گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ لوگ وزیر آباد اور گجرات کی طرف سے آ رہے تھے۔ان میں سرکاری اور غیر سرکاری سماجی اور سیاسی تنظیموں کے کارکن شامل تھے۔ان میں مخیّر حضرات بھی تھے۔لوگ چاولوں کی دیگیں پکا کر لا رہے تھے۔کچھ روٹیاں اور دال لا رہے تھے۔گویا اس طرح دوپہر تک خداوند تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہمارے لئے فرشتہ رحمت بنا کر بھیج دیا تھا۔

یہ سیلاب دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔نظر آ رہا تھا کہ لوگ پانی میں گھرے ہوئے ہیں رضا کار اور فوجی پارٹیاں پانی میں گھرے لوگوں کو محفوظ مقامات پر پہنچا رہی تھیں۔ فوجی جوان اس طرح کشتیاں لے آئے جیسے کہیں ان کے نزدیک ہی رکھی ہوئی ہوں۔ انہوں نے سیلاب زدگان کی بہت مدد کی اور ان لوگوں کو خوراک بھی پہنچائی۔شام کو پانی اترنا شروع ہو گیا تھا۔ساری رات پانی اترتا رہا۔دوسرے دن تک پانی تھا مگر کم ہو گیا تھا۔اس طرح ہم تین دن تک وہیں رہے۔چوتھے روز ہم اپنے اپنے گھروں کو لوٹے مگر بہت سے مکان گر گئے تھے۔صرف پختہ مکان صحیح سلامت رہ گئے تھے۔فصلیں تباہ ہو گی تھیں۔اس کے بعد گویا لوگوں نے گاؤں کو ازسرنو آباد کرنا شروع کیا۔اس تعمیر نو میں حکومت بھی سیلاب زدگان کی مدد کرتی ہے اور سماجی تنظیمیں بھی ہاتھ بٹاتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مدد کافی نہیں ہوتی اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ لوگوں کا سیلاب سے ہونے والا نقصان پورا ہو جائے۔

بس کا حادثہ

اخبارات میں آئے دن بسوں کے حادثوں کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایک ایسا ہی حادثہ میرے سامنے پیش آیا۔ جب یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چند ماہ ہوئے میں لاہور سے راولپنڈی جا رہا تھا۔ لاہور سے باہر نکلتے ہی بسوں، کاروں اور ٹیکسیوں کے درمیان دوڑ کا مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ گوجرانوالہ تک سڑک ڈبل ہے اس لئے اتنے فاصلے میں نسبتاً کم حادثات ہوتے ہیں۔ گوجرانوالہ کے بعد سڑک یک طرفہ ہے۔ مگر ڈرائیور لوگ بالکل احتیاط نہیں کرتے سوائے چند ایک سمجھدار اور با اصول ڈرائیوروں کے سب ہی اس دوڑ میں شامل تھے اور ایک دوسرے کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں جی ٹی ایس کی بس میں سفر کر رہا تھا۔ ڈرائیور سمجھدار اور تجربہ کار دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ اس کی رفتار شروع سے ہی یکساں تھی۔ کوئی پیچھے رہ جائے یا آگے نکل جائے وہ اپنی صحیح رفتار سے چلتا گیا۔ ایسا بھی ہوا کہ سواریوں نے ڈرائیور پر قسم قسم کے آوازے بھی کسے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ چالیس پینتالیس کی رفتار سے آگے نہ بڑھا۔ گوجرانوالہ کے بعد وزیر آباد آیا وہاں سے بھی خیریت سے گزر گئے۔ جب ہم وزیر آباد سے آگے دریا کے پار چلے گئے تو پیچھے سے ایک تیز رفتار بس آئی۔ اس کا ڈرائیور چاہتا تھا کہ ہماری بس سے آگے نکل جائے مگر ہمارے ڈرائیور نے اشارہ کیا کہ ابھی آگے نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ خیر وہ نہ نکل سکا۔ اسی

طرح سے وہ گجرات تک کوشش کرتا رہا لیکن آگے نہ نکل سکا کیونکہ گجرات آنے والا تھا اور ٹریفک زیادہ ہوگئی تھی۔

گجرات پہنچ کر ہم چند منٹ کے لئے ٹھہرے۔ پھر چل دیئے۔ گجرات سے تقریباً پانچ میل ہی گئے ہوں گے کہ وہی بس پھر پیچھے سے ہماری بس سے آملی۔ یہ بس بہت تیز آرہی تھی ایک بس ہمارے سامنے سے گجرات کی طرف آرہی تھی۔ چونکہ سڑک یک طرفہ تھی اس لئے ہمارے ڈرائیور نے اسے رکنے کا اشارہ دیا مگر وہ اس قدر بے وقوف ثابت ہوا کہ زبردستی ہماری بس پاس کر گیا۔ جب ہمارے ڈرائیور نے دیکھا کہ وہ پاس کئے بغیر نہیں رہے گا تو ہمارے ڈرائیور نے رفتار کم کر لی۔ شاید وہ بھانپ گیا تھا کہ حادثہ کی صورت میں میرا پیچھے رہنا ہی ٹھیک ہے۔ آنکھ جھپکنے میں وہ آگے نکل گیا۔ بس اس کا آگے نکلا تھا کہ وہ دونوں بسیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھیں۔ اس اثناء میں ہمارے ڈرائیور نے اپنی بس کی رفتار اور بھی کم کر لی۔ اسی لمحے ایک گرج دار اور خطرناک دھماکے کی آواز آئی۔ یہ آواز سنتے ہی تمام سواریاں خوفزدہ ہوگئیں۔ اور کلمہ پڑھنے لگیں۔ ہمارے ڈرائیور نے ایک دم بریک لگائی۔ ہمیں دھچکا تو زبردست لگا مگر ہماری جانیں بچ گئیں۔ لیکن جو بسیں ٹکرائی تھیں ان میں سے ایک الٹ گئی اور دوسری درخت سے جا ٹکرائی۔ دونوں کے انجن تباہ ہو گئے۔ دونوں کے سامنے کی جانب کے حصے ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ دونوں ڈرائیور موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ ایک کہرام مچ گیا چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی سیٹوں میں پھنسا پڑا تھا۔ کسی کا سر زخمی

تھا۔کسی کا بازو ٹوٹ گیا تھا کسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔کوئی سیٹ میں اس بری طرح پھنسا ہوا تھا کہ وہ نکل ہی نہ سکا اور وہیں دم توڑ دیا،عورتیں اور بچے تو زیادہ تر بیہوش ہو گئے تھے۔ یہی حالت دوسری بس کی تھی۔ اس میں بھی بہت نقصان ہوا تھا دونوں بسوں نے ٹریفک بند کر دی تھی۔ ادھر اور ادھر دونوں طرف کی بے شمار ٹریفک رک گئی۔ہمیں بھی وہاں ڈیڑھ دو گھنٹے تک رکنا پڑ گیا۔

دھماکے کی آواز سن کر اردگرد کھیتوں میں کام کرنے والے اور نزدیکی گاؤں کے لوگ جائے حادثہ پر آ گئے۔جلدی جلدی جو کچھ بھی کسی سے ہو سکا اس نے مسافروں کی امداد کے لئے کیا۔ جتنے آدمی باہر نکل سکے ان کو نکالا۔لوگوں نے زخمیوں کو حوصلہ دیا۔کئی کار والے ایسے نیک دل نکلے کہ انہوں نے زخمیوں کے لئے اپنی کاریں پیش کر دیں۔زخمیوں کو گجرات ہسپتال لے گئے۔کئی بس والے گجرات جا رہے تھے۔انہوں نے زخمیوں کو گجرات پہنچانے میں مدد کی۔ دیہات والے لوگ بہت ہی خدا ترس اور ہمدرد ثابت ہوئے۔سب سے زیادہ کام انہوں نے ہی کیا اور زیادہ تر مسافر انہی کی مدد سے بسوں سے باہر نکالے گئے۔

اسی اثناء میں گجرات سے پولیس پہنچ گئی اور افسران بالا بھی جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔انہوں نے بھی پہنچ کر خاصی مدد کی۔ جب راستہ کھل گیا تو ہم اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ سارا راستہ لوگ حادثہ کی باتیں ہی کرتے رہے اور خدا تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہے کہ تمام سفر سلامتی کے ساتھ ختم ہو اور ہم خیریت سے اپنے گھروں تک پہنچ جائیں۔ دو تین عورتیں ہماری بس میں بھی تھیں جو زخمی تو نہیں

ہوئی تھیں مگر اتنی دہشت زدہ تھیں کہ ان کے منہ سے بات بھی نہیں نکلتی تھی۔ خود مجھ پر اس حادثے کا گہرا اثر پڑا اور میں اسے بھلا نہ سکا۔ اب بھی جب کبھی مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرا دل کانپ اٹھتا ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں حادثات سے محفوظ رکھے اور ہماری جانوں کی حفاظت کرے۔ آمین!

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

آتشزدگی کا واقعہ

بڑی مشکل سے ابھی نصف شب ہی گزری ہوگی۔گلی میں بالکل خاموشی تھی سب لوگ سو رہے تھے۔گرمی کا موسم تھا۔میں چھت پر لیٹا ہوا تھا لیکن ابھی نیند نہیں آئی تھی۔ایک دم محلے میں شور مچ گیا آگ لگ گئی،آگ لگ گئی،آگ لگ گئی۔بچاؤ، بچاؤ۔میرے کانوں میں یہ آواز پہنچی تو میں ایک دم گھبرا کر اٹھا اور نیچے اتر گیا۔کیا دیکھتا ہوں کہ بے شمار لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔چاروں طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔بچاؤ بچاؤ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ایک سہ منزلہ مکان کو آگ لگی ہوئی تھی۔شعلوں نے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔گھر کے مکینوں کی چیخ پکار کی آوازیں آ رہی تھیں کوئی استغفار پڑھ رہا ہے کوئی سامان باہر پھینک رہا تھا کوئی دعا مانگ رہا تھا۔کوئی پانی لینے ادھر ادھر بھاگ رہا تھا کوئی بالٹی اٹھائے آگ بجھانے کے لئے پانی لا رہا تھا۔ہوا تیز تھی۔خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ شعلے سارے محلے کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لیں اور آگ پر قابو پانا ناممکن نہ ہو جائے۔

کچھ آدمیوں نے دلیری کی۔وہ مکان میں گھس کر سامان باہر لانے لگے۔ہوا کی تیزی کی وجہ سے آگ کے شعلے زیادہ سے زیادہ بھڑک رہے تھے۔دھویں اور آگ نے مل کر آسمان میں ایسا منظر بنا رکھا تھا جیسے مکان اور آسمان کے درمیان ایک سیاہ اور سرخ دیو کھڑا اوپر کی طرف جا رہا ہے۔لوگوں میں اتنا خوف و ہراس پیدا ہو گیا تھا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔عورتوں اور بچوں کی چیخوں کی وجہ سے منظر بہت ہی کربناک ہو گیا تھا۔ہر شخص کے دل میں یہی خوف تھا کہ یہ آگ کہیں

سارے محلے کے مکانوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر نہ بنا دے اور یہی وجہ تھی کہ ہر شخص آگ بجھانے کی کوشش میں بھاگ رہا تھا ساتھ والے ایک بالٹی اس مکان پر ڈالتے اور ایک بالٹی اپنے مکان پر ڈال رہے تھے۔ تاکہ آگ آگے نہ بڑھنے پائے۔ پانی سے بھری ہوئی بالٹیوں پر بالٹیاں ڈالی جارہی تھیں لیکن آگ خطرناک صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔

لوگوں کا خیال تھا کہ سب اہل خانہ مکان سے باہر نکل آئے ہیں مگر ایک آواز آرہی تھی کہ میرا بچہ سب سے اوپر کی چھت پر ہے۔ یہ ایک عورت کی آواز تھی جو چیخیں مار مار کر یہی بار بار کہہ رہی تھی۔ لوگ سن بھی رہے تھے مگر کسی جرات نہیں ہو رہی تھی کہ وہ ایسے میں آگ میں چھلانگ لگا کر اس کے بچے کی جان بچا سکے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت گھر میں صرف مستورات موجود تھیں یا بچے تھے۔ مرد سب کے سب باہر گئے ہوئے تھے۔ میں نے اس خاتون سے پوچھا۔ ''بہن کون رہ گیا ہے؟ کہاں رہ گیا ہے؟'' اس نے بازو اوپر اٹھاتے ہوئے اور روتے ہوئے اور چیختے ہوئے کہا کہ میرا ایک سال کا بچہ سب سے اوپر کی چھت پر رہ گیا ہے۔ وہ وہاں سویا ہوا تھا۔ میں نیچے آئی تھی ان تین بچوں کو تو نیچے لانے میں کامیاب ہوگئی مگر آگے کے شعلے اس قدر زیادہ ہو گئے تھے کہ دھویں میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اس میں بے بس ہوگئی تھی اور بچہ اوپر ہی رہ گیا تھا۔ خدا کے لئے میرے بچے کو بچاؤ۔ آگ اس قدر زیادہ بھڑک اٹھی تھی کہ کوئی تدبیر کام نہیں کر رہی تھی۔ مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں بھاگا بھاگا اپنے گھر گیا۔ میں نے

ایک کمبل اٹھا کر اسے پانی کے ٹب میں ڈال کر بھگو لیا اور اپنے گرد لپیٹ کر اوپر مکان پر جانے کا مصمم ارادہ کیا اور خدا سے دعا مانگی کہ الٰہی تو مجھے ہمت اور توفیق دے کہ میں ایک ماں کی گود کو ویران ہونے سے بچا سکوں۔ میں اس مکان سے واقف تھا۔ اس لئے سیدھا سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ بہت تیزی کے ساتھ آگ کا حصہ پار کر لیا۔ آگ پہلی منزل میں زیادہ تھی۔ دوسری منزل میں اس سے کم تھی اور تیسری منزل ابھی پوری طرح آگ کی لپیٹ میں نہیں آئی تھی۔ سب سے اوپر والی چھت ابھی محفوظ تھی۔ جلدی سے بچے کو اٹھایا اسی بھیگے ہوئے کمبل میں لپیٹا اور نیچے اترنا شروع کر دیا۔ جب دوسری منزل پر پہنچا تو مجھے یوں معلوم ہوا کہ پہلی منزل پوری طرح سے آگ کی لپیٹ میں آ چکی ہے۔ اور دھواں اس قدر زیادہ ہو گیا ہے کہ سیڑھیوں میں سے گزرتے وقت دم گھٹ کر گر جانے کا خطرہ ہے۔ لہٰذا میں نے اپنے ہوش و حواس بحال رکھے اور خیریت اسی میں سمجھی کہ ساتھ والے مکان کی چھت پر چھلانگ لگا دوں جو بالکل محفوظ تھی۔ لہٰذا میں نے ایسا ہی کیا۔ یہ چھت آٹھ دس فٹ نیچی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر چھلانگ لگا دی۔ کچھ چوٹیں مجھے تو لگیں مگر بچہ بالکل صحیح سلامت رہا۔

اسی اثناء میں کسی محلے والے نے فائر بریگیڈ پر فون کر دیا تھا۔ دور سے فائر بریگیڈ والوں کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نیچے اترا ہی تھا کہ فائر بریگیڈ والے بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے پائپ لگا دیئے اور پانی کی دو موٹی موٹی دھاریں ڈال کر مکان کی آگ بجھانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ پانی اتنے

زور سے نکلتا تھا کہ اوپر کی منزل تک بھی پہنچ رہا تھا۔ اب لوگوں کی جان میں جان آئی اور ان کی گھبراہٹ بھی کم ہوگئی۔ جہاں پانی پڑتا تھا وہاں سے آگ بجھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس مکان پر بھی پانی ڈال رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ جس طرف شعلے جا رہے تھے اس طرف بھی مکان پر پانی ڈال رہے تھے۔ آدھ گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد آگ پر مکمل طور پر قابو پالیا گیا تھا۔ سامان تو بہت سا جل گیا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ جانی نقصان کوئی نہ ہوا۔ عورت نے بچہ لے اسے اپنی چھاتی سے لگالیا۔ اور مجھے بہت سی دعائیں دیں۔

ریل کا حادثہ

پچھلے دنوں مجھے راولپنڈی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ میرے گھر والوں نے مشورہ دیا کہ تم بس سے سفر نہ کرنا ریل میں بیٹھ کر جانا کیونکہ ریل کا سفر بس کی نسبت زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ میں چونکہ بزرگوں کی نصیحت کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں لہٰذا میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے سفر کا آغاز بذریعہ ٹرین کیا۔ یہ گاڑی چونکہ ایکسپریس ٹرین تھی لہٰذا یہ چھوٹے اسٹیشن چھوڑتی ہوئی تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں گوجرانوالہ پہنچ گئی۔ چند منٹ ٹھہرنے کے بعد وہاں سے چل پڑی۔ آدھ گھنٹے بعد وزیر آباد پہنچ گئی۔ وزیر آباد چونکہ جنکشن ہے۔ یہاں پر ذرا زیادہ دیر ٹھہری۔ بہر حال یہاں سے بھی بخیریت روانہ ہوگئی۔

ابھی ہم وزیر آباد سے صرف چار پانچ میل ہی گئے ہوں گے کہ ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ مسافر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ کسی کا سر پھٹا۔ کسی کا بازو ٹوٹا۔ کسی کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کسی کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ کسی کے کہیں زخم آیا، کسی کے کہیں۔ ہر طرف شور برپا ہو گیا تھا۔ لوگ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ کوئی خدا کو یاد کرنے لگا۔ کسی کی زبان پر کلمہ تھا کوئی کہہ رہا تھا۔ کہ یا اللہ خیر، سب کا بھلا عورتیں اس قدر گھبرا گئی تھیں کہ ان میں کئی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ بچے ڈر کے مارے چیخیں مار رہے تھے۔ ہماری ٹرین کئی جھٹکے کھاتی ہوئی رک گئی۔ جب ہم باہر نکلے تو دیکھا کہ یہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے اور اس پر ایک مال گاڑی کھڑی تھی جس سے ہماری ٹرین ٹکرا گئی ہے۔ پتہ نہیں کیا وجہ ہوئی شاید کانٹا صحیح نہیں بدلا تھا جس کے نتیجے میں

گاڑی سیدھا جانے کی بجائے مال گاڑی والی لائن پر چلی گئی اور وہاں جا کر اس سے ٹکرا گئی۔ جب آگے جا کر دیکھا تو بہت نقصان ہوا تھا۔ انجن اور اس کے ساتھ والے کئی ڈبے لائن سے اتر گئے تھے اور زمین میں دھنس گئے تھے۔ وہ ڈبے الٹے بھی پڑے تھے۔ مال گاڑی کا آخری ڈبہ بالکل ہی تباہ ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ والے کی ڈبے لائن سے اتر کر زمین پر الٹے پڑے تھے۔

انجن زمین میں اس طرح دھنس گیا تھا جس طرح کوئی بھاری بھرکم چیز اپنے ہی بوجھ سے مٹی میں گڑ گئی ہو۔ اس کے اگلے پہیے تو بالکل ہی زمین میں چلے گئے تھے۔ پچھلے پہیے زمین میں اتنے نہیں دھنسے تھے۔ ڈرائیور ایک طرف بیہوش گرا پڑا تھا۔ غالباً اس کے سر میں چوٹ آئی تھی۔ فائر مین بھی پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔

گاڑیوں کے ٹکراؤ سے بہت زبردست دھماکہ ہوا تھا۔ قرب و جوار کے کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ دھماکے کی آواز سنتے ہی اسٹیشن کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ نزدیک ہی ایک گاؤں تھا وہاں سے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ اس ریلوے اسٹیشن کا اسٹیشن ماسٹر ایک شریف اور ہمدرد انسان تھا۔ اس نے بھی اپنے عملے کے لوگ اکٹھے کئے اور زخمیوں کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ نزدیک سے پولیس کا عملہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ انہوں نے گاؤں والوں کو چارپائیاں اور دودھ وغیرہ لانے کے لئے درخواست کی۔ بے چارے گاؤں والے بھاگے بھاگے گاؤں گئے اور چارپائیاں اور دودھ لائے۔ انہوں نے زخمیوں کو چارپائیوں پر لٹانا شروع کر دیا۔

جو مسافر صحیح سلامت تھے انہوں نے بھی اس سلسلے میں بہت مدد کی۔

میں اور میرے ساتھ والے مسافر اس ڈبے میں داخل ہوئے جو الٹا پڑا تھا۔ اس میں لوگوں کی بہت بری حالت تھی۔ لوگوں کی چیخ پکار اس قدر تھی کہ کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ ہم نے سب سے پہلے ان سے کہا کہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ آپ تسلی رکھیں ابھی آپ کو باہر نکال لیتے ہیں۔ آپ ذرا خاموش ہو جائیں۔ ہمارے حوصلہ افزا الفاظ سن کر انہیں کچھ تسلی ہوئی۔ چیخ پکار کچھ کم ہوئی۔ ہم سب نوجوانوں نے مل کر ایک ایک کر سب مسافروں کو باہر نکال لیا۔ ان میں کچھ تو ٹھیک ٹھاک تھے مگر گھبرائے ہوئے اس قدر تھے کہ کچھ کرنے کے قابل نہیں تھے۔ زخمیوں میں سے کچھ کی حالت خطرناک تھی۔ کئی ایسے تھے کہ جن کو معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ جو لوگ بیہوش تھے ان کو نکالنے میں ہمیں بہت دقت محسوس ہوئی کیونکہ وہ اپنے جسم کا کوئی حصہ بھی ہلانے کے قابل نہ تھے۔ ان کا سارے کا سارا بوجھ ہمیں اٹھانا پڑتا تھا انہیں بہت مشکل سے باہر لانا پڑتا تھا۔ بہر حال ہم نے ہمت سے کام لیا۔ اس وقت پتہ نہیں میرے جسم میں طاقت اور حوصلہ کہاں سے آ گیا تھا کہ جتنا بوجھ میں نے کبھی نہ اٹھایا تھا وہ بھی اس وقت اٹھاتا رہا۔ اسی طرح میرے ساتھ والے بھی اپنی ہمت سے زیادہ کام کرتے رہے اصل میں اس وقت جذبہ ہمدردی کام کر رہا تھا۔ انسان کو کراہتے ہوئے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ جو کچھ بھی بن پڑے کیا جائے۔ اسی طرح اور لوگوں نے بھی دوسرے ڈبوں میں سے لوگوں کو نکالا۔ پچھلے ڈبوں کو معمولی نقصان پہنچا تھا اور ان کے مسافر بھی سلامت رہے۔

مسافروں اور نزدیک سے آنے والے لوگوں میں کچھ سمجھدار لوگ تھے جو ابتدائی امداد دینا جانتے تھے۔ انہوں نے زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا شروع کر دی۔ گارڈ کے پاس بھی فرسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ وہ بھی بہت ہی مدد و معاون ثابت ہوا۔ ابھی ہم امدادی کاموں میں ہی مصروف تھے کہ ریلوے کی ریلیف ٹرین آ گئی۔ اس میں عملہ بھی کافی تھا۔ انہوں نے بھی زخمیوں کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ انہوں نے لاشوں کو الگ کیا اور زخمیوں کو ٹرین میں سوار کر کے وزیر آباد ہسپتال میں لے گئے۔ جن لوگوں کو چوٹیں کم آئی تھیں وہ خود بھی سوار ہو گئے۔ ریلوے آفیسر نے ہمارے بیان بھی لئے۔ اس حادثہ میں ساٹھ آدمی شدید زخمی ہوئی اور دس آدمی جاں بحق ہوئے۔ حادثے کا منظر اس قدر دردناک تھا کہ میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکا۔ جب بھی اس کی یاد آتی ہے وہی منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ میں پریشان ہو جاتا ہوں۔

روضہ تاج محل

مغل شہنشاہوں کو فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے جہاں دوسرے فنون لطیفہ کی سرپرستی کی وہاں فن تعمیر کے بھی یادگار شاہکار تعمیر کرائے جن میں عمارتیں بھی شامل ہیں اور باغات اور تالاب وغیرہ بھی۔ دور مغلیہ کی تمام یادگار عمارتوں میں سے روضہ تاج محل امتیازی حیثیت کی حامل یہ عمارت نفاست اور خوبصورتی کے اعتبار سے دنیا کی عمارتوں سے سبقت لے گئی ہے۔ روضہ تاج محل مغل شہنشاہ ہندوستان شاہجہان کی اپنی چہیتی ملکہ ممتاز محل کے ساتھ محبت کا مظہر ہے۔ ملکہ ممتاز محل کی موت پر شاہجہان نے عہد کیا تھا کہ میں اپنی محبوب ملکہ کی یاد میں ایسی یادگار تعمیر کروں گا جو عجوبہ روزگار ہوگی۔

روضہ تاج محل آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے ہے۔ اس کی تعمیر کے لئے شہنشاہ نے سترہ برس تک خزانوں کے منہ کھول رکھے تھے۔ اس کا طول ایک ہزار آٹھ سو ساٹھ فٹ اور عرض ایک ہزار فٹ ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لئے چار دروازے دکھائی دیتے ہیں جن میں سے ایک بڑا اور تین چھوٹے ہیں۔ یہ چاروں سرخ پتھر سے بنائے گئے ہیں۔ اس کی فصیلی دیوار میں طاق بنے ہوئے ہیں جو یکسانیت کا عجیب نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اندر داخل ہونے کے لئے بڑا دروازہ استعمال ہوتا ہے۔ اس پر بہت ہی خوبصورت گل کاری کی ہوئی ہے اور قرآن مجید کی آیات بھی کندہ ہیں۔ دروازے سے گزر کر سیڑھیوں کے ذریعے نیچے باغ میں داخل ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ جنت میں داخل ہو گئے ہیں۔سروں کی قطاریں، پودوں کی بہاریں اور گلوں کے نظارے پر کیف منظر پیش کرتے ہیں۔روشیں سنگ سرخ سے تراش کر بنائی گئی ہیں اور اس سنگ سرخ کے درمیان سنگ مرمر کا صاف شفاف حوض ہے۔ حوض میں فوارے لگے ہوئے ہیں۔حوض سے کئی سیڑھیاں چڑھ کر ایک سفید اور سیاہ ٹکڑیوں والا چبوترہ آتا ہے اس کے اوپر سنگ مرمر کا ایک اور چبوترہ ہے اور اس چبوترے کی دیوار میں ایک طرف سفید پتھر کا زینہ ہے۔چاروں کناروں پر چار مینار ہیں۔ہر اک تین صد تیرہ فٹ بلند ہے۔اس چبوترے کے وسط میں روضے کی عمارت ہے۔روضے کے اوپر سنگ مرمر کا اسی فٹ کا بلند گنبد ہے۔اس کی چوٹی پر ایک طلائی کلس چمکتا ہے۔بڑے گنبد کے گرد چار چھوٹے برج ہیں جنھوں نے گنبد کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیا ہے۔

گنبد کے اندر کا حصہ دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہاں کے در و دیوار پر گلشن کی بہار آئی ہوئی ہے۔دیواروں پر قیمتی پتھروں سے گلکاری کی ہوئی ہے اور اس قدر کی خوبصورت ہے کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔آج کے ماہرین عمارت اور فن کار اتنی محنت کر ہی نہیں سکتے۔پتہ نہیں اس زمانے کے ماہرین تعمیرات کس دل گردے کے مالک تھے جو اتنی دل جمعی سے کام کرتے تھے۔روضہ تاج محل پر بھی سنگ مرمر میں کھدائی کر کے ان میں طرح طرح کے قیمتی پتھروں کی جڑائی کر کے خوبصورت گلکاری کی ہوئی ہے پھولوں کی پتیوں میں کئی رنگ کے پتھر لگائے ہوئے ہیں ان کے جوڑ اس کاریگری سے لگائے ہوئے

ہیں کہ ذرہ بھر اونچ نیچ محسوس نہیں ہوتی۔ صفائی اور نفاست ہر جگہ نمایاں ہے۔ محرابوں پر سنگ اسود سے آیات قرآنی کندہ ہیں۔ وہاں کے گائیڈ بتاتے ہیں کہ مقبرہ میں جا بجا پورا قرآن لکھا ہوا ہے۔ گنبد کے درمیان میں سنگ مرمر کا جالیدار کٹہرا ہے۔

گنبد میں جالی اور گلکاری کا کام نہایت نفاست اور خوبصورتی سے کیا ہوا ہے۔ جہاں بھی کھڑے ہو جائیں دل چاہتا ہے کہ اس کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ ہر پھول، کاریگری کی داد دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ہر چیز اتنی محنت اور صفائی سے بنائی ہوئی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

گنبد کے وسط میں سنگ مرمر کا ایک جالی دار کٹہرا لگا ہوا ہے۔ اس کٹہرے کے در کے اوپر سوراخ نظر آتے ہیں۔ یہ سوراخ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ ان سوراخوں میں کواڑوں کی چولیں لگی ہوں گی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کواڑ چاندی سے تیار کئے ہوئے تھے اور ان میں پکھراج اور الماس جیسے قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے۔ اس وقت بھی ایک ایک کواڑ کی قیمت لاکھ روپے تھی۔ آج وہ کواڑ نظر نہیں آ رہے۔ پتہ نہیں کون اکھاڑ کر لے گیا اور کہاں لے گیا۔ بہت سی جگہوں پر قیمتی پتھر بھی نکالے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی جگہ رنگ بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کٹہرے کے اندر شاہجہان اور ممتاز محل کی قبروں کے تعویذ ہیں۔ اصل قبریں ان کے نیچے سنگ مرمر کے تہ خانے میں ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ یہ عجوبہ روزگار عمارت اس زمانے میں تیار ہوئی تھی۔

جب نہ کوئی مشینری تھی اور نہ کرینیں تھیں اس وقت تو صفائی کرنے کے جدید آلات واوزار بھی نہ تھے۔ انہوں نے ہر چیز میں اتنی خوبصورتی اور صفائی کیسے بھر دی۔ پھولوں کی نوک پلک بھی یوں سنواری گئی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اصلی ہوں۔ ان میں رنگ کاری بھی پتھروں سے ہی کی ہوئی ہے۔ روضہ تاج محل مسلمانوں کی عظمت و نصرت کا زندہ نشاں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اسی عظمت و نصرت کو تاہم رکھنے کے لئے جہد مسلسل اور سعی پیہم کو اپنا شعار بنانا اور جو کچھ اپنے بس میں تھا وہ خود کریں اور حکومت کے بس کا ہو وہ کرے۔

مقبرہ جہانگیر

یادگار تعمیرات کا کام ہر دور میں نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تعمیر کرانے والا فن تعمیر میں دلچسپی رکھتا ہو۔ اس کا خزانہ سیم و زر سے بھرا ہوا ہو۔ ملک میں امن وسکون کا دور دورہ ہو۔ رعایا امن و امان سے بیٹھی ہو۔ بہترین ماہرین کی خدمات حاصل ہوں۔ عدل و انصاف کی حاکمیت ہو۔ اگر ان میں سے کسی چیز کی کمی ہو تو یادگار تعمیرات کا کام ناممکن ہوتا ہے۔ ہندو پاک میں جس قدر بھی یادگار تعمیرات ہیں یہ سب مسلمانوں کے دور کی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں مسلمان حاکم فن تعمیر سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے خزانے بھی بھرے ہوئے تھے۔ ملک میں امن و امان بھی تھا۔ رعایا کو عدل و انصاف بھی پورا پورا ملتا تھا اور ماہرین تعمیرات بھی موجود تھے۔ یہ تعمیرات آج بھی مسلمانوں کی عظمت کی گواہی دے رہی ہیں۔

اس دور کی یادگار عمارتوں میں سے ایک تاریخی عمارت لاہور کا مقبرہ جہانگیر بھی ہے۔ مغل بادشاہ فن تعمیر کا ذوق وشوق رکھتے تھے۔ تاج محل آگرہ، شاہی مسجد دہلی، دلی کا لال قلعہ، لاہور کی شاہی مسجد، قلعہ، شالیمار باغ اور مقبرہ جہانگیر انہی مسلمان بادشاہوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے یہ تعمیرات محنت، ذوق اور لگن سے تعمیر کرائیں اور ان پر اس قدر زر کثیر صرف کیا کہ کئی حادثات زمانہ کے باوجود آج بھی اسی طرح کھڑی ہیں۔ فن کسی فنکار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کھلی اور کشادہ عمارتیں تعمیر کنندہ کی فراخدلی کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ ان کے ذوق کی

عکس بندی کرتی ہیں۔

جہانگیر اکبر کا بیٹا بھی تھا اور جانشین بھی۔ عدل جہانگیری اسی کا مشہور ہے۔ کشمیر سے واپسی پر اسے موت نے دلی پہنچنے کی مہلت نہ دی۔ شاید اس لیے کہ اسے بھی لاہور کی آب و ہوا بہت پسند تھی اور قدرت نے لاہور کو ہی اس کے لیے مقدر کر دیا تھا۔

دور جہانگیری میں ملکہ نور جہاں کو بہت دخل حاصل تھا۔ اسی کی زندگی میں جہانگیر کی موت واقع ہوئی۔ لہٰذا مقبرہ جہانگیر ملکہ نور جہاں نے خود تعمیر کروایا تھا۔ نور جہاں کا مقبرہ شہنشاہ شاہ جہاں نے بنوایا تھا۔ یہ مقبرہ بھی جہانگیر کے مقبرہ کے قریب ہی واقع ہے۔ بہر حال جہانگیر کا مقبرہ دریائے راوی کے کنارے شاہدرہ کے قریب واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف نہایت خوبصورت باغ ہے۔ اگر یہ باغ اس وقت دلفریب ہے تو دور مغلیہ میں اس کی شان کیا ہو گی۔

پہلے ہم اس باغ میں داخل ہوتے ہیں۔ داخل ہونے کے لیے ایک صدر دروازہ ہے جس کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے ہیں۔ تیسری طرف مسجد اور چوتھی طرف مقبرے کی طرف جانے کے لئے جس دروازہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ بہت ہی شاندار اور بڑا ہے۔ اس کی شکل محرابی ہے۔ اس دروازے کی دوبارہ مرمت کی گئی ہے لیکن بالکل وہی میٹریل لگایا گیا ہے جس قسم کا پہلے لگا ہوا تھا اور وہی شکل دی گئی ہے جو پہلے تھی۔ ہی ڈیزائن ہے۔ یہ دروازہ دیکھ کر انسان کے دل پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی قلعہ کا دروازہ ہو۔ بہت

مضبوط اور موٹی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اسی طرح سے موٹے موٹے کیل لگے ہوئے ہیں۔ جس طرح پہلے لگے ہوئے تھے۔ یہ دروازہ گزر کر ہم ایک خوبصورت باغ میں داخل ہوتے ہیں اس باغ میں نہریں بنی ہوئی ہیں۔ فوارے بھی لگے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ایک چبوترہ آتا ہے جو سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے اور یہیں پر جہانگیر کا مقبرہ ہے۔ جہاں پر جہانگیر ابدی نیند سو رہا ہے۔ مقبرے سے اب بھی اسی طرح سے جلال ٹپکتا ہے۔ سنگ مرمر کی دیواریں اس قدر مضبوط ہیں کہ دیواروں کی چوڑائی کم وبیش پانچ چھ فٹ ہوگی۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود اسی طرح سے کھڑی ہیں۔ مقبرے کا فرش سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ اس پر رنگین پتھر لگے ہوئے ہیں۔ یہ پتھر نہایت خوبصورت انداز میں لگائے گئے ہیں اور پر کیف نظارہ پیش کرتے ہیں۔ قبر کا تعویز اسمائے الٰہی سے مزین ہے۔ چھتوں اور دیواروں پر گلکاری کی ہوئی ہے جو بہت ہی خوبصورت اور دلفریب ہے۔ بارہ دری کی جگہ چبوترہ رہ گیا ہے۔ اس کی جالیاں جو اس کی خوبصورتی تھیں سکھوں کے دور میں ان کی دست درازی کا شکار ہوئیں۔

مقبرے کے چار مینار ہیں۔ ان میناروں پر چڑھ کر دور دراز کے نظارے کئے جا سکتے ہیں۔ راوی کی موجوں کا نظارہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ شہر لاہور ایک نظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ شاہی مسجد اور قلعہ بھی صاف نظر آتے ہیں۔ اور یہ نظارہ قابل دید ہوتا ہے۔

مقبرہ جہانگیر بہت اچھی سیر گاہ اور تفریح گاہ ہے۔ چھٹی والے دن یہاں پر

خاص طور پر رونق ہوتی ہے۔ گرمیوں کے موسم میں سایہ دار درختوں میں سکون ملتا ہے۔ موسم بہار میں گلوں کی خوشبو اور کلیوں کی چٹک دل و دماغ کو تازگی بخشتی ہے۔ لوگ یہاں آ کر گھنٹوں اپنا دل بہلاتے ہیں اور مسلمانوں کی شان رفتہ کا اپنی آنکھوں سے نظارہ کرتے ہیں اور ان کے فن تعمیر سے حد درجہ دلچسپی کی داد دیتے ہیں۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

نور جہاں کا مزار

ملکہ نور جہاں کا مزار دریائے راوی کے مغربی کنارے پر شاہدرہ کے قریب واقع ہے۔ ملکہ نور جہاں شہنشاہ جہانگیر کی چہیتی بیوی تھی۔ وہ ہمہ صفت موصوف تھی اور حسن و دانش میں یکتائے زمانہ تھی۔ جہانگیر اس کے مشورے کے بغیر کوئی اہم کام سرانجام نہیں دیتا تھا۔ وہ رموز سلطنت سے کماحقہ واقف تھی اور نگاہ باریک بین رکھتی تھی۔ اس کی فراست کے ثبوت میں بہت سے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن یہاں صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے جو یوں ہے۔

ایک جوہری کی والدہ اس کے بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھی۔ اس کے دل میں ماں کو دیکھنے کی بہت حسرت تھی۔ کسی عورت نے اسے بتایا کہ ملکہ نور جہاں تمہاری ماں کی ہم شکل ہے۔ اگر تم کسی طرح اسے دیکھنے میں کامیاب ہو جاؤ تو تمہاری یہ حسرت پوری ہو سکتی ہے۔ جوہری نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا جو بہت عقلمند عورت تھی اور جواہرات کا کاروبار گھر میں ہی کیا کرتی تھی۔ اس نے کہا کہ تم نے ایسا کیا تو یاد رکھنا وہ ملکہ ہندوستان ہے۔ تمہاری سزا موت ہوگی۔ وہ ڈر تو گیا، مگر اس کا شوق روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ اسے ایک ترکیب سوجھی۔ ایک ماہر بہروپئے کی شاگردی کر کے اس نے عورت کا بھیس بدلنے میں اس قدر ملکہ پیدا کر لیا کہ ایک دن بھیس بدل کر اپنی بیوی کے ہاں جواہرات خریدنے چلا گیا۔ اور اس کے ہاتھ کی انگوٹھی خریدنے میں کامیاب ہوگیا وہ بھی اسے نہ شکل سے نہ آواز سے نہ چال سے نہ کسی اور ڈھنگ سے پہچان سکی۔ وہ شخص اپنی کامیابی سے بہت خوش ہوا۔

تھوڑے دنوں بعد بانو بازار لگنے والا تھا۔ اس بازار میں سوائے بادشاہ کے کسی دوسرے مرد کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی کیونکہ بادشاہ کو باپ کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ ملکہ نور جہاں جہانگیر کے ساتھ ہاتھی پر سوار تھی۔ جوہری بھی اپنی تشنگی کو بجھانے کے لئے چلا گیا۔ جب دور سے جوہری نے ملکہ کو دیکھ لیا۔ بہت خوش ہوا مگر شاہی دبدبے اور رعب سے ڈر بھی گیا اور ایک دم ہجوم میں غائب ہو گیا۔ ملکہ نے فوراً دروازے بند کرنے کا حکم دے دیا تا کہ کوئی باہر نہ نکلنے پائے۔ لونڈیوں اور باندیوں کو حکم دیا کہ یہاں ایک مرد ہے اسے پکڑو مگر تلاش بسیار کے بعد سب ناکام رہیں۔ بادشاہ بھی بہت پریشان ہوا۔ کوئی تدبیر کام نہیں آ رہی تھی۔ اگر ہر عورت کی پڑتال کی جائے تو راز فاش ہونے کا ڈر تھا اور رعایا اور ملکہ کی حرمت پامال ہونے کا ڈر تھا۔ آخر ملکہ نے حکم دیا کہ دروازوں کے سامنے کھدائی کر کے اس قدر پانی چھوڑا جائے جہاں سے عورتیں آسانی سے گزر سکیں۔ چوڑائی اتنی رکھی جائے کہ آسانی سے پھلانگی نہ جا سکے۔ حکم کی تعمیل ہو گئی۔ ملکہ نے حکم دیا کہ ہر عورت پر کڑی نظر رکھی جائے۔ جو عورت پانی پھلانگ کر گزرے اسے میرے حضور پیش کر دیں۔ پانی میں سے عورتیں گزرتی رہیں لیکن جوہری نے چھلانگ مار کر پانی عبور کیا اور پانی عبور کرتے ہی پکڑا گیا۔ ملکہ کے حضور پیش ہوا۔ جوہری کا تمام حال سن کر ملکہ نے جوہری کے جذبہ کی قدر کی اور ساری زندگی اسے بیٹا ہی سمجھتی رہی۔

اسی ملکہ ہندوستان کا مزار شاہدرہ کے قریب واقع ہے۔ اسے دیکھنے والا یہ نہیں

کہہ سکتا کہ وہ کسی ملکہ کے مزار پر آیا ہے۔ مزار سے حسرت ٹپکتی ہے اور اس پر خود ملکہ نور جہاں کا یہ شعر کندہ ہے۔

بر مزار غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزو، نے صدائے بلبلے

دیکھنے والا جب یہ دیکھتا ہے کہ چند فرلانگ کے فاصلے پر ملکہ کا چاہنے والا جہانگیر بھی جو زندگی میں دولت مغلیہ کو اپنی محبوب بیوی کے ایک اشارہ پر قربان کرنے کو تیار رہتا تھا آج اپنی محبوبہ کی خستہ حالی پر بے بسی اور بے چارگی کی حالت میں تڑپ رہا ہے تو یہ دیکھ کر بہت ہی ذہنی کوفت ہوتی ہے اور اس دنیا کی بے وفائی اور ناپائیداری کا ثبوت ملتا ہے۔

ملکہ نور جہاں کے مزار پر زمانے کی دست برد کا اثر بہت زیادہ ہوا تھا۔ اس لیے حکومت پاکستان نے طے کیا کہ اس کو اس کی اصلی شکل میں واپس لایا جائے۔ چنانچہ مقبرہ نور جہاں کی مرمت کی گئی ہے، جس سے اس کی خوبصورتی اور حسن واضح ہو گیا ہے۔

یہ اس ملکہ ہندوستان کی آخری آرام گاہ ہے جس کے اشارے پر جہانگیر چلتا تھا۔ جس کے منہ سے نکلے ہوئے کلمات قانون کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس کا ہر لفظ حکم آخر سمجھا جاتا تھا۔ جس کی فہم و فراست کی داستانوں سے تاریخ مزین ہے۔ یہ عقل و دانش کا بحر بیکراں تھا۔ ادبی ذوق رکھنے میں بھی بے مثال تھی۔ دانائے وقت تھی۔ سخاوت انصاف اور دریا دلی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ نور جہاں کے مقدر میں ولادت کے وقت اور وفات کے وقت کے لیے بیچارگی ہی لکھی گئی تھی۔ یہ پیدا بھی جنگل میں ہوئی اور وہ بھی عالم بیچارگی میں اور وفات کے بعد بھی اس کے حصے میں دشت بے آب و گیاہ ہی آیا جہاں پر نہ پھول مہکتے ہیں نہ بلبلوں کے نغمے ہوتے ہیں۔ نہ دیا ہوتا ہے نہ شمع ہوتی ہے۔ اس غریب کے مزار پر دن کو بھی شب کی سیاہی کا سماں ہوتا ہے۔ اس کی لحد پر حسرت ٹپکتی ہے۔ در و دیوار زبان حال سے یاس و حسرت کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ ملکہ حسن و سیرت بھی تھی۔ خوش گفتار و خوش کردار بھی تھی۔ پیکر الطاف و مہر و وفا بھی تھی شمع علم و فضیلت بھی تھی اور منبع جود و سخا بھی تھی۔ مگر آج یاس و حسرت کی تصویر بنی عبرت حاصل کرنے کا مقام بنی ہوئی ہے۔

شہری دفاع

سائنس کی ترقی سے جہاں انسان کو بے شمار فائدے پہنچے ہیں وہاں پر ایسی مہلک ایجادات بھی ہوئی ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کا سکون چھین لیا ہے۔ یہ درست ہے کہ سائنس کی ترقی سے علوم وفنون، وسائل رسل ورسائل، ذرائع نقل و حمل میں آسانیاں ہوئی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ آلات حرب دور رس نقصانات کے موجب بھی بنے ہوئے ہیں۔ پہلے زمانے میں صرف تیر وتفنگ کا استعمال ہوتا تھا جس کا اثر صرف میدان جنگ تک ہی ہوتا تھا۔ مگر آج تمام کرہ زمین اور خلا اس کی زد سے باہر نہیں ہیں۔ ایٹم بم جیسے مہلک ہتھیار ایجاد ہو چکے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہمیں ایسے اصولوں سے باخبر ہونا چاہیے جن کے ذریعے ہم ہوائی حملے کی صورت میں اپنے شہر کا دفاع کرسکیں۔ اول تو ہمیں تنظیم شہری دفاع میں شامل ہوکر باقاعدہ شہری دفاع کی تربیت حاصل کرنا چاہیے اور اگر نہیں تو کم از کم ہمیں یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسے موقع پر ہمیں کن تدابیر سے کام لینا چاہیے جن سے ہم ہوائی حملہ کے نقصانات سے بچ سکیں۔ شہری دفاع کے ذریعے ہم اپنے مال و جان، اپنے خاندان اور اپنے دوسرے شہری بھائیوں کی حفاظت کرسکتے ہیں۔ دشمن زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ایسے طریقے اپنائیں جن کو بروئے کار لاکر ہم اپنی حفاظت کرسکیں۔

جنگ کے دوران عوام کے حوصلے بہت بلند ہونے چاہئیں۔ دوران جنگ

اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے سے ہمدردی اسلحہ سے بھی زیادہ کام آتے ہیں۔ یک جہتی اور تنظیم سے جنگیں جیتی جاتی ہیں۔ جنگ کے دنوں میں شہر کے محلوں اور باہر کے دیہات میں شہری دفاع کی چوکیاں قائم کرنی چاہئیں۔ سورج چھپنے سے سورج نکلنے تک مکمل اندھیرا (بلیک آؤٹ) ہونا چاہیے۔ گلیوں میں میدانوں اور چھتوں پر کسی قسم کی کوئی روشنی کوئی شعلہ، کوئی چنگاری حتیٰ کہ سگریٹ بھی سلگی ہوئی نہیں ہونی چاہیے۔ روشندانوں، کھڑکیوں اور دروازوں کی دراڑوں تک سے ذرہ سی بھی روشنی باہر نہیں آنی چاہیے۔ کئی دیہاتی لوگ حقہ پینے کے لئے آگ جلا لیتے ہیں یا سلائی سے سگریٹ لگا لیتے ہیں۔ اس سے پیدا ہونے والی روشنی کی وجہ سے دشمن کو پتہ چل جاتا ہے کہ یہاں آبادی ہے۔ یہاں پر اگر بم مارا جائے تو نقصان زیادہ ہوسکتا ہے۔ جنگ کے دنوں میں خوراک میں کفایت برتنی چاہیے۔ تاجروں کو اشیاء خوردنی کے بھاؤ بڑھنے نہیں دینے چاہئیں۔ افواہوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جاسوسوں پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔

ہوائی حملہ سے بچاؤ کے لئے مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔

ا۔ اپنے گھر میں ایک ایسے کمرے کا انتخاب کریں جو دوسرے کمروں میں گھرا ہوا ہو اور محفوظ ہو۔ اس کمرے میں داخل ہونے کا دروازہ اندر کی طرف ہونا چاہیے۔ اس کے دو دروازے ہوں۔ کھڑکیاں نہ ہوں۔ کمرے کا رقبہ کم از کم تقریباً ساٹھ مربع فٹ ہو۔ چھت کم از کم ساڑھے سات فٹ اونچی ہو۔ چھت اور دیواریں مضبوط ہوں۔

۲۔ اس کمرے میں پانی، خوراک، بھنے ہوئے چنے، گڑ، شکر، وغیرہ لالٹین، دیا سلائی، کلہاڑی، سوئی دھاگہ اور چند تفریحی کتب ہونی چاہئیں۔ ایک بڑی مضبوط میز اس قسم کی ہو کہ اس کے نیچے آدمی پناہ لے سکیں۔ اور اگر چھت یا کوئی اور چیز اس پر گر جائے تو اس کا بوجھ برداشت کر سکے۔

۳۔ الارم ہوتے ہی سب گھر والے اس کمرے میں محفوظ ہو جائیں۔ جب خطرہ ٹل جائے تو دوسری طرف سے باہر نکلیں۔ خندق کے اندر ایڑیاں اٹھا کر بیٹھیں۔ کانوں میں انگلیاں یا روئی ٹھونس لیں۔ دانتوں کے درمیان ربڑ یا کوئی کپڑا رکھیں۔ بچوں کے منہ میں چوسنی وغیرہ دے دیں تا کہ دھماکہ کی صورت میں دانت منہ کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔

۴۔ اگر کوئی خندق میسر نہ آ سکے تو کسی نرم زمین پر جو کسی نیچی جگہ پر ہو کہنیوں کو زمین پر ٹیک دیں۔ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیں۔ ہتھیلیوں سے کانوں کو مضبوطی سے ڈھانپ لیں اور سینہ کو زمین سے اونچا رکھیں۔ اوپر نیچے کے دانتوں کے درمیان کوئی ربڑ یا کپڑا یا کوئی اور نرم چیز رکھ لیں۔

۵۔ اگر بس یا گاڑی میں سفر کر رہے ہوں تو اس سے اتر کر نزدیک والی خندق میں داخل ہو جائیں۔ ریل گاڑی میں ہوں تو کھڑکی سے باہر نہ جھکیں۔ شیشے اور لکڑی والی کھڑکیاں بند کر دیں اور خود نشست کے نیچے چلے جائیں۔ سامان کو جس نشست کے نیچے آپ ہوں اس کے اوپر رکھ لیں تو بہتر ہوگا۔

۶۔ کار یا بس کو سڑک کے بائیں کنارے کھڑا کر دیں۔ کار کے شیشے بند کر

لیں۔گاڑی کوتالہ نہ لگائیں اوراس کی چابی گاڑی میں ہی رہنے دیں۔

۷۔ گاڑی یا تانگے کوسڑک کے بائیں کنارے کھڑا کر دیں۔جانوروں کو کھول کرکسی درخت جنگلے یا گاڑی کے پہیئے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیں۔ پانی کے نل یا بجلی کے کھمبے سے نہ باندھیں کیونکہ کسی وقت بھی ان میں کرنٹ آ سکتا ہے اورنقصان کا باعث ہوسکتا ہے۔

۸۔ اگرحملہ رات کو ہوتو مکمل طور پر بلیک آؤٹ رکھیں۔کسی جگہ سے بھی ذرا بھی روشنی نہیں نکلنی چاہیے۔روشنی کی ذراسی بھی چنگاری یا کرن شہر یا گاؤں کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔

مندرجہ بالا ہدایات کو ذہن نشین کرلیں اورجس وقت حملہ ہو اپنے ہوش وحواس قائم رکھ کرفوری طور پرتمام اقدامات پرعملدرآمد کریں۔بہترتو یہ ہے کہ شہری دفاع کی باقاعدہ تربیت حاصل کریں اوراپنے وارڈن،چیئرمین یا ممبر یونین کونسل سے رابطہ قائم رکھیں۔

جنگ کے فوائد و نقصانات

جنگ کا تصور ہی بتاتا ہے کہ جنگ کس قدر مالی، جسمانی، روحانی اور اقتصادی نقصانات کرتی ہے۔ جس جگہ پر جنگ لگی ہوئی ہوتی ہے کوئی ایسی مصیبت نہیں ہوتی جو ان پر نہیں ٹوٹتی۔ جوان موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں، عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں، بچے یتیم ہو جاتے ہیں اور بوڑھے ماں باپ اپنے بیٹوں کے سہارے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کئی ماؤں کے نور ان کی آنکھوں سے چھن جاتے ہیں۔ بہنیں شہید بھائیوں کا ساری عمر مایوسی سے انتظار کرتی رہتی ہیں۔ زیادہ تباہی جوان مردوں کی آتی ہے جنہوں نے ملک و قوم کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہوتا ہے۔ پسماندگان کو یہ بھی دکھ رہ جاتا ہے کہ پتہ نہیں ہمارا بچہ یا ہمارا بھائی کس حال میں مرا ہوگا اور شاید بے گور و کفن ہی رہ گیا ہوگا۔ آخری وقت انہوں نے اس کا منہ بھی نہیں دیکھا ہوتا۔

جنگ کی موت اتنی بھیانک ہوتی ہے کہ نہ اس وقت کوئی ہمدرد پاس ہوتا ہے جو پیاس میں زخمیوں کے منہ میں پانی کا گھونٹ ڈال سکے اور جو مرتے وقت ان کی آنکھیں ہی بند کر سکے۔ زخمی ہیں تو بالکل تن تنہا پڑے ہیں۔ اس وقت ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ لاشیں ہیں کہ کسی کا بازو کٹا پڑا ہوتا ہے۔ کسی کا سر نہیں۔ کسی کی ٹانگ نہیں۔ کسی کے گوشت کے لوتھڑے دور دور تک بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔ ہزاروں زخمی پڑے کراہ رہے ہوتے ہیں اور کوئی ان کی خبر لینے والا نہیں ہوتا۔

جب شہروں اور آبادیوں پر بمباری ہوتی ہے تو ایسی تباہی مچتی ہے کہ الامان و الحفیظ۔ بڑی بڑی عمارتیں کھنڈر بن جاتی ہیں۔ مغلوب فوج کے جوان اسیر بنا لیے جاتے ہیں۔ انہیں طرح طرح کی سزائیں بھی دی جاتی ہیں۔ انہیں پوری خوراک نہیں ملتی اور اگر ملتی بھی ہے تو بھیڑ بکریوں کی طرح۔ عورتوں اور بچوں کو یرغمال بنا لیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ جانوروں اور لونڈیوں کا سا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ بڑے بڑے تاجر اور دولت مند بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بیواؤں کی چیخیں نہیں سنی جاتیں۔ یتیموں کے نالے دل چیر دیتے ہیں۔ خوش پوش امراء کو تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں ملتا۔ بہت سے لوگ بھوکے مر جاتے ہیں۔ رہی سہی خوراک بمباری سے تباہ ہو جاتی ہے۔ جن شہروں میں ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کوئی جن پھر گیا ہے۔ گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں نکلنے سے ڈر لگتا ہے۔ بارونق شہر کھنڈر بن چکا ہوتا ہے۔

جس ملک میں جنگ ہوتی ہے وہ ہر لحاظ سے تباہ ہو جاتا ہے۔ وہاں فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور خوراک کی کمی کی وجہ سے رہے سہے لوگ قحط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آبادیاں نذر آتش ہو جاتی ہیں۔ میدان کارزار میں لاشوں کی بدبو سے وبائی امراض پھوٹ پڑتی ہیں جو دور دراز کے شہروں اور دیہاتوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ملک کے دوسرے حصوں میں تجارت بالکل ٹھپ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اشیاء ضرورت مہنگی ہو جاتی ہیں۔ مصنوعات کی قیمت گر جاتی ہے۔ مزدور فاقوں سے مرنے لگ جاتے ہیں۔ جہاں جنگ ہو اس ملک کا دیوالیہ نکل جاتا

ہے۔ اس کی اقتصادیات بالکل تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد برطانیہ کی جو حالت ہوئی وہ بیان کی محتاج نہیں۔ شہر ہیروشیما اور ناگاساکی کی بربادی ہمارے سامنے ہے۔ جنگ کے باعث ہی جرمنی کے ٹکڑے ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی اب تک نہیں ہو سکی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جنگ اس قدر بھیانک چیز ہے تو لڑی کیوں جاتی ہے؟ اس کی وجوہات بہت سی ہیں۔ کئی **ملک** ہوس **ملک** گیری کی وجہ سے جنگ کرتے ہیں۔ کسی پر جنگ ٹھونس دی جاتی ہے اور لڑائی کا جواب لڑائی سے دینا پڑتا ہے۔ بعض اوقات اپنے حقوق کی پاسبانی کی لیے جنگ لڑی جاتی ہے اور ایسے حالات دنیا میں پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لہٰذا جنگ ناگزیر ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مہذب سے مہذب **ملک** نے بھی جنگ لڑی ہے۔ اس کی وجوہات چاہے کچھ بھی ہوں جنگ کہیں نہ کہیں ہوتی ہی رہتی ہے۔

انسانوں کے علاوہ، حیوانات میں بھی لڑائی کا مادہ موجود ہے۔ ان میں طاقت ور کمزور پر غالب آنے کے لئے لڑتا ہے۔ آج تک یہ نہیں دیکھنے میں آیا کہ بلاوجہ کمزور کسی طاقت ور سے لڑا ہو مگر طاقتور بلاوجہ بھی اپنی منفعت کے لئے کمزور سے جنگ کرتا ہے۔ اسے مارتا ہے، اسے دباتا ہے اور اس پر غلبہ پالیتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر جاندار میں یہ خواہش ہے کہ وہ دوسرے پر اپنی برتری جتائے یا منفعت حاصل کرے۔ جب کسی قوم یا **ملک** کی برتری دوسری قوم یا **ملک** تسلیم نہیں کرتا تو وہ جنگ پر آمادہ ہو جاتا ہے اور جنگ کے بعد جب وہ غالب و مغلوب کی

حیثیت میں ہوتے ہیں تو ان کے درمیان امن ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جنگ کے بیشمار نقصانات کے باوجود کچھ فائدے بھی ہیں۔

جب ایک قوم دوسرے ملک میں جا کر جنگ کرتی ہے اور فتح مند ہوتی ہے تو اپنی تہذیب وتمدن اور ثقافت کا عکس مغلوب قوم پر ضرور چھوڑتی ہے۔ اس طرح سے جنگ کی بدولت تہذیب وشائستگی دوسرے علاقوں میں پھیلتی ہے۔ جنگ سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ جنگ اپنی مدد آپ کے اسلوب سکھاتی ہے۔ اگر امن ہی امن ہو اور جنگ کبھی نہ ہو تو تفکر، جذبہ اخوت، تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ، دور اندیشی، محبت اور عقدی کشائی، بہادری اور جوانمردی کی صلاحیتیں مفقود ہو جائیں۔ جنگ ان صلاحیتوں کو برقرار رکھتی ہے۔

گھریلو دستکاریاں

گھریلو دستکاریوں میں سوتی، اونی اور ریشمی کپڑا بننا، لکڑی سے فرنیچر بنانا، اشیائے آرائش بنانا، سپورٹس کا سامان بنانا، آلات جراحی بنانا، مٹی، چینی، تانبے، پیتل، ایلومینیم، سٹین لیس سٹیل کے برتن بنانا اور ان پر نقاشی کرنا، چمڑہ سازی اور اس سے مختلف قسم کی اشیاء تیار کرنا، دھاتوں سے سامان تیار کرنا، ہاتھ سے اشیاء تیا کرنا اور قالین بنانا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مصنوعات ملکی ضروریات کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی برآمد کی جاتی ہیں اور ان سے کثیر زرمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ پاکستان میں کپاس بکثرت پیدا ہوتی ہے اس سے تیار کردہ سوتی کپڑے کی بیرون ملک بہت مانگ ہے۔ پاکستان سے جو لوگ دوسرے ممالک کو جاتے ہیں وہ اپنے ساتھ سوتی کپڑے سوغات کے طور پر لے جاتے ہیں۔ وہ لوگ سوتی کپڑا پہن کر بہت سکون محسوس کرتے ہیں۔ خاص طور پر مڈل ایسٹ کے ممالک میں گرمی کی وجہ سے سوتی کپڑا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ڈھاکہ کی ململ دنیا بھر میں مشہور تھی لیکن آج پاکستان میں اس سے بھی نفیس اور اعلیٰ کپڑا تیار ہو رہا ہے۔

پاکستان کے بہت بڑے شہروں میں آج بھی دستی کھڈیوں کا رواج ہے۔ گوجرانوالہ، ملتان، پشاور، کوہاٹ، قصور اور ڈیرہ اسماعیل خاں کی لنگیاں آج بھی بہت مشہور ہیں۔ ملتان، لیہ اور مظفر گڑھ کے کھیس بہت خوبصورت ہوتے ہیں جن پر بنائی میں ایسی خوبصورت گلکاری کی ہوئی ہوتی ہے کہ دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے، سندھی نمونوں میں حیدر آباد، ٹھٹھہ اور شکار پور کا کپڑا بہت مشہور ہے۔ سرحد

اور بلوچستان کی گرم لوئیاں اور پٹو بہت مشہور ہیں۔ گجرات کے نزدیک جلال پور جٹاں میں اونی دھسے اور شالیں تیار ہوتی ہیں۔ ہم بہت سا خام مال برآمد کرتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ خام مال باہر بھیجنے کی بجائے تیار شدہ مال تیار کر کے باہر بھیجیں تا کہ زیادہ سے زیادہ زرمبادلہ کمایا جا سکے۔ جن ملکوں نے ترقی کی ہے ان کی ترقی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ صنعت میں بہت آگے نکل گئے ہیں اور ایک روپیہ کی چیز کے دس روپے بنا رہے ہیں۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں ٹینریاں لگی ہوئی ہیں۔ مثلاً شاہدرہ، مریدکے، گوجرانوالہ، وزیرآباد اور سیالکوٹ کے علاوہ راولپنڈی اور پوٹھوہار کے علاقے میں پوٹھوہاری جوتے تیار ہوتے ہیں پشاور اور اس کے گردونواح کے قصبوں میں چمڑے کے دیدہ زیب ہینڈ بیگ اور پشاوری چپل تیار ہوتی ہے۔ کوہاٹ میں بھی چپل بہت تیار ہوتی ہے۔ پشاوری اور کوہاٹی مضبوط بھی بہت ہوتی ہے اور قیمت میں بھی نسبتاً ارزاں ہوتی ہے۔

پاکستان میں بہت سے صنعتی شہر ہیں۔ ہر شہر قصبے اور گاؤں میں وہاں کی مقامی ضروریات پوری کرنے کے لئے لوہار، ٹھٹھیرے، ترکھان چینی گر اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ گوجرانوالہ میں قسم قسم کے برتن، الماریاں، ٹرنک، زرعی آلات، بجلی کا سامان، لوہے پیتل اور تانبے کی مصنوعات تیار کی جاتی ہیں۔ لوہے کے دروازے، کھڑکیاں، روشندان، جنگلے اور سیڑھیوں کے لیے ریلنگ تیار ہوتی ہیں۔ قالین بانی کا کام بھی گھر گھر ہوتا ہے۔ سیالکوٹ اور وزیرآباد میں کٹلری کا سامان اور جراحی اور سپورٹس کا سامان تیار ہوتا ہے اور سٹین لیس سٹیل کے برتن بھی تیار

ہوتے ہیں۔ یہاں بننے والے پریشر ککر خاص طور پر مشہور ہیں۔ ڈیرہ غازی خاں، بھیرہ، سلانوالی، ڈیرہ اسماعیل خاں اور پشاور میں لکڑی کی کھدائی کا کام ہوتا ہے اور اس سے قسم قسم کا سامان آرائش و آسائش تیار ہوتا ہے۔

ہاتھ سے جو سامان تیار ہوتا ہے اسے ہینڈی کرافٹس کہتے ہیں۔ ہینڈی کرافٹس کی بیرون ملک بہت برآمد ہوتی ہے۔ یورپ اور امریکہ والے مشین سے تیار کردہ مال کو اتنی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جتنی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی چیز کو کیونکہ مشینری بنانے میں تو وہ خود ماہر ہیں ہاتھ سے کام کرنا ان کے لیے ایک عجوبہ ہے۔ اس لیے وہ اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ ہینڈی کرافٹس میں ہاتھی دانت کا سامان بھی تیار ہوتا ہے۔ ہڈی کے شطرنج گوجرانوالہ، ملتان اور لاہور میں تیار ہوتے ہیں جو بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور بیرون ملک برآمد کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح سے ہڈی کا سامان آرائش جس میں عورتوں کے زیورات شامل ہیں بھی تیار ہوتا ہے۔

آج کل پاکستان میں ایک بہت ہی خوبصورت پتھر دریافت ہوا ہے جسے اونیکس کہتے ہیں۔ اس سے تیار کردہ مصنوعات غیر ممالک کی مارکیٹوں میں بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ ڈرائنگ رومز کی آرائش کے لئے بہت سا سامان اونیکس میں تیار ہوتا ہے۔ ٹیبل لیمپ، ایش ٹرے، جیولری بکس، شطرنج، مختلف قسم کے جانور، انگور کے گچھے، چابی چین، واٹر سیٹ، بیئر سیٹ، گلدان وغیرہ وغیرہ، پاکستان کے لوگ بہت محنتی اور ذہین ہیں۔ اگر حکومت خام مال باہر نہ بھیجے اور امداد باہمی کے

ذریعے اس مال کی مصنوعات یہیں تیار کروا کر برآمد کرے تو بہت ہی زیادہ زر مبادلہ کمایا جا سکتا ہے جس سے ملک کی معاشیات بہت مضبوط ہو سکتی ہے۔ اگر حکومت سرپرستی مہیا کرے تو وہ لوگ جو نہایت محدود وسائل کے ساتھ گھریلو دستکاریاں لگا رہے ہیں اور طرح طرح کا ہینڈی کرافٹ کا سامان تیار کر رہے ہیں نسبتاً بہتر اور زیادہ مال تیار کر سکیں گے اور برآمد میں اضافے اور اس کے نتیجے میں ملک کے اندر خوشحالی کا باعث بنیں گے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

گداگری

کسی سے کچھ مانگنا اور اس کے بدلے میں کوئی کام نہ کرنا یا لے کر واپس نہ کرنا بھیک مانگنا یا گداگری کہلاتا ہے۔ پہلے زمانے میں گداگری مجبور ہو کر کی جاتی تھی۔ کوئی اپاہج ہوتا یا بالکل بیکار ہوتا یا کوئی ایسا ضرورت مند ہوتا جس کی ضرورت اپنی معاش سے پوری نہ ہو سکتی یا جس کا کوئی معاشی وسیلہ نہ ہوتا تو مجبور ہو کر بھیک مانگتا مگر آج کل بھیک مانگنے کے بہت سے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔ کوئی التجا کر کے مانگتا ہے، کوئی فریاد کر کے مانگتا ہے، کوئی گانا گا کر مانگتا ہے، کوئی ساز یا باجا بجا کر مانگتا پھرتا ہے، کوئی سارنگی بجا کر مانگتا پھرتا ہے، کوئی جعلی اپاہج بن جاتا ہے، کوئی بے یار و مددگار مسافر بن کر مانگتا پھرتا ہے اور کوئی اپنے مالی نقصان ہونے کا بہانہ بنا کر مانگتا ہے۔ ان میں زیادہ سے زیادہ پانچ فیصد لوگ ایسے ہیں جو واقعی حقدار ہوتے ہیں جبکہ پچانوے فیصد پیشہ ور لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے گداگری کو خاندانی طور پر اپنایا ہوا ہے اور بہت سے لوگوں نے اسے بطور کاروبار اپنایا ہوا ہے کیونکہ جب انسان اپنی غیرت کو خیرباد کہہ دیتا ہے تو اسے مانگنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔

آج کل لوگ اتنے ہوشیار اور چالاک ہو گئے ہیں کہ انہوں نے گداگری کے لیے عجیب عجیب قسم کے طریقے اپنائے ہوتے ہیں۔ کئی آدمی اچھے بھلے ہوتے ہیں مگر ظاہری طور پر اندھے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ کئی لوگ اپنے آپ پر مصنوعی رعشہ طاری کر لیتے ہیں تاکہ لوگ ان پر ترس کھا کر انہیں زیادہ سے زیادہ

پیسے دیں۔ اس کے علاوہ کئی لوگ مسجد یا دینی مدرسہ کا بہانہ بنا کر مانگتے پھرتے ہیں اور اسلام اور مذہب کا واسطہ دے کر لوگوں سے پیسے بٹورتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ کاروباری ذہن سے مانگتے ہیں۔ لوگوں کو آیات و احادیث سنا سنا کر بھی پیسے دینے کے لئے انہیں تیار کر لیتے ہیں۔ خاص طور پر عورتیں ان سے بہت جلد متاثر ہو جاتی ہیں۔ ایسے لوگ بھی دیکھے گئے ہیں جو گھروں میں بظاہر فقیر کے طور پر داخل ہوتے ہیں اور پھر ایسے الفاظ اور جملے الاپنے لگ جاتے ہیں جن سے وہ بہت بڑے بزرگ یا نجومی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ سادہ لوح عورتوں کو لوٹ لیتے ہیں اور انہیں بہت نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ گداگری بھی کرتے ہیں اور چوری اور ٹھگی بھی کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بہت ہی خطرناک اور جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی غرض کے لئے بزرگان دین اور اولیاء اللہ کی آڑ لے کر مانگتے پھرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کسی بزرگ کا گدی نشین، نمائندہ یا مرید ظاہر کر کے سادہ لوح لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ ان لوگوں نے عجیب و غریب قسم کے فقرے رٹے ہوئے ہوتے ہیں جنہیں سن کر انسان یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ یہ آدمی خدا تعالیٰ کا مقرب ہے اور اگر اسے کچھ نہ دیا تو معلوم نہیں کون سی آفت ہم پر آ گرے۔

گداگر ایسے ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں کہ لوگ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ یہ آدمی ہمارے لیے فرشتہ رحمت بن کر آیا ہے۔ وہ اسے واقعی بزرگ اور خدا تک پہنچا ہوا سمجھنے لگتے ہیں۔ کئی لوگ اس طرح بھی کرتے ہیں کہ کسی کے حالات

کسی نہ کسی ذریعے سے معلوم کر کے اس کے گھر چلے جاتے ہیں اور اس کا ہاتھ دیکھ کر یا فال نکال کر اس کے حالات بیان کرنے لگتے ہیں جو بالکل درست ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اس طرح کا چکمہ دے کر لوٹ لیتے ہیں۔

آج کل کے گداگر صرف گداگر ہی نہیں ہوتے بلکہ گداگری کے بھیس میں جرائم کا ارتکاب بھی کرتے پھرتے ہیں۔ گھروں میں بظاہر ایک گداگر بن کر گھستے ہیں اور چوری ڈاکہ اور قتل و غارت کے واقعات تک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ایسے ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں کہ ایک عورت کو گھر میں مانگنے کے لیے بھیجا جس کے پیچھے مسلح افراد ہوتے ہیں۔ عورت مانگنے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اگر دیکھتی ہے کہ گھر میں اکیلی عورت ہے تو اس طرح کی آواز نکالتی ہے جس سے اس کا ساتھی یہ سمجھ لیتا ہے کہ واقعی گھر میں عورت اکیلی اور جرم کا ارتکاب آسانی سے ہو سکتا ہے۔ وہ جھٹ اندر داخل ہو کر عورت کو دبوچ لیتے ہیں اور گھر سے روپیہ پیسہ زیور وغیرہ لوٹ کر لے جاتے ہیں اور ایسا کرنے کے بعد یہ رقم اپنی عیاشی اور شراب و کباب میں خرچ کرتے ہیں۔

گداگری جیسے مکروہ فعل کی حوصلہ افزائی ایسے عوام بھی کرتے ہیں جو ضعیف العقیدہ، بے وقوف اور سادہ لوح ہوتے ہیں۔ اس کا علاج حکومت آسانی سے کر سکتی ہے۔ جب حکومت کسی بیرونی دشمن سے لڑ سکتی ہے، اپنے ہر حکم کی تعمیل کرا سکتی ہے، جو قانون چاہے نافذ کر سکتی ہے اور جو عمل چاہے کر سکتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ گداگری ختم نہیں ہو سکتی اس کے لیے باقاعدہ اپاہج خانے ہونے چاہئیں جہاں پر

بے بس اور معذور لوگ داخل ہوں جن کی مکمل کفالت حکومت کے ذمے ہو۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی گداگری قانوناً جرم قرار دی جائے اور اس شخص کو بھی سزا دی جائے جو کسی پیشہ ور بھکاری کو بھیک دیتا ہے۔ اگر وہ مخیّر ہے تو براہ راست محتاج خانے کو دے یا وہ ایسے شخص کو دے جو واقعی عزت دار آدمی ہو جس کے متعلق اسے پورا علم ہو کہ وہ کسی صورت میں مانگنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اس کی چپکے سے مدد کر سکتا ہے مگر سر بازار ہر مانگنے والے کو دینا جرم قرار دیا جانا چاہیے۔ یہ قوم کے جسم پر بہت خطرناک قسم کا ناسور ہے۔ اس سے بہت سے جرائم کی پرورش ہوتی ہے۔ لوگ ان سے بہت تنگ آئے ہوئے ہیں کیونکہ مانگنے والے اتنے بیباک ہو گئے ہیں کہ اگر ان کو کچھ نہ دیا جائے تو گالیوں پر بھی اتر آتے ہیں۔ گداگری کے انسداد کے لیے ملک کی معاشیات کو درست کرنا بھی حکومت ہی کا فرض ہے۔ عوام تو سادہ لوح ہوتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں بے بس ہیں۔ اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت ہی پر عائد ہوتی ہے۔

فلم بینی

سینما بھی دنیا کی ایک دلچسپ ایجاد ہے جو تفریح طبع کے لیے سامان مہیا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے ہر شہر میں سینماؤں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آج کل بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہوگا جس نے سینما نہ دیکھا ہو۔ سینما ہال کے پردہ سیمیں پر آپ چلتے پھرتے بولتے، جیتے جاگتے انسانی زندگی کے مختلف روپ دیکھ سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ حقیقی معنوں میں آپ کے سامنے ہو رہا ہے اور بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اصل کردار کی نقل دیکھ رہا ہے۔ اس میں کرداروں کی آواز اور ان کی تصویریں پلاسٹک کی ایک ریل میں بند کر دی جاتی ہیں۔ کس قدر کمال کی ایجاد ہے کہ جب پلاسٹک کی یہ ریل چلتی ہے تو جو کچھ محض تصویروں کی صورت میں ہوتا ہے اور جس میں کوئی بھی حقیقت نہیں ہوتی ایک خاص رفتار سے تصویروں کے حرکت کرنے کی وجہ سے حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے ہر منظر کی حرکات و سکنات بھی آواز سے بالکل ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔

فلم بینی تفریح کا سب سے زیادہ مقبول اور آسان ذریعہ ہے۔ سارا دن دماغی اور جسمانی محنت کرنے کے بعد جب انسان تھک جاتا ہے تو فلم اسے تفریح طبع کا سامان مہیا کرتی ہے۔ انسان تھوڑی دیر کے لیے تمام پریشانیوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ فلمی پردے پر زندگی کے مختلف روشن اور رنگین پہلو دیکھتا ہے تو دن بھر کے تفکرات اور سارے دن کی پریشانیوں کا بوجھ ہلکا محسوس ہونے لگتا ہے۔ فلم

سے خاص و عام سبھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔مزدور، دفتروں میں کام کرنے والے لوگ، تانگہ بان، رکشہ ڈرائیور، خوانچہ فروش اور طرح طرح کی مزدوری کرنے والے لوگ اور کم آمدنی والا طبقہ فلم بینی کا زیادہ شوق رکھتے ہیں اور انہی لوگوں کی اکثریت سینما ہال میں ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ امراء کے تو تفریح کے بے شمار ذرائع ہوتے ہیں اور ان کو روزمرہ زندگی کی وہ پریشانیاں بھی نہیں ہوتیں جو عام آدمی کو ہوتی ہیں۔سینما کے ذریعے بہت سے مفید اور تعمیری کام لیے جا سکتے ہیں۔پردہ سیمیں پر قدرتی مناظر بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج، طوفان کا خروش، آندھیوں کی تندی، چمن کی بہاریں اور مرغان چمن کے چہچہے دیکھے اور سنے جا سکتے ہیں۔غرض ہر قسم کے مناظر کو فلمایا اور لوگوں کو دکھایا جا سکتا ہے۔چونکہ لوگ بڑے شوق سے دیکھتے ہیں اس لیے اگر فلم ساز چاہیں تو وہ تعمیری فلمیں بنا کر لوگوں کی اصلاح کر سکتے ہیں۔فلموں سے بہت سے اخلاقی کام بھی لئے جا سکتے ہیں مگر اب تو تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بھی فلمیں بڑا کردار ادا کر رہی ہیں۔اس کے علاوہ تاریخی اور تعلیمی امور بھی فلم کی شکل میں دکھائے جا سکتے ہیں۔وہ بچہ جو تاریخی واقعات کو بغیر کسی تصور کے رٹ لیتا ہے فلم کے ذریعے تاریخی واقعات کا ایک مصور فیچر اس کے تصور میں محفوظ کر لے گا اور وہ ان واقعات کی جزئیات سے نہ صرف واقف ہو جائے گا بلکہ زیادہ دیر تک ان واقعات کو یاد رکھ سکے گا۔

اور چیزوں کی طرح فلم بینی کے بھی فوائد و نقصانات ہیں۔فلم بینی انسان کے لیے سارے دن کی کوفت اور پریشانیوں سے نڈھال ہو جانے کے بعد تفریح طبع کا

سامان مہیا کرتی ہے۔ اصلاحی فلمیں ہماری زندگی کے تاریک پہلوؤں اور سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لیے لمحہ فکریہ مہیا کرتی ہیں اور معاشرے کی اصلاح اور تعمیری کاموں میں مدد دیتی ہیں۔ تاریخی فلمیں کسی ملک اور قوم کا جیتا جاگتا کردار پیش کرتی ہیں۔ وہ فلمیں جن میں حب وطن کو موضوع بنایا جاتا ہے دیکھنے والوں کے دلوں میں بھی اعلیٰ اقدار و صفات پیدا کرتی ہیں۔ اصلاحی فلموں میں شامل قومی اور رزمیہ نظمیں دلوں میں حب وطن کا جذبہ پیدا کرنے اور اسے مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اسی طرح شہیدان وطن کی داستانیں بھی فلم کی صورت میں دکھائی جاتی ہیں جو ہمارے لیے ایک اچھی مثال کا کام دیتی ہیں اور دلوں میں حب وطن کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔

تفریحی اور واقعاتی کردار کی نمائش کے علاوہ فلمیں تعلیمی میدان میں بھی اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ ان کی مدد سے خشک اور بے کیف مضامین میں دلچسپی ہو جاتی ہے۔ طلباء یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پڑھنے کی بجائے فلم دیکھ رہے ہیں۔ یہ نفسیاتی اثر ان کے مطالعہ کے رجحان کو بڑھا دیتا ہے کیونکہ ان اسباق کو دلچسپ بنانے کے لئے کچھ دلچسپ کردار بھی رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یوں فلمی تصاویر کی مدد سے طالب علموں کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح کند ذہن طلباء بھی مشکل مضامین کو ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ خاص طور سے تاریخ جغرافیہ اور عمرانی علوم اگر تصاویر کے ذریعے کہانی کی شکل میں پڑھائے جائیں تو نتائج زیادہ حوصلہ افزا نکلتے ہیں اور بہت جلد طلباء اسباق کو ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ

کاشتکاروں کے لیے زرعی ہدایت اور زرعی آلات کا استعمال فلمی تصاویر کے ذریعے دکھایا جاتا ہے۔ کاروباری حضرات کے لیے بھی فلم ان کی اشیاء و مصنوعات کی تشہیر میں مدد دیتی ہے۔ وہ اپنی مصنوعات کے اشتہار فلموں کے ساتھ دکھا کر اور کسی بھی طریقے سے فلموں میں شامل کرا کے انہیں عوام میں متعارف کراتے ہیں۔ اس کے علاوہ دستاویزی فلمیں ہمیں دنیا کے حالات و واقعات سے آگاہ کرتی ہیں۔

جہاں فلم بینی کے اتنے فوائد ہیں وہاں اس کے بعض نقصانات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دن بھر کا خون پسینے سے کمایا ہوا پیسہ شام کو فلم کی نذر ہو جاتا ہے۔ وقت کا ضیاع بھی ہوتا ہے۔ فحش اور غیر معیاری فلمیں ذہن میں پراگندگی پیدا کرتی ہیں۔ ناپختہ ذہن کے نوجوان چوری، ڈاکہ، رہزنی، قتل و غارت اور دوسرے جرائم کے واقعات دیکھنے کے بعد خود بھی ایسا کر سکتے ہیں جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ فلمیں احتیاط سے بنائی جائیں۔

اخبار بینی

عہد حاضر میں اخبار معلومات کے حصول کا بہترین اور آسان ذریعہ ہے۔ اخبار کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والا انسان حکومت کی پالیسیوں، عوام کے رجحانات و شکایات، بین الاقوامی حالات اور کاروباری اونچ نیچ سے واقف ہوتا ہے اور رفتار زمانہ سے باخبر رہتا ہے۔ اس کی قوت ادراک میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا اسلوب تحریر بہتر ہو جاتا ہے۔

اخبار چند صفحوں کا مجموعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اسے جام جہاں نما بھی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس کے مطالعہ سے ملکی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ ملک میں رونما ہونے والے واقعات کا علم ہوتا ہے۔ بین الاقوامی حالات کا علم بھی اخبارات کے ذریعے ہوتا ہے۔ آج کل ایسے ذرائع موجود ہیں کہ ہر ملک کی خبریں روزانہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔ دوسرے ممالک میں اخبارات کے نمائندے اپنے اپنے اخبار کو مطلع کرتے رہتے ہیں۔ اخبارات نے دور دراز کے فاصلوں کو بہت کم کر دیا ہے جس سے دنیا کے انسان ایک دوسرے کے قریب ہو گئے ہیں اور بین الاقوامی مشکلات و مسائل کا حل تلاش کرنا آسان ہو گیا ہے۔

اخبار حکومت اور عوام کے درمیان رابطہ کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ حکومت جو پالیسیاں ترتیب دیتی ہے اخبارات میں شائع ہوتی ہیں تو عوام اس کے حق میں یا اس کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کر کے حکومت کی پالیسیوں میں اصلاح کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جمہوریت کا اصول ہی یہی ہے کہ حکومت کوئی قانون اپنی مرضی

سے عوام پر نہ ٹھونسے بلکہ عوام کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی رضامندی سے قوانین بنائے جائیں تا کہ وہ عوام کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید و مؤثر ثابت ہوں۔ اخبارات میں مختلف قسم کے اداریے، مضامین اور انٹرویو شائع ہوتے ہیں جن سے عوام کی سیاسی تربیت ہوتی ہے اور انہیں ملکی حالات کا علم ہوتا ہے۔

اخبار بینی سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان سے عوام کو اپنے سود و زیاں کا بھی علم ہوتا رہتا ہے اور اپنے حقوق اور فرائض کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس سے فکر و عمل کی راہیں کھلتی ہیں اور قوم ترقی کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ اندھیرے میں رہ کر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخبار بینی سے اصلاح کے کئی پہلو نکلتے ہیں۔ اس سے عوام کی ذہنی تربیت کا سامان پیدا ہوتا ہے۔ اخبارات میں عوام اپنے مراسلات کے ذریعے یا ایڈیٹر حضرات اپنے اداریوں کے ذریعے معاشرے کی مختلف برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایسے میں حکومت کا فرض بن جاتا ہے کہ ان برائیوں کا قلع قمع کرے۔ ٹریفک کے حادثات، غنڈہ گردی، گداگری کی لعنت اور جہیز کی فضول رسم اور کئی دیگر اہم موضوعات سے متعلق مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اخبار بینی ایک علمی اور مطالعاتی مشغلہ ہے جو تنہائی میں بھی قاری کا ایک اچھا رفیق ثابت ہوتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ باقاعدگی سے اخبار پڑھنے والے اخبار کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اگر انہیں ایک دن بھی اخبار نہ ملے تو وہ یوں محسوس کرتے ہیں جیسے انکا کچھ کھو گیا ہو۔ ان کی طبیعت بہت بے چین

رہتی ہے کیونکہ اخبار انک کے لیے جومعلومات غذا مہیا کرتا ہے وہ اس کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔اس مستقل علم کی وجہ سے وہ وقت کی پابندی کے عادہ ہو جاتے ہیں جس طرح ایک نمازی اگر کسی وجہ سے کوئی نماز ادا نہ کر سکے تو اس کی طبیعت میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح اخبار بینی کے عادی کی طبیعت بھی اخبار نہ ملنے پر بے چین ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اخبار کے با قاعدہ مطالعہ سے انسان کی زندگی میں با قاعدگی پیدا ہو جاتی ہے۔

صنعتی اور کاروباری حضرات کے لیے اخبار ان سے متعلقہ معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔حکومت کی صنعتی اور تجارتی پالیسیوں کا اعلان بھی اخبارات کے ذریعے ہوتا ہے۔ملکی اور غیر ملکی معیشت سے باخبر رہنے کے لئے اخبار کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔صنعت کار اور تاجر اپنی مصنوعات اور اشیاء کو اخبار کے ذریعے ہی عوام الناس میں روشناس کرواتے ہیں اور خرید وفروخت کرنے والے بھی اخبار سے استفادہ کرتے ہیں۔مختلف قسم کے اعلانات و اطلاعات اور عدالتوں اور سرکاری وغیر سرکاری اداروں کے نوٹس بھی اخبارات میں شائع کئے جاتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب صرف اخبارات میں خبریں ہی ہوا کرتی تھیں مگر آج کل اخبار ایک اچھی خاصی ہمہ جہتی رہنمائی کا کام بھی کرتا ہے۔اس میں مختلف قسم کے مضامین چھپتے ہیں جن میں علمی، اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور اقتصادی مواد ملتا ہے جس کے مطالعہ سے قاری کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔طلباء کے لئے بھی اخبار کا مطالعہ نہایت ضروری ہے کیونکہ اس میں اکثر ایسے مضامین بھی چھپتے رہتے ہیں جو

ان کے لیے ایک اچھے استاد کا کام دیتے ہیں۔

اب اخبارات نے مختلف خصوصی ایڈیشن بھی شائع کرنے شروع کر دیے ہیں مثلاً ادبی ایڈیشن، اسلامی ایڈیشن، سیاسی ایڈیشن، خواتین کا ایڈیشن، بچوں کا ایڈیشن، فلمی ایڈیشن، فیشن میگزین اور اتوار میگزین وغیرہ۔ ان ایڈیشنوں میں اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے اس قدر مواد چھپتا رہتا ہے کہ اب اخبار پڑھنے والے کو اخبار کے علاوہ رسالوں کا مواد بھی مل جاتا ہے۔ اسی پہلو کے پیش نظر ہر اخبار زیادہ سے زیادہ خاص ایڈیشن شائع کرنے اور انہیں زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

قومی تعمیر و ترقی میں افواج پاکستان کا حصہ

ہر ملک کی مسلح افواج کی ذمہ داری اپنے پیشہ وارانہ فرائض انجام دینا اور اپنے ملک کی سرحدوں کا دفاع کرنا ہے لیکن ہمارے ملک کی افواج کی ذمہ داریاں دو گونہ ہیں۔ وہ زمانہ جنگ میں دشمنوں کی جارحیت کے خلاف ملک کا دفاع کرتی ہیں اور زمانہ امن میں قومی تعمیر و ترقی میں حصہ لیتی ہیں۔ ان دونوں میدانوں میں افواج پاکستان نے حیرت انگیز کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔

چونکہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اس لیے اس کی مسلح افواج کو نہ صرف ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے بلکہ اس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے بھی میدان عمل میں آنا پڑتا ہے۔

ہماری مسلح افواج کا دوسرا فرض اپنے پیشہ وارانہ فرائض انجام دینا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کارکردگی کا ریکارڈ ہمیشہ باعث فخر رہا ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت ہماری فوج کے حصے کا اسلحہ، جنگی جہاز اور ہوائی جہاز ہندوستانی فوجوں کے قبضہ میں تھا۔ اس سامان کی تقسیم میں ہندوؤں اور انگریزوں کی ملی بھگت سے انتہائی بے ایمانی سے کام لیا گیا۔ افواج پاکستان کے حصے میں صرف ناکارہ سامان حرب آیا، جو طیارے دیے گئے، وہ اتنے ناکارہ تھے کہ بڑے ماہر طیارچی بھی ان کو ہندوستان کے دور دراز مقامات سے اڑا کر پاکستان نہیں لا سکتے تھے۔ اس بے سرو سامانی کے عالم میں وجود میں آنے والی فوج کا شمار آج دنیا کی بہترین افواج میں ہوتا ہے۔

زمانہ امن میں پاک فوج انتہائی اہم قومی منصوبوں کی تعمیر میں مصروف رہتی ہے۔اس کی ایک مثال شاہراہ قراقرم کی تعمیر ہے۔اس کی تعمیر انجینئرنگ کا شاہکار ہے۔چین کی سرحد سے شروع ہو کر گلگت، لداخ اور کشمیر کے انتہائی شمالی علاقوں میں یہ شاہراہ دیو قامت گلیشئروں اور فلک بوس پہاڑوں پر سے گزرتی ہوئی پاکستان اور چین کے درمیان ایک سدا کھلا رہنے والا ہائی وے فراہم کرتی ہے۔ ۸۳۲ کلومیٹر طویل یہ شاہراہ ہمارے فوجی جوانوں کی پیشہ وارانہ مہارت اور سپاہیانہ عزم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

صنعتی ترقی کے میدان میں بھی افواج پاکستان نے مثبت کردار ادا کیا ہے۔ فوجی فاؤنڈیشن نے ملک میں شکر سازی، ٹیکسٹائل، چاول، تمباکو اور چمڑے کے کارخانے لگائے ہیں۔اس کے علاوہ کئی جگہوں پر سکول اور کالج قائم کر کے ملک کی علمی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اس کے علاوہ افواج پاکستان نے بلوچستان کی ترقی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔قیام پاکستان کے وقت یہ ملک کا سب سے پس ماندہ صوبہ تھا۔افواج پاکستان نے بلوچستان میں سب سے زیادہ سڑکوں کی تعمیر کی۔پچھلے دس سال میں بلوچستان میں فوجی انجینئروں نے ۹۰۰ کلومیٹر سے زائد پختہ سڑکیں تعمیر کیں۔اس کے علاوہ آب رسانی کے کئی منصوبے بھی مکمل کئے، جن میں کیہان ڈیم کی تعمیر بھی شامل ہے۔چونکہ بلوچستان میں پانی کی قلت ہے اس لیے فوجی انجینئروں نے بلوچستان میں پندرہ حفاظتی بند بھی تعمیر کیے ہیں۔اس سے اس صوبہ کی ترقی کی

راہیں کھل گئی ہیں آج یہ صوبہ بھی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔

دیگر صوبوں میں بھی افواج پاکستان نے نہ صرف سڑکوں کی تعمیر کی بلکہ اور بھی کئی اہم تنصیبات کے قیام میں حکومت کی مدد کی۔ جہاں جہاں ضرورت پڑی، فوجی انجینئروں نے اپنے سپاہیانہ عزم سے کام لے کر ملکی تعمیر و ترقی کے اہم منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ بین الاقوامی مقابلوں میں نمایاں پوزیشن حاصل کر کے ملک کا نام روشن کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کا ہر شہری بجا طور پر اپنے ملک کی مسلح افواج پر فخر کرتا ہے۔

All rights reserved.
©2002-2006

طاعون

طاعون اس قدر ہولناک مرض ہے اور اس قدر تیزی سے پھیلتا اور انسانوں کو کھاتا چلا جاتا ہے کہ اسے ''کالی موت'' کا نام بھی دیا گیا۔

حفظان صحت کے اصولوں کو نظر انداز کرنا اس مرض کا سب سے بڑا سبب بنتا ہے۔ بدقسمتی سے جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک میں صحت وصفائی کی حالت تسلی بخش نہیں۔ چنانچہ بھارت میں حالیہ طاعون کے اسباب بھی بنیادی طور پر یہ ہے کہ صحت وصفائی کے اصول نظر انداز ہوئے اور چوہوں نے گندگی میں پرورش پائی اور مرض کو تیزی سے پھیلا دیا۔ اس سے پہلے بھی ہندوستان میں یہ مرض پھیل چکا ہے۔ 10-1901ء کے درمیانی عرصے میں اس وبا کی وجہ سے قریباً فیصد مریض لقمہ اجل بنے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس صدی میں تقریباً ۱۵ لاکھ افراد اسی مرض کے باعث موت کے منہ میں چلے گئے۔

ماہرین طب نے اس مرض کے اسباب جاننے کے بعد اس سے بچاؤ کے لئے کچھ اصول مرتب کیے ہیں اور ان کی روشنی میں کچھ تجاویز پیش کی ہیں جن پر عمل کرنے سے اس مرض کا خطرہ ٹل سکتا ہے۔ ضروری تدابیر یہ ہیں:

۱۔ کوڑے کرکٹ اور گندگی کو ختم کر کے کترنے والے جانوروں بالخصوص چوہوں کی تعداد کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ چوہے مار ادویات کے ذریعے چوہے یا اس طرح کے دوسرے کترنے والے جانوروں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ لوگوں کو طاعون اور طاعونی چوہوں کی پہچان کے لئے معلومات فراہم کی جائیں اور انہیں ختم کرنے کی مہم چلائی جائے (یہ چوہے سرخ یا سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں)

۴۔ بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں پر سخت حفاظتی انتظامات کئے جائیں اور کسی بھی طرح سے چوہوں کی جہازوں تک رسائی ناممکن بنائی جائے۔

۵۔ طاعون زدہ علاقوں کا سفر نہ کیا جائے۔

۶۔ مریض کا علاج کرنے والے خاص طور پر حفاظتی تدابیر اختیار کریں تاکہ جراثیم ان تک نہ پہنچ جائیں۔

۷۔ طاعون کے مرض کی ویکسین کا ٹیکہ لگوایا جائے جو اگرچہ سو فیصد موثر تو نہیں پھر بھی بڑی حد تک فائدہ دے سکتا ہے۔

بحیثیت مجموعی اگر معاشرے کو غلاظت سے پاک کریں تو نہ صرف اس مرض بلکہ کئی دوسرے امراض سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ صفائی کے سلسلے میں حکومت بہت کچھ کرسکتی ہے کیونکہ اس کے بے شمار وسائل ہوتے ہیں جو انفرادی سطح پر عوام کے پاس نہیں ہوتے۔ لیکن انفرادی سطح پر بھی عوام کو صحت و صفائی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اگر قوم کے سارے ہی افراد صفائی کا خیال نہ رکھیں تو حکومت کی کوئی بھی مہم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ حکومت کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اٹھوانے اور گلیوں، بازاروں اور عام پبلک مقامات کی صفائی کی ذمہ دار تو ہے مگر ایسا نہیں ہوسکتا کہ حکومت گھروں کے اندر کی صفائی کا ذمہ بھی لے اور گھر کے اندر رہنے والے افراد

کی صفائی بھی اپنے ذمہ لے لے۔ ایسا کسی بھی طرح ممکن ہی نہیں۔ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے جسم، اپنے لباس اور اپنے گھر کی صفائی کا خاص طور پر خیال رکھے اور صفائی کو عادت کے طور پر اپنا لے۔ جسے اسلام نصف ایمان قرار دیتا ہے۔ یہ ہماری کوتاہی ہے ورنہ جس دین نے صفائی کو نصف ایمان کا درجہ دیا ہو کیسے ممکن ہے کہ اس کے ماننے والوں کے جسم گندے ہوں، لباس میلے ہوں اور گھر غلاظت سے بھرے ہوئے ہوں اور آخر بیماریوں اور وباؤں کا شکار رہوں۔

All rights reserved. ©2002-2006

ایڈز

ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی ایسا مرض رہا ہے جو لاعلاج ہوتا ہے۔ انسان اپنی پوری کوشش سے اس کا علاج دریتا کرتا ہے۔ تب تک کوئی اور مرض ایسا جنم لے لیتا ہے جو لاعلاج ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ دنیا کے وجود میں آنے سے لے کر چل رہا ہے اور ہمیشہ چلتا رہے گا۔ ایک زمانہ تھا کہ تپ دق کو لاعلاج مرض سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آخر کار اس کا علاج بھی دریافت کر لیا گیا اور اس سے بچنے کی تدابیر بھی اختیار کر لی گئیں۔ چنانچہ یہ مرض لاعلاج نہ رہا۔ اس سے بچنا بھی آسان ہو گیا اور اس کا علاج بھی ممکن ہو گیا۔ اسی طرح اور کئی بیماریوں نے جنم لیا اور لاعلاج قرار پائیں لیکن ان کے علاج دریافت کر لیے گئے۔ بیماریوں کے جنم لینے، ان کے علاج دریافت ہونے اور پھر نئی بیماریوں کے جنم لیتے چلے جانے کا سلسلہ اس لیے ختم ہونے والا نہیں کہ موت کا علاج انسان کے پاس نہیں اور موت کو بہر حال آ کر رہنا ہے۔

آج کل لاعلاج مرض ایڈز ہے۔ یہ مرض ہے کیا؟ اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بذات خود کوئی واضح طور پر دکھائی دینے والا مرض نہیں لیکن یہ انسانی جسم کے مدافعتی نظام کو بالکل ناکارہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اور انسان کے اندر کسی بھی مرض کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہتی۔ خدا تعالیٰ نے انسان کے اندر ایسا مدافعتی نظام رکھا ہوا ہے کہ وہ بیماریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے کئی چھوٹی موٹی بیماریاں تو ویسے ہی پاس نہیں پھٹکتیں لیکن مرض کا حملہ ہو بھی تو یہ نظام

اس کا پورا مقابلہ کرتا ہے۔ جس سے انسان جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان کے اندر کا مدافعتی نظام ہی ختم ہو جائے تو پھر کسی بھی بیماری سے صحت کی کیا امید باقی رہ جاتی ہے اور کسی بھی بیماری سے بچاؤ کے لئے کونسا راستہ باقی رہ جاتا ہے۔

چنانچہ ایڈز کا مرض اندرونی مدافعتی نظام ختم ہو جانے کی وجہ سے کسی بھی مرض کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہر بیماری اس پر آسانی سے حملہ کرتی ہے۔ اور جو بیماری اسے ایک بار لاحق ہو جاتی ہے۔ اس کا علاج نہیں ہو پاتا، وہ بڑھتی ہی جاتی ہے اور بہت جلد اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

چونکہ یہ بیماری بنیادی طور پر ایسے لوگوں کو لاحق ہوتی ہے جو اخلاقی اعتبار سے غیر محتاط زندگی گزارتے ہیں اور عیش و عشرت کی غرض سے پیشہ ور عورتوں سے تعلقات قائم رکھتے ہیں اس لئے اس بیماری کو عذاب الٰہی بھی کہا جاتا ہے۔ جس معاشرے میں اخلاقی بے راہ روی عام ہو گی وہیں یہ مرض بھی عام ہو گا۔ چنانچہ اس مرض کا آغاز مغرب سے ہوا۔ وہ لوگ جنسی لحاظ سے بالعموم بے راہ رو ہیں اس لئے وہی اس مرض کا پہلا نشانہ بنے۔ وہاں سے یہ مرض دوسرے ممالک میں بھی پہنچا۔ لیکن اگر مغرب سے یہ مرض نہ بھی آئے تو بھی وہ لوگ اخلاقی ضابطوں کی پروا نہیں کرتے اور جنسی آوارگی کی زندگی بسر کرتے ہیں اس مرض کا شکار ہو سکتے ہیں۔ گویا بنیادی طور پر یہ مرض ان لوگوں کو لاحق ہو سکتا ہے جو اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی نہیں گزارتے ہیں۔ لیکن پاک اور صاف ستھری زندگی گزارنے

والوں کو بھی یہ مرض دوسروں کے خون کے راستے لاحق ہوسکتا ہے یا استعمال شدہ سرنج کے ذریعے سے ٹیکہ لگوانے سے ہوسکتا ہے۔

لہٰذا اس مرض سے بچاؤ کے لئے یہ تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں:

۱۔ اسلامی اصولوں کے مطابق پاک صاف زندگی بسر کریں۔

۲۔ عیاشی اور آوارگی سے اور عیاش اور آوارہ لوگوں کی صحبت سے بچیں۔

۳۔ استعمال شدہ سرنج سے ٹیکہ نہ لگوائیں۔ ہمیشہ DISPOSABLE SYRINGE یعنی ایسی سرنج جو ایک بار استعمال کے بعد ضائع کر دی جاتی ہے، استعمال میں لائیں۔

۴۔ خون لینے کی ضرورت پڑ جائے تو کوشش کریں کہ کسی قریبی رشتہ دار سے لیا جائے یا ایسے فرد سے لیا جائے جو بالکل صحت مند ہو اور پاک صاف زندگی بسر کرتا ہو۔ کوئی شخص کتنا ہی ہمدرد ہو اگر عیاشی کی زندگی بسر کرتا ہے تو اس سے خون حاصل نہ کریں۔ اسی طرح کسی بھی اجنبی سے خون حاصل نہ کریں جن میں کئی پیشہ ور لوگ بھی ہوتے ہیں۔ حتی الامکان براہ راست تندرست اور نیک انسان سے خون حاصل کریں۔ لیکن مجبوری کی حالت میں جب کوئی اور صورت نہ ہو تو ڈاکٹر کے اطمینان کے مطابق قابل اعتماد بلڈ بنک سے خون حاصل کریں۔ اس سلسلہ میں بے احتیاطی ایڈز میں مبتلا کر سکتی ہے اور اچھے بھلے نیک انسان کو دوسروں کی نگاہ میں مشکوک بھی بنا سکتی ہے۔

غالب

مرزا اسداللہ غالب 27 ستمبر 1797ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد ایبک قوم کے ترک تھے اور سمرقند کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا وطن چھوڑ کر آئے اور شاہ عالم کی فوج میں ملازم ہو گئے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ پہلے لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ہاں ملازم ہوئے۔ پھر حیدرآباد دکن میں ملازم رہے۔ پھر الور چلے گئے وہاں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ ان کی پرورش ان کے چچا نے اپنے ذمہ لے لی مگر چند ہی سال بعد وہ بھی انتقال کر گئے۔ ان کے وارث کی حیثیت میں غالب کو ساڑھے سات سو روپے سالانہ پنشن ملنے لگی جو جنگ آزادی تک انہیں ملتی رہی۔ پنشن بند ہونے کے بعد انہوں نے بڑی تنگ دستی کی زندگی گزاری۔ نواب رام پور نے انہیں سو روپے ماہوار وظیفہ دے دیا جس سے ان کی حالت کچھ سنبھلی۔ پھر جنگ آزادی کے تین سال بعد ان کی پنشن بھی بحال ہوگئی مگر آپ زندگی بھر مقروض ہی رہے اور خوشحالی کی زندگی نہ گزار سکے۔

غالب بہت ملنسار آدمی تھے اور اپنے دوست احباب کے خطوں کے جواب باقاعدگی سے دیتے تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں ہر مذہب اور ہر مکتب کے لوگ شامل تھے۔ وہ ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ وہ بڑے صاف گو، حق پسند، حق پرست، خوددار اور غیر متعصب انسان تھے۔ تاہم شطرنج اور شراب نوشی ان کی کمزوری تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں قید بھی کاٹنی پڑی جس کا انہیں بڑا دکھ تھا۔ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ مصیبتوں اور پریشانیوں ہی میں گزرا۔ آخری عمر میں بیماری نے ان پر

غلبہ کرلیا اور وہ 15 فروری 1860ء کو دہلی میں انتقال کر گئے۔

غالب کی شاعری اس زمانے میں بھی مقبول رہی اور آج بھی مقبول ہے۔ اردو زبان کا کوئی قاری ایسا نہیں ہوگا۔ جس نے غالب کو پڑھا نہ ہو اور ان کا کوئی نہ کوئی شعر زبانی یاد نہ ہو۔ عبدالرحمان بجنوری اور بے شمار دوسرے نقادوں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے مگر جن الفاظ میں حالی نے انہیں یاد کیا ہے وہ قابل غور ہیں:

''جب میر، سودا، اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کا دیوان دیکھتے ہیں تو جس طرح ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت کا مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں ہے۔''

اور واقعی غالب کی شاعری میں ایک اور ہی سماں ہے جس میں شاعرانہ بھی ہیں اور اثر کرنے والی خصوصیت بھی۔

میرا مشغلہ

فارغ اوقات کو مصرف میں لانے کے لئے انسان کو کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور اختیار کرنا چاہیے مثلاً باغبانی، قلمی دوستی، ٹکٹ جمع کرنا، سکے جمع کرنا، تصویر بنانا، تصویریں جمع کرنا، وغیرہ۔۔میرا مشغلہ ٹکٹ جمع کرنا ہے۔ میں طرح طرح کے ٹکٹ جمع کرتا رہتا ہوں اور فارغ اوقات میں میرے البم میں ترتیب وار لگاتا رہتا ہوں۔اس طرح بیکاری کے لمحات بہت اچھی طرح گزر جاتے ہیں۔

ٹکٹ جمع کرنا میرا مشغلہ ہے۔اس لئے میں نے کبھی کوشش نہیں کی کہ جلد از جلد بہت سارے ٹکٹ بازار سے خرید لوں اور البم بھر لوں۔خرید کر ایک ہی بار بہت سے ٹکٹ حاصل کر لینا مشغلے کے آداب کے خلاف ہے۔اس کا تقاضا ہے کہ ایک ایک ٹکٹ کے حصول کے لئے محنت کی جائے۔ چنانچہ میں ٹکٹ خطوں سے اتارتا ہوں یا دوسروں سے ٹکٹوں کا تبادلہ کرتا ہوں۔اس سے جمع کرنے میں وقت تو لگتا ہے مگر مزا بھی آتا ہے۔

میرے پاس بڑی خوبصورت البم ہے۔اس پر ہر ملک کے ٹکٹ چسپاں کرنے کے لئے الگ الگ صفحے مخصوص ہیں۔ میں ان مخصوص صفحات پر مختلف ملکوں کے نئے نئے ٹکٹ لگاتا رہتا ہوں۔اب میرے پاس اتنے زیادہ ٹکٹ ہو چکے ہیں کہ مجھے کم از کم دو البم اور خریدنے کی ضرورت ہے۔

ٹکٹ جمع کرنے کا مشغلہ بہت مفید بھی ہے۔اس سے صرف فارغ اوقات ہی اچھے نہیں گزرتے بلکہ اس کے کچھ عملی فائدے بھی ہیں۔ٹکٹوں کے مشاہدے

سے مختلف ممالک کی شخصیات، مقامات، رسوم، پیداوار، ذرائع آمدورفت، پیشوں وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں اور وہاں کے عوام اور حکمرانوں کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ٹکٹوں پر بننے والی تصاویر اس سلسلے میں رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کے ذریعے مختلف ملکوں کے قومی دنوں، عوامی تقریبات، یادگار اور بین الاقوامی میلوں یا کانفرنسوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

میں نے کئی ایک قلمی دوست بھی بنا رکھے ہیں۔ قلمی دوستی کا یہ سلسلہ بھی نہ صرف میرا دوسرا مشغلہ ہے، بلکہ پہلے مشغلے میں بھی میرا معاون ہے۔ اس طرح مجھے طرح طرح کے ٹکٹ ملتے رہتے ہیں اور میں ان دوستوں سے ٹکٹوں کا تبادلہ بھی کرتا رہتا ہوں۔

قلمی دوستی اور ٹکٹوں کی بدولت دوسرے ممالک کے بارے میں میری معلومات خاصی وسیع ہو چکی ہیں اور میں دوسرے کئی ممالک کے رسم و رواج، طرز معاشرت، آب و ہوا وغیرہ کے بارے میں اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ معلومات رکھتا ہوں۔ میں تو دوسروں کو بھی مشورہ دوں گا کہ وہ فارغ اوقات کے لئے کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور اختیار کریں۔

رمضان المبارک

رمضان المبارک وہ مقدس مہینہ ہے جس کے بارے میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ برکتوں کا مہینہ ہے اور قرآن حکیم میں ہے، ''مسلمانو! تم پر روزے اس طرح فرض کر دیئے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں اور قوموں پر اس سے پہلے فرض کئے گئے تھے تا کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔''

چنانچہ ہمیں چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ ہمیں سعادت عطا فرمائے کہ ہم صحت کی حالت میں رمضان المبارک کو پائیں اور کوئی سفر بھی درپیش نہ ہو تو پورے احترام کے ساتھ روزے رکھیں اور روزے کی برکات حاصل کرنے کے لئے دن بھر ایسا طرز عمل اختیار کریں جو تقویٰ کے تقاضے پورے کرے۔ اگر تقویٰ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے تو روزے کا کوئی فائدہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

''روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور لغو بات کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑے۔''

''ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اترا جو بنی نوع انسان کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل کے درمیان فرق واضح کر دیتی ہیں۔ پس جو اس مہینے کو زندگی میں پائے اسے چاہیے کہ روزے رکھے اور جو مریض یا مسافر ہوں وہ ان کے بدلے دوسرے دنوں میں روزے رکھے۔ خدا آسانی چاہتا ہے۔ سختی نہیں چاہتا تا کہ تم روزے کی تعداد پوری کر سکو

اور روزے اس لئے فرض کئے کہ تم عطائے ہدایت پر خدا کی بڑائی بیان کرو اور اس کا شکر بجالاؤ۔''

اس طرح اللہ تعالیٰ نے روزے کا مقصد بھی واضح کر دیا اور بیماروں اور مسافروں کے لئے نرمی بھی کر دی تا کہ وہ ان دنوں میں تو روزہ چھوڑ دے مگر جب تندرست ہو جائے یا سفر سے واپس آ جائے تو روزوں کی تعداد پوری کر لے۔

رمضان المبارک کے روزوں کے فضائل بیان کرنے لگیں تو کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ مختصر الفاظ میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند ارشادات دیئے جاتے ہیں جو فضائل کے سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔

جس نے ایمان اور احتساب کے ساتھ روزہ رکھا اس کے تمام پہلے گناہ معاف کر دیئے گئے۔

آدمی کا عمل خدا کے ہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے۔

ایک نیکی دس گناہ سے سات سو گنا تک بڑھتی ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزہ اس سے مستثنیٰ ہے وہ خاص میرے لئے ہے اور میں اس کا جتنا چاہوں بدلہ دیتا ہوں۔

آپؐ نے تو روزہ افطار کرانے والے کو بھی ثواب کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا:

''جس نے رمضان میں کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرایا تو اس کے گناہوں کی بخشش اور اس کی گردن کو آگ سے چھڑانے کا ذریعہ ہو گا اور

اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس روزہ دار کو روزہ رکھنے کا ملے گا۔''

چنانچہ ہمیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں رمضان المبارک کے روزے پورے لوازمات کے ساتھ رکھنے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ میں روزے کو ڈھال بنانے کی توفیق عطا فرمائے:

''روزہ ڈھال کی مانند ہے کہ جس طرح ڈھال دشمن کے ڈر سے بچنے کے لئے ہے۔ اسی طرح روزہ بھی شیطان کے وار سے بچنے کے لئے ہے۔''

All rights reserved. ©2002-2006

سچائی

سچائی ایک مسلمہ اخلاقی قدر ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس نے سچائی کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین نہ کی ہو اور دنیا کا کوئی معلم ایسا نہیں جس نے سچ پر کاربند رہنے کا درس نہ دیا ہو۔ اسلام نے تو خاص طور سے سچائی کو اہمیت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خاص طور سے مومنوں کے لئے حکم دیا ہے کہ وہ سچے لوگوں کے صحبت اختیار کریں۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تمام مسلمانوں کو ہمیشہ سچ بولنے کی تلقین فرمائی ہے۔

سچائی میں بہت سے روحانی اور معاشرتی فوائد بھی مضمر ہیں۔ سچ بولنے سے انسان کا دل مطمئن رہتا ہے، اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور اسے کسی قسم کا کوئی خدشہ نہیں رہتا۔ اس کے برعکس جھوٹ بولنے والا ہمیشہ پریشان رہتا ہے کہ اسے خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ اس کے جھوٹ کا پول نہ کھل جائے اور اسے رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ سچ بولنے سے چہرے پر رونق اور تازگی آتی ہے اور جھوٹے آدمی کا چہرہ اس نور سے محروم رہتا ہے۔ اس کا مشاہدہ عملی زندگی میں قدم قدم پر کیا جا سکتا ہے۔ واقعی سچے کے چہرے پر رونق دکھائی دیتی ہے اور جھوٹے کے چہرے پر لعنت برستی نظر آتی ہے۔

سچائی سے نہ صرف بے شمار روحانی فوائد حاصل ہوتے ہیں جبکہ بہت سے معاشرتی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ سچ بولنے والوں کے درمیان اعتماد کی فضا

پیدا ہوتی ہے جبکہ جھوٹ بولنے والوں کے درمیان اعتماد کی فضا پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے اگر معاشرے میں سچائی کو فروغ مل جائے تو اس معاشرے کے اندر بسنے والے انسانوں کے درمیان باہمی اعتماد کی ایک ایسی فضا پیدا ہو گی جو معاشرے میں خوشحالی کی بنیاد ثابت ہو گی۔

سچائی سے کاروبار زندگی میں بھی بہت سی سہولتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے باعث زندگی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر معاشرے میں جھوٹ کا رواج ہو جائے تو دھوکا دہی اور فریب عام ہو جائیں گے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس معاشرے میں اچھے لوگوں پر بھی کوئی اعتماد نہیں کرے گا۔ بے اعتمادی کی ایسی فضا پیدا ہو جائے گی کہ احسن طریقے سے معاملات زندگی کا نپٹانا بھی ممکن نہیں رہے گا۔

سچائی نہ صرف بولنے والے کو گناہوں سے بچاتی ہے بلکہ اس کی برکت سے دوسرے بھی راہ راست پر آ جاتے ہیں اور گناہوں کی دلدل سے باہر نکل آتے ہیں۔ اس کی ایک مشہور مثال ہے جو سچائی کے اثرات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

ایک بار حضرت غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو ان کی والدہ نے چالیس اشرفیاں دے کر ایک قافلے کے ساتھ روانہ کیا۔ راستے میں ڈاکوؤں نے قافلے پر حملہ کر دیا اور قافلہ والوں کو لوٹ لیا۔ یہ دور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا بچپن کا دور تھا۔ ڈاکوؤں نے انہیں یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا کہ اس بچے کے پاس کیا ہو گا۔ ایک ڈاکو نے یونہی ان سے پوچھ لیا کہ لڑکے تیرے پاس کیا

ہے۔انہوں نے کہا چالیس اشرفیاں۔'' ڈاکو سمجھا کہ لڑکا مذاق کر رہا ہے۔وہ انہیں پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے گیا۔انہوں نے سردار کو بھی یہی بتایا کہ میرے پاس چالیس اشرفیاں ہیں۔اس سچائی کا سردار پر اس قدر اثر ہوا کہ نہ صرف وہ بلکہ اس کے سارے ساتھی ڈاکوؤں نے بھی سچے دل سے گناہوں سے توبہ کی اور تمام مسافروں کو ان کا لوٹا ہوا مال واپس کر دیا۔

چنانچہ ہمیں ہر حالت میں سچائی ہی کو اپنا شعار بنا کے رکھنا چاہیے اور کسی صورت میں جھوٹ کا راستہ اپنانا نہیں چاہیے۔

استاد کے حقوق

استاد روحانی والدین کا درجہ رکھتے ہیں۔ شاگرد ان کی روحانی اولاد ہوتے ہیں۔ استاد اپنے شاگردوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں اور ان کی اخلاقی تربیت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس لئے شاگرد اپنے استاد کا جتنا بھی احترام کریں کم ہے۔ استاد کے احترام کا حق ادا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جس طرح حقیقی والدین کا احترام اولاد پر فرض ہے اور جس طرح استادوں یعنی روحانی والدین کا احترام روحانی اولاد یعنی شاگردوں پر فرض ہے اور جس طرح حقیقی اولاد کے ذمے والدین کے کچھ حقوق ہوتے ہیں اسی طرح روحانی اولاد یعنی شاگردوں کے ذمے اپنے استادوں کے حقوق ہیں۔

جہاں تک استاد کے حقوق کا تعلق ہے، اس کا پہلا حق یہ ہے کہ اس کی بات احترام اور پوری توجہ سے سنی جائے اور اس کے عطا کئے ہوئے علم کو پوری لگن کے ساتھ ذہن نشین کیا جائے۔ جتنی کسی کے دل میں علم کی لگن ہو گی قدرتی طور پر وہ اتنا ہی اپنے استاد کا احترام کرے گا، اس کی بات دھیان سے سنے گا اور علم اور علم کی وجہ سے کتاب سے بھی محبت کرے گا اور کتاب پڑھانے والے کو بھی سر آنکھوں پر جگہ دے گا۔

جب تک بچہ گھر پر ہوتا ہے اس کے ماں باپ اس کی اصلاح اور تربیت کی کوشش کرتے ہیں لیکن استاد کی توجہ کے بغیر بچے کی صحیح تربیت کا خوشگوار فریضہ انجام پانا ممکن نہیں۔ اس لئے استاد کی توجہ حاصل کرنے کے لئے استاد کا زیادہ

سے زیادہ ادب کرنا چاہیے اور ادب کرانا اس کا حق ہے، اس پر احسان نہیں۔ استاد کے ساتھ عاجزی کے ساتھ بات کرنی چاہیے اور بحث سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر بحث ضروری ٹھہرے تو ادب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ یہ استاد کا حق ہے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوشامد کو سخت ناپسند فرمایا ہے مگر حصول علم کی خاطر استاد کی خوشامد کو بھی روا رکھا ہے۔ گویا استاد کا احترام خوشامد کی حد تک بھی کیا جا سکتا ہے۔

علم کی جستجو جاری رکھنا اور علم کے میدان میں استاد کی رہنمائی میں آگے بڑھنا بھی شاگرد پر استاد کا حق ہے۔ شاگرد اس حق کی طرف توجہ دے گا تو زندگی میں کامیاب اور کامران ہوگا اور علم کی دولت حاصل کر کے صحیح معنوں میں زندگی کا سفر جاری رکھ سکے گا۔ جو لوگ استاد کی رائے کا احترام نہیں کرتے بلکہ من مانی کرتے ہیں اور بے جا بحث مباحثہ کر کے انہیں پریشان کرتے ہیں وہ کبھی بلند مراتب حاصل نہیں کر سکتے۔

استاد کے حقوق میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کا حکم ادب سے سنا جائے اور احترام کے ساتھ اس کی تعمیل کی جائے۔ اگر شاگرد ایسا کریں گے تو ان کے استاد ان سے خوش ہوں گے اور ان کے ساتھ شفقت کے ساتھ پیش آئیں گے اور ان کا مستقبل سنوارنے کے لئے انہیں زیادہ دل لگا کر پڑھائیں گے۔ ایسے ہی شاگرد دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور بڑے بڑے مراتب تک پہنچتے ہیں۔ استاد کی مخصوص توجہ کے بغیر خصوصی کامیابی ممکن ہی نہیں۔

چنانچہ ہمیں چاہیے کہ اپنے استاد کے حقوق کو پہچانیں اور ان کا پورا احترام کریں اور ان سے ہدایت حاصل کریں۔ جو استاد کا ادب کرتا ہے، خوش نصیبی اس کے قدم چومتی ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں:

با ادب با نصیب

بے ادب بے نصیب

اور یہ بدنصیبی یا بدنصیبی بحیثیت مجموعی ساری زندگی میں سارے رشتوں پر حاوی ہے۔ ہر رشتے کے ساتھ ادب سے پیش آنے والا با نصیب اور ادب سے پیش نہ آنے والا بے نصیب ٹھہرتا ہے۔

All rights ©2002-2006

والدین کے حقوق

قرآن کریم میں خداوند کریم کا ارشاد ہے:

''والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف تک نہ کہو اور مت جھڑکو اور ان سے عزت کے ساتھ بات چیت کرو۔'' (ترجمہ)

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''وہ شخص ذلیل ہو جائے، پھر ذلیل ہو جائے، پھر ذلیل ہو جائے جس نے والدین کو، دونوں کو یا ایک کو بڑھاپے میں پایا اور جنت میں نہ گیا۔''

خداوند کریم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات کی موجودگی میں ہمیں اپنے والدین کے حقوق ادا کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے جن میں سے اہم ترین یہ ہیں۔

والدین کے ساتھ نیکی کرنی چاہیے اور ان کا حد درجہ احترام کرنا چاہیے۔ ایک شخص حضورؐ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ اچھے سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''تیری ماں'' اس نے پھر پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا ''تیری ماں'' اس کے بعد پھر پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''تیرا باپ''۔ گویا والدین کے حقوق سب سے زیادہ ہیں اور ان میں سے بھی ماں کے حقوق اور بھی زیادہ ہیں، اس لیے کہ یوں تو ماں باپ دونوں ہی نے اولاد کے لئے تکالیف اٹھائیں مگر ماں نے نسبتاً

زیادہ تکالیف برداشت کیں۔

والدین کا حد درجہ احترام کرنا چاہیے اور ان کی اطاعت کرنی چاہیے۔ والدین کی اطاعت ہر امر میں لازم ہے سوائے ان امور کے جو خلاف شرع ہوں۔ والدین کی فرمانبرداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنی چاہیے اور ان سے بات کرتے ہوئے دل و جان سے ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ والدین خوش رہیں۔ کسی طرح بھی انہیں ناراض نہیں ہونے دینا چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کے ماں باپ اس سے خوش ہوں، اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھل جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک زندہ ہو اور اسے خوش کرلیا جائے تو جنت کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ اگر والدین تمہاری حق تلفی بھی کریں تو بھی انکا احترام کرو کیونکہ جس کے والدین اس سے ناراض ہوں اس کے لئے دوزخ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک زندہ ہے تو ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ پس ہمیں اپنے والدین کا پورا پورا احترام کرنا چاہیے۔

والدین کی خدمت بھی اولاد پر فرض ہے۔ والدین اپنی اولاد کے لئے جو جو تکالیف برداشت کرتے ہیں ان کا بدلہ تو دیا ہی نہیں جا سکتا، اس لئے جتنی بھی ممکن ہو ان کی خدمت کرنی چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''بڑے بڑے گناہ یہ ہیں۔۔ خدا کا شریک بنانا، والدین سے بدسلوکی کرنا، ناحق قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا۔''

گویا والدین کی خدمت نہ کرنا اتنا ہی بڑا گناہ ہے جتنا کہ شرک کرنا یا ناحق قتل کرنا۔ اس سے والدین کے حقوق کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

والدین کے حقوق میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ان کے رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بہترین نیکی یہ ہے کہ باپ کے تعلق داروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خالہ کو بھی ماں قرار دیا ہے اور بار بار ماں باپ کے رشتہ داروں کا لحاظ رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا کہ والدین کی موت کے بعد میں ان کے ساتھ کیا نیکی کر سکتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''ان کی نماز جنازہ پڑھو۔ ان کی بخشش کی دعا مانگو۔ ان کے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرو، ان کے رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرو اور ان کے دوستوں کی عزت کرو''۔ یوں والدین کی بخشش کی دعا کرنا بھی ان کے حقوق میں شامل ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس حق سمیت والدین کے سارے حقوق پورے کرنے کی کوشش کریں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات پر عمل کر کے دنیا اور آخرت کے بلند مراتب حاصل کرنے کی سعی کریں۔

میرا نصب العین

مجھے اپنے ملک سے بہت محبت اور اپنی قوم سے بہت پیار ہے۔ میری شدید خواہش ہے کہ ملک وقوم کی خدمت کریں۔ میرے دل میں خدمت کا بے پناہ جذبہ موجزن ہے۔ چنانچہ میرا ارادہ ہے کہ ڈاکٹر بن کر ملک وقوم کی خدمت کروں اور مثالی خدمت، دیانت اور فرض شناسی کا مظاہرہ کروں۔

مجھے احساس ہے کہ ملک وقوم کی خدمت کے لئے ڈاکٹر بننا ہی ضروری نہیں۔ انسان ہر حیثیت میں اور ہر پیشے میں ملک وقوم کی خدمت انجام دے سکتا ہے لیکن میں نے ڈاکٹر بننے کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ ایک تو ہمارے ہاں ڈاکٹروں کی کمی ہے، دوسرے ڈاکٹروں میں بالعموم خدمت کا جذبہ موجود نہیں۔ وہ ہوس زر میں مبتلا ہیں اور بے لوث خدمت انجام نہیں دیتے۔ اس لئے ان کا رویہ عوام کے ساتھ مشفقانہ نہیں کیونکہ وہ غریب ہوتے ہیں اور فیس نہیں دے سکتے۔ اس عمومی تاثر کو چند واقعات نے اور بھی مضبوط کر دیا۔

کئی سال پہلے ایک بوڑھا مریض لاہور کے ایک بہت بڑے ہسپتال کے باہر فٹ پاتھ پر سسک سسک کر مر گیا کیونکہ اسے ہسپتال میں داخلہ نہ مل سکا اور پرائیویٹ طور پر علاج کرانے کی بھی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میں نے ڈاکٹر بن کر ملک وقوم کی خدمت کرنے اور عوام کے کام آنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسی طرح ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ہمارے پڑوس میں ایک مریض کی خراب

حالت کے پیش نظر ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ انہوں نے اپنی منہ مانگی فیس لے لی مگر ابھی وہ اس کا معائنہ ہی کر رہے تھے کہ مریض دم توڑ گیا۔ ایک کہرام مچ گیا مگر ڈاکٹر صاحب محض ایک دو رسمی سے جملے کہہ کر چلے گئے۔ مجھے بہت دکھ ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کو اس مریض کی فیس نہیں لینی چاہیے تھی۔

ہمارے محلے میں ایک بہت ہی غریب خاتون تھی۔ اس کا نوجوان بیٹا حادثے کا شکار ہو گیا۔ وہ سخت زخمی تھا مگر اس کے پاس علاج کروانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ رونے پیٹنے کے سوا کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھی۔ بیٹا درد سے کراہ رہا تھا مگر ماں بے بس تھی۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا یہی نوجوان اس گھر کا واحد کفیل تھا۔ محلے داروں نے ڈاکٹر کو بلایا اور باہم مل کر فیس اور ادویات کا انتظام کیا۔ میرا تاثر یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اس غریب خاتون سے فیس نہیں لینی چاہیے تھی۔

ایسے ہی واقعات نے مجھے مجبور کر دیا کہ ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کروں اور اس پر قائم رہوں۔ سو ڈاکٹری کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ دو سال بعد میرا MBBS ایم۔بی۔بی۔ایس کا کورس ختم ہو جائے گا۔ اور ڈاکٹر کی حیثیت سے ملک وقوم کی خدمت کا خواب پورا ہو جائے گا۔ میرا ارادہ ہے کہ اپنا پرائیویٹ ہسپتال قائم کروں جہاں غریبوں کے علاج اور دوا کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔ میرا ارادہ ہے کہ سب مریضوں پر یکساں توجہ دی جائے اور ان کے لیے یکساں سہولتوں کا بندوبست کیا جائے مگر فیس سب سے نہ لی جائے۔ فیس صرف امیر لوگوں سے لی جائے۔ غریب مریضوں سے کوئی فیس نہ لی جائے۔ امیر لوگ اپنی ادویات کا خرچ خود

برداشت کریں مگر غریب مریضوں سے دوا کی قیمت بھی نہ لی جائے۔اس سلسلے میں اگر امیر لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔تو وہ خصوصی عطیات دے کر ہسپتال کو اس قابل بنانے میں معاونت کر سکتے ہیں۔کہ غریبوں کا علاج بالکل مفت ہو سکے۔

میری خواہش ہے کہ اس ہسپتال میں صرف مریضوں کا علاج ہی نہ کیا جائے بلکہ لوگوں کو صحت کے عام اصول بھی سمجھائے جائیں تا کہ لوگ صحت مند رہیں۔ اور انہیں ہسپتال آنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔آئندہ احتیاط کرنے سے شفایاب ہونے والے مریض بھی بار بار بیمار نہ ہو۔

میری کوشش ہوگی کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایسے ڈاکٹروں کی ٹیم تیار کی جائے جو سب خدمت کے جذبے سے سرشار ہوں۔یقیناً ایسے لوگ موجود ہیں، بس انہیں تحریک دینے کی ضرورت ہے۔ویسے میری کوشش ہوگی۔کہ ڈاکٹروں کو اعلیٰ خدمت کے عوض اچھی تنخواہیں ہی دے سکوں تا کہ وہ زیادہ دل جمی سے کام کر سکیں۔خدا تعالیٰ مجھے اس مقصد میں کامیاب کرے۔

The End۔----------ختم شد